ماہنامہ
جامعۃ
الرشاد
جولائی
۱۹۸۶ء
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ - یوپی

اسلامی فقہ (اوّل و دوم)

مرتبہ :- حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب !

دو برس سے اصلی اسلامی فقہ بازار سے غائب تھی۔ بحمد اللہ اب اسلامی فقہ کا پانچواں شاندار اڈیشن تاج کمپنی نئی دلی سے شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے۔

مصنف موصوف نے اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس سے اب یہ بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ شروع میں اسلامی عقائد کے باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح معاشرتی و معاملاتی مسائل والے حصہ میں سیکڑوں جدید مسائل مثلاً خون چڑھانا، پوسٹ مارٹم، نسبندی اور ٹلکی زادہ، مصنوعی اعضا وغیرہ کے احکام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں دیوانی اور فوجداری کے بقیہ ابواب مثلاً دعوی، قضا و شہادت، حدود و قصاص، احکام سلطانیہ اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گویا شریعت اسلامی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ پڑ گئی ہو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں اس سے زیادہ مفصل کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ تمام اہم مسائل میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بھی متن یا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ شریعت اسلامی کی وسعت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اسلئے دو حصے میں کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف عام پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مفید ہے بلکہ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بھی ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ کتاب ہر گھر اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے پہلے اسلامی فقہ کے چار اڈیشن مکتبۃ الحسنات سے شائع ہو چکے ہیں، مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مکتبۃ الحسنات کے موجودہ مالک کی، مدملگی کی وجہ سے ان سے دو برس پہلے اسلامی فقہ کا معاملہ ختم کر لیا گیا تھا۔ اس غصہ میں انہوں نے عبارت کا تھوڑا ردو بدل کر کے قانون و اخلاق کے سارے حدود توڑ کر مولانا موصوف کی اسلامی فقہ کو اسی نام سے ایک غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کر لیا، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ بالکل نمایاں ہے۔ بطور مثل "نقل را چہ عقل" کے تحت مسائل میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر بیٹھے ہیں۔

بہرحال جس اصلی اسلامی فقہ کا لوگوں کو انتظار تھا اب وہ چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔ ۷۵ روپے

ملنے کے) تاج کمپنی، ۳۰۵۱، ترکمان گیٹ، نئی دلی ۱۱۰۰۰۶

پتے) دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱، یوپی { مینیجر دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد۔

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ کا ترجمان ماہنامہ جامعۃ الرشاد	سالانہ چندہ
غیر ممالک سے پندرہ ڈالر امریکی $ 15/-		ہندوستان سے 30/- خصوصی معاون 100/- قیمت فی پرچہ 3/-

جلد ۱۵ — جولائی ۱۹۸۷ء مطابق ذوالقعدہ ۱۴۰۷ھ — شمارہ ۷

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت	کاتب
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی	رفیق احمد۔ شاہ پور، کندھرا پور۔ اعظم گڈھ

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا

"الرشاد" کے صفحات میں ہم یہ بات بار بار لکھتے رہے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی فرقہ پرست طاقتیں اور مرکزی حکومت اور ہندی بولنے والے صوبوں کی حکومتیں، سب کی مشترکہ کوشش رہی ہے کہ ایک طرف فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کی جان اور ان کے مال کو برباد کیا جائے اور ان کو سیاسی و اقتصادی طور پر مفلوج بنانے کی کوشش کی جائے۔ دوسری طرف ان کو اسلامی تعلیم او تہذیب سے دور کر کے اور ان کے پرسنل لا اور مذہبی مقامات کو مجروح کر کے ان کو دفاع کے منفی کاموں میں الجھا دیا جائے تاکہ نہ وہ سیاسی و اقتصادی میدان میں بہت آگے بڑھ سکیں اور نہ ان میں دینی حمیت اور ملی غیرت باقی رہ جائے۔ مگر ہم اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ طاقتیں اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ مسلمانوں نے آزادی کے بعد منفی دفاعی کام بھی کئے اور انھوں نے زندگی کے ہر میدان میں ترقی بھی کی۔ انھوں نے اپنی نسل کے، دین و ایمان کے بچانے کی کوشش بھی کی اور اپنے حقوق کیلئے قانونی لڑائی بھی لڑی اور ان کی دینی حمیت اور ملی غیرت میں بھی اضافہ ہوا۔ واقعہ ہے کہ ؎

اسلام کی فطرت کو قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

ہم نے اب تک ہندوستان کے نامساعد حالات میں جو کچھ کیا ہے وہ ہر طرح لائق تحسین ہے لیکن ہمیں ابھی اپنے دینی امتیاز اور ملی تشخص کو باقی رکھنے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے اور اس پہلو پر ہم کو نظر رکھنی ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں حکومت کی پولیس اور پی۔ اے سی کے ذریعہ فسادات کرا کے ہماری توجہ بنیادی مسائل سے نہ ہٹا سکیں۔ مثال کے طور پر اس وقت دو ماہ سے میرٹھ اور دلی اور گجرات میں فسادات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ خاص طور پر میرٹھ میں جس بربریت اور ظلم کا مظاہرہ حکومت کی پی۔ اے سی اور پولیس اور فوج نے

کیا ہے اسے آزادی کے بعد کا اپنی نوعیت کا سب سے بڑا فساد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہمیں میرٹھ کے مظلومین کی دل کھول کر مدد کرنی چاہئے لیکن ہم کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بابری مسجد کا مسئلہ سرد نہ ہونے پائے اور نہ یکساں سول کوڈ اور مسلم پرسنل لا کی طرف سے ہماری توجہ ہٹنے پائے ورنہ فرقہ پرست طاقتوں اور حکومت یو پی کا منشا پورا ہو جائے گا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ، مرکزی بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور صوبائی ایکشن کمیٹی کے ذمہ داروں سے ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ فسادات کے مسئلہ کو اہمیت ضرور دیں اور اس کے لئے اخلاقی اور قانونی جد و جہد بھی جاری رکھیں مگر آپ براہ راست ریلیف وغیرہ کے کاموں میں حصہ نہ لیں اور نہ اس کے لئے اپیل کریں بلکہ یہ کام دوسری جماعتوں کے واسطہ سے کریں ورنہ ہمارے بنیادی مسائل پس پشت پڑ جائیں گے۔

یہ سمجھ لینا چاہئے کہ نہ فسادات کا سلسلہ ختم ہوگا اور نہ حکومت اور فرقہ پرست عناصر ہمارے دینی و ملی مسائل کو حل ہونے دیں گے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بو لہبی

اس لئے ہمارے ذہن سے یہ بات نہ نکلنی چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو کشمکش ہے وہ عارضی چیز نہیں ہے اور نہ تھوڑے سے سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بات ہے بلکہ یہ توحید اور شرک میں بٹی ہوئی دو تہذیبوں اور زندگی گزارنے کے دو طریقوں کی کشمکش ہے اور ہمیں اس کشمکش میں خود کو بھی زندہ رکھنا ہے اور اپنے عقیدۂ توحید اور اس پر مشتمل تہذیب کو بھی اپنے سینوں سے لگائے رکھنا ہے۔

سیاسی سطح پر ایک اور طاقت ساری دنیا میں اور خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں سے نبرد آزما ہے وہ ہے کیمونسٹ طاقت۔ یہ بات بھی ہم کو دھیان میں رکھنی ہے کہ سیاسی سطح پر فرقہ پرست طاقتیں ہمارے مدمقابل نہیں ہیں بلکہ کیمونسٹ طاقتیں ہیں۔ خواہ کانگریس کی صورت میں ہو یا لوک دل کی صورت میں یا جنتا پارٹی کی صورت میں، یہ تمام جماعتیں موقع کے لحاظ سے فرقہ پرست طاقتوں سے سیاسی سطح پر مدد لیتی ہیں ورنہ ان کے ظاہری خول کے اندر کیمونزم بیٹھا ہوا ہے۔ گویا ہندوستان میں اس وقت دو طاقتوں کے درمیان کشمکش یا مقابلہ ہے۔ مذہبی، معاشی اور معاشرتی سطح پر فرقہ پرستوں سے اور سیاسی سطح پر کیمونسٹ طاقتوں سے۔ مسلمانوں میں جو لوگ بیس برس کی اندرا حکومت اور مخالف جماعتوں کی پالیسی پر نظر رکھتے

ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت اور مخالف جماعتیں جب بھی خارجی مسائل کے اندر گھرتی ہیں تو وہ ماسکو کا رُخ کرتی ہیں اور جب ان کا ووٹ کٹتا نظر آتا ہے تو فرقہ پرستی کی ہوا دیتی ہیں۔ دونوں صورت حال کو سمجھنے کے لئے آپ اندرا کے دور کے واقعات اور اس وقت راجیو گاندھی کے دورۂ ماسکو اور میرٹھ کے فساد کے سلسلہ میں ویر بہادر کی پالیسی پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے تو آپ کو راقم الحروف کے مذکورہ بالا تجزیہ میں بڑی حد تک صداقت نظر آئے گی۔

ان منفی باتوں کا ذکر کرنا ہمارے لئے خوشگوار بات نہیں ہے اور نہ ہم مسلمانوں کا منفی ذہن بنانا چاہتے ہیں مگر حقائق سے نظر بچانا کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے اس لئے ہم ان حقائق کو واشگاف طریقہ پر ناظرین کے سامنے رکھ دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ہم اپنے دفاعی اور اقدامی کاموں کو صحیح رُخ دے سکیں۔ ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

ملک کے مختلف حصوں میں تین برس سے رتھ یاتراؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس میں نہ صرف ننگی فرقہ داریت کا مظاہرہ کیا گیا ہے بلکہ کوئی ایسی گالی نہیں ہے جو مسلمانوں کو نہ دی گئی ہو، جس کی وجہ سے ملک کی پُرامن فضا بالکل تہس نہس ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر اس کے بارے میں نہ تو حکومت کو کوئی نوٹس لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہمارے نیشنل پریس، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور انگریزی و ہندی اخبارات کو اس میں کوئی فرقہ داریت نظر آئی۔ حتیٰ کہ اب اس رتھ یاتراؤں کو ہماری حکومت کے گورنر اور وزیراعلیٰ صاحبان کندھا دیتے ہیں۔ اس رتھ یاتراؤں کی زہر افشانی کے نتیجہ میں ویر بہادر سرکار نے بابری مسجد کا تالا کھول دیا اور اسے رام جنم بھومی قرار دینے کی کوشش کی اور جب مسلمانوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا تو پھر حکومت کو اور نیشنل پریس کو اس میں فرقہ داریت نظر آنے لگی اور پھر انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک ایسی مہم شروع کر رکھی ہے جس کا سلسلہ بظاہر جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہمارے ملک میں کچھ انصاف پسند افراد ایسے ضرور ہیں جو ہندوؤں کی فرقہ پرستی کو موجودہ فضا کا ذمہ قرار دیتے ہیں۔ ہم یہاں راجیشور رائے کی تقریر کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

"یہ درست ہے کہ ایک قسم کی فرقہ واریت دوسری قسم کی فرقہ واریت کی مدد کرتی ہے۔ اسی لئے دونوں اقسام کی فرقہ پرستی کے خلاف جنگ لڑنی ہوگی۔ ہندوستان میں اکثریتی فرقہ پرستی زیادہ خطرناک ہے۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے آنجہانی لیڈر اجے گھوش نے کہا تھا کہ اگر ہندوستان میں کبھی فسطائیت آئی تو وہ اکثریتی فرقہ پرستی کے ذریعہ آئے گی۔ اگرچہ ہندو، جو تمام ملک میں غالب اکثریت میں ہیں ابھی تک سب فرقہ پرست نہیں ہوئے ہیں لیکن فرقہ پرست ہندو طاقتیں نظریاتی، سیاسی اور عملی طور پر زیادہ جارح ہو گئی ہیں۔"

("پیٹریاٹ" ۱۳ رجون ۱۹۸۷ء)

مقصد یہ ہے کہ ہمیں حالات کا صحیح اندازہ کرکے اپنے آئندہ کے اقدامات کا رخ مقرر کرنا چاہئے اور ان مسائل کو محض جذباتی اور عارضی سمجھ کر کوئی قدم نہ اٹھانا چاہئے اور پھر اسی کے تحت ہمیں نوجوانوں کی ذہنی وعملی تربیت کرنی چاہئے۔

میرٹھ کے فسادات کے سلسلہ میں

ایک انصاف پسند غیر مسلم کی رائے

جناب عالی! ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ فسادات کا براہ راست تعلق اس فرقہ واریت سے ہے جو حالیہ دنوں میں المناک حد تک پروان چڑھی ہے۔ ہم ذات پات کی تفریق سے بہت متفکر ہیں۔ ہم سیاہ فام امریکنوں، فلسطینیوں اور ان سیاہ فام افریقیوں کی حمایت کا دعویٰ کرتے ہیں جو ظالموں کے ظلم کا شکار ہیں اسی لئے ہم نے OPERATION POOMALAI آپریشن پومالائی کے ذریعہ جافنا میں تاملوں کی مدد کی لیکن نئی دہلی ہی میں ٹھیک ناک کے نیچے نظم وضبط اور امن وامان قائم کرنے کے نام پر جس بڑے پیمانے پر تشدد کا مظاہرہ کیا گیا وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ ہر روز اخبارات کے اولین صفحات پر میرٹھ کے نزدیک گنگا نہر سے انسانی لاشوں کے

باقی صفحہ ۱۹ پر

قسط ۲

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لاہور

احکامِ ستر و حجاب

لمحۂ فکریہ عورت پہلے صنف نازک سمجھی جاتی تھی، موجودہ تہذیب نے اسے برابری کا درجہ دیا۔ پھر اسے صنف بہتر کا درجہ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد خود صنف کمتر بن چکا ہے۔ بالفاظ دگر عورت کی آزادی مرد کی غلامی پر منتج ہو گئی۔ عورت پہلے حجاب سے نکلی پھر اپنے آپ سے نکلی پھر مرد کے قبضہ سے نکل گئی، کیونکہ آزادی کی ایک کڑی دوسری کڑی کو طبعی کشش کے ساتھ کھینچتی ہے۔ جب عورت کو مرد کی طرف سے ناجائز آزادی ملی تو عورت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود آزادی کی قانون سازی میں آزاد ہو کر اس میں ایسی دفعات کا اضافہ کر رہی ہے جسے مردانہ عقل کسی حالت میں گوارا نہیں کر سکتی۔ یہی وہ صورتحال ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر من ظھرھا [1] (اور جب ایسا وقت آجائے کہ) تمہارے معاملات تمہاری بیگمات کے حوالے ہوں تو اس وقت تمہارے لئے زندہ رہنے سے مرجانا بہتر ہے۔

مغرب کی مراجعت آج کا مغربی مفکر بھی تہذیب کے اس ہمہ پہلو انقلاب سے سخت پریشان ہے اور اس صورت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک امریکن رسالہ میں اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

"دو تین شیطانی قوتیں ہیں جن کی تثلیث آج ہماری دنیا پر چھا گئی ہے اور تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ فحش لٹریچر جو جنگ عظیم کے بعد حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی

---

[1] ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ باب تغیر لباس

اور کثرت شناعت میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔ متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو نہ صرف بھڑکاتی ہیں بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں۔ عورتوں کا گرا ہوا اخلاقی معیار جو ان کے لباس اور بسا اوقات ان کی برہنگی اور سگریٹ کے روز افزوں استعمال اور مردوں کے ساتھ ان کے ہر قید و امتیاز سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں ہمارے ہاں بڑھتی چلی جارہی ہیں اور ان کا نتیجہ مسیحی تہذیب و معاشرت کا زوال اور آخر کار تباہی ہے۔ اگر ان کو روکا نہ گیا تو ہماری تاریخ بھی روم اور ان دوسری قوموں کے مماثل ہوگی جن کو یہی نفس پرستی اور شہوانیت ان کی شراب اور عورتوں اور ناچ رنگ سمیت فنا کے گھاٹ اتار چکی ہے۔"[1]

احکام ستر و حجاب سے متعلق چند ضروری وضاحتیں

ستر و حجاب کے احکام کا صحیح مفہوم سمجھنے میں بعض اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی غلطی کر جاتے ہیں لہٰذا چند امور کو پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ وہ یہ ہیں:

ستر و حجاب کا فرق

عام طور پر لوگ چونکہ ستر اور حجاب کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے لہٰذا ستر سے متعلقہ احکام کو حجاب کے ساتھ اور حجاب کے احکام کو ستر کے احکام کے ساتھ گڈ مڈ کر کے غلط ملط نتائج اخذ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم پہلے اسی فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی پہلے ستر اور عورت کے فرق کو۔

ستر اور عورت

کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا مفہوم ابتداءً کچھ اور ہوتا ہے لیکن مابعد کے ادوار میں اس کے مفہوم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لفظ "ستر" اسی قبیل سے ہے اور بعض دفعہ کوئی ایک لفظ کسی دوسری زبان میں منتقل ہو کر بالکل کسی الگ مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لفظ "عورت" اسی قبیل سے ہے۔

ہمارے ہاں عورت کا لفظ مرد کی تانیث یا مادہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جب کہ عربی میں (جس زبان کا یہ لفظ ہے) اس کا مفہوم بالکل جداگانہ ہے۔ عربی زبان میں عورت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو کھلا رکھنا یا اس کا کھلا رہنا انسان کے لئے باعث ننگ و عار ہو اور انسان اسے چھپانا

---

[1] پردہ۔ ص ۱۰

ضروری سمجھتا ہو۔ (مفردات امام راغب) قرآن مجید میں ہے:

او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء [1] — یا پھر وہ (نابالغ) لڑکے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہ ہوئے ہوں۔

اس آیت میں عورت اور نساء کے دونوں لفظ اکٹھے آ گئے ہیں جو ان کے معانی کا فرق واضح کر رہے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ لفظ قرآن میں ایسے غیر محفوظ مکان کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہو (۳۳/۱۳) اور اسی طرح پوشیدہ اوقات (۲۴/۵۸) کے لئے بھی۔

الستر (مصدر) کا بنیادی معنی محض کسی چیز کو چھپانا ہے اور ستر اور سُترۃ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔ (مفردات) اور مقاماتِ ستر سے مراد انسانی جسم کے وہ حصے ہیں جنہیں شریعت نے دوسرے انسانوں سے ہر حالت میں چھپانا واجب قرار دیا ہے پھر صرف ستر کا لفظ بول کر اس سے "مقاماتِ ستر" مراد لیا جانے لگا۔ پھر ان مقاماتِ ستر کا چھپانا چونکہ واجب ہے لہٰذا عورت کا لفظ مقامات ستر کو چھپانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔

ان مقاماتِ ستر کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

مرد کے ستر کے حدود

ارشاد نبوی ہے:

عورۃ الرجل ما بین سرتہ الی رکبتہ [2] — مرد کا ستر اس کی ناف سے لے کر گھٹنے تک ہے۔

حضرت جرہد اسلمی جو اصحاب صفہ میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ران ننگی ہو گئی تو آپؐ نے مجھے فرمایا:

اما علمت ان الفخذ عورۃ [3] — کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے۔

اس حصۂ جسم کو بیوی کے سوا دوسروں کے سامنے اراداً کھولنا حرام ہے۔

---

[1] ۲۴/۳۱ [2] دار قطنی، بیہقی بحوالہ تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۳۸۳

[3] ترمذی، ابواب الادب۔ باب ان الفخذ عورۃ

عورت کے ستر کے حدود

عورت کا پورے کا پورا جسم مردوں کے لئے ستر ہے۔ ماسوائے چہرہ اور ہاتھوں کے یعنی کوئی عورت اپنے چہرہ اور ہاتھوں کے اور جسم کے کسی بھی حصہ کو اپنے شوہر کے سوا دوسروں کے سامنے کھول نہیں سکتی، خواہ وہ اس کا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں اپنے بھتیجے عبداللہ بن طفیل کے سامنے زینت کے ساتھ آئی، تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ میں نے کہا یہ تو میرا بھتیجا ہے۔ آپ نے فرمایا:

اذا عرقت المراة لم یحل لھا ان تظھر الا وجھھا و الا مادون ھذا وقبض علی ذراع نفسه فترك بین قبضته وبین الکف مثل قبضته الاخری۔ ؎

جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لئے جائز نہیں کہ اپنے جسم میں سے کچھ ظاہر کرے سوائے چہرے کے اور سوائے اس کے یہ کہہ کر آپؐ نے اپنی کلائی پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ آپؐ کی گرفت کے مقام اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی بھر جگہ باقی تھی۔

ان احکام میں اتنی گنجائش ہے کہ عورت اپنے محرم رشتہ داروں کے سامنے کسی ضرورت کے تحت جسم کا اتنا حصہ کھول سکتی ہے جیسے گھر کا کام کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے یا فرش دھوتے وقت پائنچے اوپر چڑھا لینا یا آٹا گوندھتے وقت کف اوپر کر لینا وغیرہ۔

عورت کا عورت سے ستر

عورت کے لئے عورت کے ستر کے حدود بھی وہی ہیں جو مرد کے لئے مرد کے ستر کے ہیں یعنی ناف سے لے کر گھٹنے تک کا درمیانی حصہ۔ جسم کا یہ حصہ کوئی عورت بلا ضرورت کسی عورت کے سامنے بھی نہیں کھول سکتی ہے۔ دوسرے، بدن کا ڈھانکنا اگرچہ ضروری ہے تاہم فرض نہیں ہے۔

ستر سے متعلق ارشاداتِ نبویؐ

عن ابی سعید قال، قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا ینظر الرجل الی

ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے اور نہ کوئی

؎ ابن جریر بحوالہ پردہ، ص ۲۸۵

عورۃ الرجل، ولا المرأۃ الی عورۃ المرأۃ ولا یفضی الرجل الی الرجل فی ثوب واحد ولا تفضی المرأۃ الی المرأۃ فی ثوب واحد۔ [۱]

عورت کسی عورت کے ستر کو دیکھے، نیز کوئی مرد کسی مرد کے ساتھ ایک ہی کپڑے میں نہ لیٹے، نہ ہی کوئی عورت کسی عورت کے ساتھ ایک ہی کپڑے میں لیٹے۔

پھر یہی نہیں کہ انسان کے لئے ایسے مقامات کو صرف دوسروں سے چھپانا ہی ضروری ہے بلکہ تنہائی میں بھی ان مقامات کو ننگا رکھنا ممنوع ہے۔ (ماسوائے غسل یا اضطراری امور کے) ارشادِ نبویؐ ہے:

ایاکم والتعری فان منکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہٖ فاستحیوھم واکرموھم۔ [۲]

خبردار کبھی ننگے نہ رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ ایسی ہستیاں ہیں جو تم سے کبھی جدا نہیں ہوتیں (یعنی کراماً کاتبین) ماسوائے رفع حاجت اور اپنی بیوی کے مباشرت کے اوقات کے۔ لہٰذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام ملحوظ رکھو۔

ایک دوسری روایت یوں ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

احفظ عورتک الا من زوجتک او ماملکت یمینک فقال الرجل یکون مع الرجل، قال ان استطعت ان لا یراھا احد فافعل قلت لرجل یکون خالیا، قال فاللہ احق ان یستحیا منہ۔ [۳]

اپنے مقاماتِ ستر کی نگہداشت رکھو سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے۔ ایک شخص کہنے لگا اگر کوئی شخص دوسرے کے ساتھ رہتا ہو (تو کیا کرے؟) آپؐ نے فرمایا جہاں تک ہو سکے یہ کوشش کرو کہ ستر کوئی نہ دیکھے۔ میں نے کہا اگر کوئی شخص اکیلا تنہا ہو تو؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔

حتّٰی کہ آپؐ نے کسی مُردے کے مقاماتِ ستر کو دیکھنے سے بھی منع فرمایا۔ آپ کا ارشاد ہے:

لا تکشف فخذک ولا تنظر الی فخذ حی ولا میت۔ [۴]

اپنی ران نہ کھول، نہ ہی کسی زندہ یا مُردہ کی ران کو دیکھو۔

---

[۱] رواہ مسلم (مشکوٰۃ۔ کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ۔ فصل اوّل) [۲] ترمذی، ابواب الادب اسباب فی استتار عند جماع۔ [۳] ترمذی۔ ابواب الادب باب ماجاء فی حفظ العورۃ۔ [۴] ابوداؤد، کتاب الحمام، باب النہی عن التعری۔

حجاب حجاب دو چیزوں کے درمیان کسی ایسی حائل ہونے والی چیز کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اوجھل ہو جائیں۔ ارشاد باری ہے:

واذا سالتموھن متاعا فاسئلوھن من ورآء حجاب۔[1]
اور جب تمہیں (نبی کی بیویوں سے) کوئی چیز مانگنا ہو تو پردے کے باہر سے مانگو۔

اس آیت کو آیۂ حجاب کہتے ہیں جس کے نزول کے بعد ازواج مطہرات نے اپنے گھروں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مسلمان گھرانوں میں بھی یہی طریقہ رائج ہو گیا۔ اس طرح کا حجاب کرنے سے باہر کے لوگ اندر کے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور اندر کے لوگ باہر کے لوگوں کو۔

ستر و حجاب کا فرق گویا حجاب ستر کے علاوہ اضافی چیز ہے جس کا تعلق غیر محرم یا اجنبی مردوں سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ستر فی نفسہ ضروری ہے کوئی موجود ہو یا نہ ہو، جب کہ حجاب فی نفسہ ضروری نہیں جب تک کہ کوئی دیکھنے والا غیر محرم موجود نہ ہو۔ ستر کو ڈھانکنے کا حکم مرد و عورت دونوں کو ہے لیکن حجاب کا حکم صرف عورت کو ہے۔

استثنائی صورتیں بعض ضروریات کے تحت احکام حجاب سے رخصت ہے مثلاً منگنی کے دوران مرد کا عورت اور عورت کا مرد کو دیکھنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اسی طرح قاضی کو گواہی دینے والی عورت کا چہرہ دیکھنے کی اجازت ہے۔

پھر بعض اضطراری امور ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں حجاب کے علاوہ ستر کی پابندیوں میں بھی رخصت ہے مثلاً طبی معائنہ یا علاج کے دوران عورت یا مرد کا کسی بھی حصۂ جسم کو ڈاکٹر یا طبیب کے سامنے کھولنا، تفتیشِ جرم کے دوران متعلقہ افسر کا عورت یا مرد کے کسی بھی حصۂ جسم کو دیکھنا یا اتفاقی حادثات مثلاً چھت گرنے آگ لگنے یا چوری، ڈاکہ وغیرہ پڑنے کی صورت میں غیر مردوں کا امداد کے لئے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونا۔

پردہ کے احکام پر احوال و ظروف کی اثر اندازی

پردہ کے احکام پر، خواہ وہ ستر سے تعلق رکھتے ہوں یا حجاب سے، ماحول کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔

---

[1] القرآن ۳۳/۵۳

اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ عورت اور مرد کے درمیان فحاشی کے امکانات کسی ہیبت، مصیبت حادثہ یا تکلیف کی وجہ سے ختم ہو جائیں تو پردہ کے احکام بھی ختم ہو جائیں گے........اور جوں جوں یہ امکانات زیادہ ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے پردہ کے احکامات بھی شدت اختیار کرتے جائیں گے۔ اب احکام پردہ کی اس حکمت کے نقطۂ نظر سے درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ روزِ قیامت

ہیبت، مصیبت اور سختی کے لحاظ سے قیامت کا دن سب سے سخت ہوگا۔ لہٰذا وہاں پردہ اور اس کے احکام تو درکنار، کسی کا لباس تک بھی نہ ہوگا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تحشرون حفاۃ عراۃ عزلا فقلت یارسول اللہ! الرّجال والنساء ینظرون بعضھم الی بعض فقال الامر اشد من ان یھمّھم ذالک [1]

(قیامت کے دن) تم لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بن ختنہ اکٹھے کئے جاؤ گے۔ تو میں نے (حضرت عائشہؓ نے) عرض کیا یارسول اللہ! مرد اور عورت ایک دوسرے کے ستر کو دیکھیں گے۔ آپؐ نے فرمایا وہ ایسا سخت معاملہ ہوگا کہ ان باتوں کا کسی کو خیال بھی نہ آئے گا۔

۲۔ دورانِ جنگ

مندرجہ بالا احدیث میں تو قیامت کا ذکر تھا۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ سختی اور تنگی کا وقت لڑائی کا وقت ہوتا ہے جس میں ہر انسان موت سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر حجاب کے احکام تو درکنار، ستر کے احکام میں بھی نمایاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ:

لما کان یوم احد انھزم الناس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ولقد رأیت عائشۃ بنت ابی بکر و ام سلیم وانھما لمشمرتان اری خدم سوقھما تنقزان القرب

جس دن احد کی لڑائی ہوئی اور مسلمان شکست کھا کر نبی صلے علیہ وسلم سے جدا ہو گئے اس دن میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ وہ دونوں پنڈلیاں کھولے ہوئے جلدی جلدی پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لاتی تھیں

---

[1] بخاری۔ کتاب الرقاق باب الحشر

وقالت غيره تنقلان القرب علی متونهما ثم تفرغانه فی افواه القوم ثم ترجعان فتملآنها ثم تجیئان فتفرغان فی افواه القوم ۔[۱]

اور مسلمانوں کو پلا کر پھر لوٹ جاتی تھیں پھر اور مشکیں بھر کر لاتیں اور پلاتیں۔ میں ان کے پاؤں کی پازیبیں دیکھ رہا تھا۔

اسی باب میں حضرت ام سلیط کے متعلق بھی ذکر ہے کہ وہ بھی جنگ میں یہی فریضہ سرانجام دے رہی تھیں۔ نیز عورتیں بھی زخمیوں کی مرہم پٹی اور زخمیوں کو مدینہ واپس لے جانے میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں ۔[۲]

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا واقعات زیادہ تر جنگ احد سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ابھی پردہ کے احکام نازل ہی نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے مگر سوال یہ ہے کہ عورتوں کی زخمیوں کی مرہم پٹی سے تعلق رکھنے والی روایات صرف جنگ احد سے مختص نہیں ہیں جیسا کہ اسی باب کی بعض دیگر روایات سے واضح ہے، اور یہ بھی واضح رہے کہ عورت ستر وحجاب کے تقاضوں کی پابند رہ کر جنگ کے دوران زخمیوں کی مرہم پٹی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا ان پابندیوں میں نرمی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ایسے ماحول میں جنسی خواہشات کے پیدا ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

اگر ایسے حالات میں بھی کوئی عورت اپنے حواس کو برقرار رکھ سکے اور پردہ کا اہتمام کر سکے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ چنانچہ ابوداؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون ام خلاد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ صورت حال کی دریافت کے لئے رسول اکرمؐ کے پاس آئیں تو نقاب اوڑھے ہوئی تھیں کسی نے حیرت سے کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے، بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا اور تم اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو؟ ام خلاد کہنے لگیں:

ان ارزأ ابنی فلن ارزا حیائی۔ [۳] میں نے بیٹا ضرور کھویا ہے مگر حیاء نہیں کھوئی۔

۳۔ آفات ارضی وسماوی

دورانِ جنگ کی شدت یا اس سے کم وبیش دہشت، شدت و کلفت یعنی ارضی وسماوی آفتوں مثلاً زلزلہ، سیلاب میں مکانات

---

[۱] بخاری، کتب الجہاد، باب غزو النساء۔ [۲] مگر سفر حج میں اپنے خاوند یا کسی محرم کی معیت ضروری ہے
[۳] ابوداؤد، کتاب الجہاد

وغیرہ کا گر پڑنا، بجلی کا گرنا، کشتی کا غرق ہونا یا چوری اور ڈکیتی کے واقعات میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب شہوانی خواہشات کے بیدار ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ لہٰذا ایسے اوقات میں ستر و حجاب کے احکام کی بجاآوری کی تکلیف نہیں دی گئی۔ اگر چند جاں نثار کسی آتش زدہ مکان سے سامان اور انسانی جانوں کو نکالنے میں مصروف ہوں، پھر اگر وہ کسی عورت کو دیکھ بھی لیں اور عورتیں انہیں دیکھ لیں تو ایسے وقتوں میں شہوانی ہیجانات کی بیداری کا کوئی امکان ہوتا ہے؟ ایسے حالات میں اجازت حاصل کرنے کی بھی پابندی نہیں رہی۔

۴۔ دورانِ احرام احرام کے دوران حجاب کے احکام اٹھا دیئے گئے ہیں لیکن ستر کے احکام کی پابندی بہر حال لازمی ہے۔ حج کا تمام تر زمانہ سفر اور صعوبت میں گزرتا ہے اور احرام کا زمانہ تو فقیرانہ زندگی کی یاد تازہ کرتا ہے اور ہر وقت خدا کی یاد دل میں رہتی ہے۔ ایسی حالت میں حاجی اپنی عورت تک سے مباشرت نہیں کر سکتا، اور مباشرت تو دور کی بات ہے وہ مباشرت سے پہلے کی چھیڑ چھاڑ، خواہ یہ زبانی کلامی ہو یا عمل سے تعلق رکھتی ہو (یہی رفث کا صحیح مفہوم ہے) بھی نہیں کر سکتا۔ ارشاد باری ہے کہ:

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ [1]

حج کے دوران نہ رفث کی اجازت ہے نہ فرمانی یا برے کام کرے اور نہ ہی کسی سے جھگڑا کرے۔

حج کا زمانہ دہشت کا اور بے چینی کا زمانہ نہیں بلکہ اسے امن کا زمانہ ہی کہنا چاہئے۔ تاہم اس میں جو پاکیزہ ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے۔

نیز ان مناسک کی بجا آوری کا لحاظ رکھتے ہوئے جو دوران حج ضروری ہیں۔ عورتوں پر سے حجاب کے احکام میں رخصت دی گئی ہے۔ احرام کے دوران عورتیں اپنا چہرہ ڈھانپ نہیں سکتیں نہ دستانے پہن سکتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر وہ کسی وقت حجاب یعنی چہرہ کو غیر مردوں سے چھپانے کی ضرورت محسوس کریں اور آسانی سے یہ کام کر بھی سکتی ہوں تو بھی نہ کریں۔ جیسے دستی پنکھا سے منہ چھپا لینا یا چادر کا پلو منہ کے آگے کر لینا وغیرہ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

---

[1] ۲/۱۹۷

كان الركبان يمرون بنا ونحن محرمات مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا احاذوا سدلت احدنا جلبابها من راسها على وجهها فاذا جاوزونا كشفناه۔ [1]	حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالت احرام مکہ کی طرف جارہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتی تھیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں۔

اسی طرح عورت نماز کی حالت میں بھی حجاب کی پابندیوں سے آزاد ہے خواہ وہ نماز گھر میں اکیلی ادا کر رہی ہو یا باجماعت یا مسجد میں جا کر نماز باجماعت میں شریک ہو۔

۵۔ معاشرتی مجبوریاں اس کی مثال یہ ہے کہ لونڈیوں اور کنیزوں کو حجاب کی پابندیوں کے سلسلہ میں رخصت دی گئی ہے کیونکہ:

۱۔ انھیں گھریلو کام کاج کی وجہ سے نہ تو زینت و آرائش کی فرصت ہی ملتی ہے اور نہ مالک یہ گوارا کرتا ہے کہ وہ لونڈیوں پر ایسے زائد اخراجات کو برداشت کرے۔ انھیں بسا اوقات میلے کچیلے لباس میں ہی کام کاج کرنا پڑتے ہیں۔

۲۔ انھیں کام کاج کے سلسلہ میں اکثر بازار بھی جانا پڑتا ہے اور ہر وقت جلباب یا برقع اوڑھ کر جانا ان کے لئے ایک تکلیف دہ امر ہے۔

اس بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایسا دیہاتی ماحول جس میں ایک غریب کاشت کار کو سارا دن کھیت پر کام کرنا پڑتا ہے اور اس کی معاشی و معاشرتی ضروریات بعض اوقات اس بات کی مقتضی ہوتی ہیں کہ اس کی بیوی اسے دوپہر کا کھانا کھیت پر پہنچائے۔ ادھر بیوی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دوپہر کی گرمی میں سر پر کھانا اٹھائے اور بغل میں بچہ سنبھالے اسے کھیت پر جانا پڑتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کے لئے حجاب کی پابندیاں نباہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اندریں صورت ایسی عورتیں بھی حجاب کی رخصت سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

رہا زینت و آرائش اور تبرج کا مسئلہ تو وہ ایسی صورت میں ویسے ہی محال ہوتا ہے۔

---

[1] (ابوداؤد۔ کتاب المناسک باب فی المحرمۃ تغطی وجہہا)

۲۔ نارمل حالات ستر اور حجاب کے احکامات کا صحیح اور پورا پورا اطلاق حالت امن یا نارمل حالات میں ہوتا ہے۔ یہ صورت حال چونکہ ایسی ہوتی ہے کہ اس میں غیر مرد اور غیر عورت کا میل جول، فحاشی کے تمام محرکات کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ لہٰذا اس حالت میں ستر اور حجاب کے تمام تر احکامات کی پابندی لازمی ہے اور پردہ کے تمام تر احکام اصولی طور پر اسی حالت سے متعلق ہیں۔

ایک دفعہ حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ (ازواج مطہرات) آپؐ کے پاس بیٹھی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابن ام مکتوم آ گئے۔ آپؐ نے دونوں بیویوں سے فرمایا: احتجبا منہ یعنی اس سے پردہ کرو۔ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! الیس اعمیٰ لا یبصرنا ولا یعرفنا (کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے) آپؐ نے فرمایا:

افعمیا وان انتما، الستما تبصرانہ [1] کیا تم دونوں بھی اندھی ہو کیا تم اسے نہیں دیکھتیں؟

حضرت ام سلمہؓ نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردہ کا حکم آ چکا تھا۔

اسی طرح کی ایک اور روایت مؤطا میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک نابینا آیا تو انھوں نے اس سے پردہ کیا۔ کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں؟ حضرت عائشہؓ کہنے لگیں: ولکنی انظر الیہ یعنی اگر وہ اندھا ہے تو میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ (مؤطا امام مالک)

ان دونوں روایات سے ایک واضح حکم سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر مرد یا عورت میں سے کوئی ایک فریق اندھا بھی ہو تو بھی دوسرے بینا فریق کو اس سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ اس اندھے کے چہرے کی رنگت یا نقوش اور تناسب اعضا میں کوئی ایسی دلکشی ہو جو صنفی میلان کا سبب بن جائے۔

۳۔ ثقافت و تمدن کے اڈے فحاشی کے اصل مراکز دراصل یہی مقامات ہیں مثلاً کلب گھر، ڈانسنگ ہال، مخلوط تعلیم کے کالج اور یونیورسٹیاں سینما گھر وغیرہ۔ ایسے مقامات پر فحاشی کے تمام تر محرکات کو بروئے کار لا کر انھیں ثقافت و تمدن

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان، باب ماجاء فی احتجاب النساء من الرجال

کے مراکز سمجھا جاتا ہے۔ گویا موجودہ تہذیب و تمدن بالکل وہی چیز ہے جسے قرآن کریم نے جاھلیۃ الاولیٰ کے نام سے ذکر فرمایا ہے۔ ایسے مقامات پر مسلمان جیسے کچھ بھی اللہ اور اس کے احکامات کا پاس ہو شامل نہیں ہو سکتا بلکہ ایک مسلمان کی ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ ایسی تہذیب و تمدن کے خلاف حتی الوسع بھرپور جہاد کرے۔ ان تمام تر تشریحات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ماحول جس قدر دہشت اور شدت کا ہو گا، احکامات پردہ اتنے ہی ازخود ڈھیلے پڑتے جاتے ہیں اور جوں جوں حالت امن اور شہوت کے محرکات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے پردہ کے احکامات میں پوری پابندی اور شدت اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر آپ پردہ کے احکام کی اس حکمت یعنی فحش سے اجتناب کو ملحوظ رکھیں گے تو پردہ کے بعض احکامات سے پیدا ہونے والی الجھنیں ازخود ختم ہو تی جائیں گی۔

حکم غضِ بصر اور عورت

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ کو اندھے سے پردہ کا حکم دیا تھا۔ اب اس کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت عائشہؓ اور حبشیوں کے کرتب

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "عید کا دن تھا۔ حبشی لوگ اپنے سپر اور برچھیوں سے کھیل رہے تھے۔ یا تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ نے خود ہی فرمایا۔ کیا تو تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ آپؐ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ میرا گال آپؐ کے گال پر تھا اور آپ حبشیوں سے فرما رہے تھے دونکم بنی ارفدہ کھیل جاری رکھو۔ یہاں تک کہ میں یہ کھیل دیکھتے دیکھتے سیر ہو گئی۔ آپؐ نے پوچھا بس۔ میں نے کہا جی ہاں تو آپ نے فرمایا اچھا چلی جاؤ۔[۱]

اس حدیث اور پہلی حدیث میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو خود حضور اکرمؐ اندھے سے پردہ کرنے کا حکم دیتے ہیں اور حضرت عائشہ اندھے سے بھی پردہ کرتی ہیں۔ دوسری

---

[۱] بخاری۔ کتاب الجہاد باب الحراب

طرف بھی حضرت عائشہؓ حبشیوں کو دیکھتی ہیں اور دکھلانے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب اس ماحول اور ظروف و احوال کو سامنے رکھئے کہ:

۱۔ یہ کھیل فنونِ سپہ گری سے تعلق رکھتا ہے جس کی ترغیب آپؐ مسلمانوں کو اکثر دلاتے رہتے تھے اور یہ جملہ مسلمانوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی کو حکم دیا تھا کہ: یاایھاالنبی حرض المؤمنین علی القتال۔ گویا حضرت عائشہ اور اسی طرح دوسرے دیکھنے والوں کی اصل توجہ فنون جنگ کے کرتب دیکھنے کی تھی، نہ کہ حبشیوں کی طرف۔ تو جس طرح جنگ کے میدان میں مرہم پٹی، پانی پلانے یا ایسے ہی بعض دوسرے کاموں کی اجازت ہے اسی طرح فنونِ حرب و ضرب کو دیکھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

۲۔ حبشی بیچارے کالے رنگ کے اور موٹے ہونٹوں والے ہوتے ہیں۔ انھیں دیکھنے سے شہوانی ہیجان پیدا ہونا تو درکنار، اگر پہلے سے موجود ہو تو وہ بھی کافور ہو جاتا ہے۔ گویا احوال و ظروف کی تبدیلی سے حکم حجاب میں بھی رخصت پیدا ہو گئی۔

عورت کے لئے رعایت کا پہلو

علاوہ ازیں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہئے کہ اگرچہ غضِ بصر کا حکم عورتوں اور مردوں کے لئے ایک جیسا ہے۔ تاہم عورتوں کے لئے اس سلسلہ میں رعایت برتی گئی ہے۔ چہرہ چھپانے کا حکم عورتوں کو ہے مردوں کو نہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ غضِ بصر کا حکم بجالانے اور چہرہ چھپانے کے باوجود بھی بعض اوقات عورتوں کی نظر غیر مردوں پر پڑ سکتی ہے لیکن مرد نقاب کی حالت میں عورت کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس رعایت کی وجہ یہ ہے کہ عورت کی نظر غیر مرد پر پڑنا اتنا خطرناک نہیں جتنا مرد کی نظر عورت پر پڑنا خطرناک ہے۔ کیونکہ:

۱۔ عورت اپنی زندگی کے بہت سے لمحات میں طبعی طور پر ایسے کاموں سے نفور ہوتی ہے مثلاً دورانِ حمل، حیض و نفاس وغیرہ۔ جبکہ مرد ان چیزوں سے آزاد ہوتا ہے۔

۲۔ شرم و حیا کا مادہ عورت میں مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ وہ طبعی طور پر فحاشی کے کاموں میں پیش قدمی کو اپنے لئے باعث ہتک سمجھتی ہے۔

۳۔ اس کی خلقت و فطرت انفعالی ہے۔ اگر وہ چاہے بھی تو فحاشی کے کاموں میں پیش قدمی کرنے کی

اس میں اہلیت ہی نہیں ہوتی۔ زنا بالجبر کی تمام وارداتیں مردوں کی طرف سے ہی ہوتی ہیں۔
یہیں سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے فاطمہ بنت قیس کو اپنے چچازاد بھائی عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا کے ہاں عدت گزارنے کے لئے کیوں ارشاد فرمایا تھا۔
اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر غض بصر کے احکام میں عورتوں کے لئے رعایت ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ کو ابن ام مکتوم نابینا سے پردہ کا حکم کیوں دیا؟ تو ہمارے خیال میں اس کی وجہ ازواج مطہرات کی جلالت شان ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے لستن کاحد من النساء۔ لہٰذا رخصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عزیمت کا حکم دیا گیا کیونکہ انھیں تمام مسلمان عورتوں کے لئے نمونہ بن کر دکھلانا مقصود تھا۔

بقیہ: صفحہ ۵ کا

برآمد ہونے کی خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ فساد کے شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ پولیس، پی۔ اے سی اور انتظامیہ کی سرد مہری کے ساتھ سوچی سمجھی انتقامی کارروائی کے شکار ہوئے ہیں۔
سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے سیاستدانوں کو حکومت میں برقرار رہنے کا کوئی اخلاقی حق نہیں رہ گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی زمام کار پولیس فورس کے حوالے کر دی ہے۔ عوام سے ان کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور وہ بلٹ پروف شیشے کے گھروں میں رہ رہے ہیں اب وہ عوام کے رہنما نہیں رہ گئے یہ لیڈر غیر ملکی بنکوں میں دولت رکھتے ہیں۔ غیر ملکی شراب اور کاروں کا استعمال کرتے ہیں اور غیر ملکی حکومتوں کو ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات کا الزام دیتے ہیں۔ یہ کھیل کے نام پر اسرائیلی ٹیم سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور آنجہانی وزیر اعظم کی سمادھی کے نام پر بارہ ایکڑ زمین پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ کیسی اندھیر نگری ہے؟

ہم انسانی شرافت کی بات کرتے ہیں اور تیسری دنیا کے مظلوموں کے بڑے حمایتی ہیں، ہم سری لنکا حکومت پری ٹوریا، پنٹیگن اور اسرائیلی حکومت پر ظلم و تشدد کا الزام لگاتے ہیں لیکن میرٹھ میں نظم و ضبط کی بحالی کے نام پر جو کچھ کیا گیا ہے وہ ہمارے لئے اب بھی راز بنا ہوا ہے۔ ہمیں حکومت، پی۔ اے سی، پولیس اور میرٹھ انتظامیہ کے کردار پر بحث و مباحثہ کے ساتھ حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ان سماجی اور معاشی اسباب کا پتہ لگانا چاہئے جو اس طرح کی واردات کے نہ صرف میرٹھ میں ذمہ دار ہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے تمام علاقوں میں بھی۔

روی دلجون، بستی۔ (پائنیر)۔

پہلی قسط

مجیب اللہ ندوی

عبادت اور خدمت

ایک مدت سے مکمل اسلامی شریعت کا رواج ہماری روزانہ کی زندگی میں باقی نہیں رہ گیا ہے اس لئے دین و شریعت کا جب نام آتا ہے تو ہمارا ذہن عقائد و عبادات کے مسائل تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے یا پھر نکاح و طلاق یا ولادت اور موت کے وقت کچھ دیر کے لئے ہمیں شریعت کے کچھ مخصوص احکام یاد آجاتے ہیں مگر عام طور پر دین کا اس سے وسیع تصور نہ تو ہمارے ذہن میں آتا ہے اور نہ تو ہماری عملی زندگی میں دوسرے احکام شریعت کا کوئی مظاہرہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی، مخلوقِ خدا کی بے غرض خدمت اور محبت، پڑوسیوں کی دیکھ بھال، بیماروں کی عیادت، کسی بیوہ، یتیم یا غریب کی مدد، اسلامی اخلاق و آداب کی پابندی، حلال روزی کی طلب اور زندگی کے دوسرے معاملات کے بارے میں ہمارا ذہن بہت کم منتقل ہوتا ہے کہ یہ سارے کام بھی دین کا جز اور اجر و ثواب کے اعتبار سے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا بہترین ذریعہ ہیں جس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ خدا کی رضا کا قریب ترین ذریعہ ہیں۔ گویا حقوق اللہ کے ادا کرنے کو تو ہم دین کا کام سمجھتے ہیں اور حقوق العباد کی ادائیگی کو ہم دنیا کا کام سمجھتے ہیں، یا اسے دین کا کام سمجھتے بھی ہیں تو ہماری زندگی میں عملاً اس کی اتنی اہمیت نہیں دکھائی دیتی جتنی ہونی چاہئے۔ اس کا اثر ہمارے عوام ہی پر نہیں بلکہ علماء اور خواص کے دل و دماغ پر بھی پڑا ہے کہ ظاہری طہارت، فرض عبادات اور چند معاشرتی احکام مثلاً نکاح و طلاق یا ولادت و موت کے چند مخصوص احکام ہی کی کارفرمائی ہماری عملی زندگی میں نظر آتی ہے اور ہمارے مدارس میں انہی احکام کے پڑھنے پڑھانے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بقیہ احکام کے بارے میں دین و عبادت ہونے کا تصور ہماری عملی زندگی ہی سے نہیں بلکہ ذہنوں سے بھی نکلتا جا رہا ہے اور ان کے پڑھنے پڑھانے کا وہ اہتمام نہیں کیا جاتا جو طہارت و عبادات اور نکاح و طلاق کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ گویا پورا دین خود

مسلمانوں کی زندگی میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے اور خود ہم حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مصداق بن گئے ہیں :

بَدَأَ الاسلامُ غریبًا وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء۔ [1]

(مسند احمد)

اسلام کی ابتدا اجنبیت اور مسافرت کی حالت میں ہوئی تھی اور ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ وہ پھر اجنبی اور مسافر ہو جائیگا تو جو لوگ ایسے وقت میں اس کو تھامے رہینگے اور دوسرے لوگوں کو اسکی طرف بلاتے رہینگے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

ہماری دینی مجلسوں، وعظ و تقریر کی محفلوں اور سیرت کے جلسوں میں دین کے کچھ فروعی مسائل پر گھنٹوں وعظ و تقریر ہوگی مگر انسانیت کے احترام، بندوں کے حقوق کی ادائیگی، اسلامی اخلاق و آداب کی پابندی، معاملات کی درستگی، خدمت خلق کے اجر و ثواب اور اس کی کوتاہی پر عذاب و عتاب کے موضوع پر بہت کم تقریروں اور وعظوں میں زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم جب اخلاقی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو چند موٹی موٹی برائیوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر وہ برائیاں جو بندوں کی حق تلفی سے متعلق ہیں ان کا ذکر ہماری تقریروں میں بہت کم ہوتا ہے۔ ہم چوری، ڈاکہ اور زنا و شراب کو تو برائی سمجھتے ہیں اور واقعتاً یہ بہت بڑی بڑی برائیاں ہیں، مگر کسی کا حق مار لینے یا کسی کا حق ادا نہ کرنے، کسی ظالم کا ساتھ دینے، سُود کھانے اور رشوت لینے، کسی سے حسد کرنے یا کسی کی چغلی اور غیبت کرنے یا کسی کو زک دینے اور ستانے، حرام روزی سے نہ بچنے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ یہ ان سے زیادہ بڑی برائیاں ہیں، بلکہ یہ برائیاں تو آدمی کی بے شمار نیکیوں کو برباد کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی کی افادیت و ضرورت پورے طور پر نہ تو مسلم معاشرہ میں محسوس کی جارہی ہے اور نہ ملک کے دوسرے بندگانِ خدا اس میں کوئی کشش محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس خدا بیزاروں . . اور

---

[1] غرباء کے بارے میں صحابہ نے سوال کیا کہ من الغرباء یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا الذین یصلحون ما افسد الناس (لوگوں نے دین میں جو بگاڑ پیدا کر دیا ہے اسے درست کرتے ہیں)۔ بعض روایتوں میں ما افسد الناس من سنتی آیا ہے یعنی جو سنتیں لوگوں نے ترک کر دی ہیں وہ انھیں جاری کرتے ہیں۔

مادہ پرستی کے مارے ہوئے موجودہ دنیا کے انسانوں کو اگر کوئی چیز ایمان ویقین، دین واخلاق اور روحانیت کی طرف مائل کر سکتی ہے تو وہ ہمارا اخلاق وکردار اور عام انسانوں کے ساتھ بھلائی وہمدردی اور ان کی خدمت اور ان سے محبت ہی ہے۔ اگر ہم کوئی خدمت کا کام کرتے بھی ہیں تو سیاسی سطح سے یا ضمنی طور پر اس کو ہم اپنے دین کا جز، اپنے ایمان کا تقاضا اور آخرت میں اجر وثواب کا ذریعہ سمجھ کر نہیں کرتے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ عبادت کا اہتمام، ذکر واذکار کی کثرت سراپا اجر وثواب کے کام ہیں اور ان سے انفرادی طور پر قلب میں جلا اور روشنی بھی پیدا ہوتی ہے اور خداوند تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہوتی ہے مگر خدمت کے ذریعہ اجر وثواب اور خدا کی خوشنودی کے ساتھ پاس پڑوس ماحول اور پوری سوسائٹی کو اسلام کی اور مسلمانوں کی افادیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ عبادت کی کثرت سے لوگوں کے دلوں میں ایک احترام کا جذبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس سے الفت ومحبّت کے جذبات نہیں پیدا ہوتے، اس کے برخلاف انسانوں کی بھلائی، ہمدردی اور خدمت کرنے والوں کے لئے احترام کے ساتھ محبت والفت کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جذبات محض خدمت کرنیوالے ہی کیلئے نہیں پیدا ہوتے بلکہ آہستہ آہستہ اس کے دین ومسلک اور پیغام کے لئے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنے طرز عمل اور خدمت سے یہ محسوس کرا سکیں کہ ہم اس ملک میں یا کسی ملک میں کچھ لینے سے زیادہ دینے کے لئے آئے ہیں۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنی ذات کو محبوب بنانے کی خاطر یہ کام کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدمت کے باطنی نتائج کے ساتھ ظاہری اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ خود حدیث نبویؐ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم اپنے رشتہ دار ونسب کو یاد رکھو تاکہ جن سے جو تعلق ہے اس کے اعتبار سے ان کے ساتھ سلوک اور ہمدردی کر سکو اور اس سلوک وہمدردی کا نتیجہ کیا ہوگا:

فان صلۃ الرحم محبۃ فی الاھل مثراۃ فی المال منساۃ فی الاثر۔ (ترمذی)	صلہ رحمی اہل وعیال میں محبّت کا سبب بنتی ہے۔ اس سے مال میں زیادتی ہوتی ہے اور اس کی یاد بہت دنوں تک باقی رہتی ہے۔

غور کیجئے کہ جب رشتہ ونسب سے تعلق رکھنے والوں کی خدمت میں یہ اثر ہے جس میں آدمی کی کچھ نہ کچھ غرض بھی وابستہ ہوتی ہے تو پھر تمام بندگانِ خدا کی خدمت، ان غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد جس سے انسانیت کے رشتہ کے علاوہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے، ناممکن ہے کہ اس سے انکے قلب میں آپکی طرف سے محبت نہ

پیدا ہو لفظ انسان جو ہماری زبان کا جز بن گیا ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (یعنی اصل) انس ہے گویا انسان کو اپنے ہم جنس دوسرے انسانوں سے انس و محبت نہ ہو تو وہ انسان، انسان نہیں ہے

آپ کو راقم الحروف کے اس خیال سے ضرور اتفاق ہوگا کہ اگر ہم اپنی دینداری کو خدمت خلق اور رفاہ عام کے کاموں، بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے پاس و لحاظ سے جوڑ دیں تو مسلم معاشرہ کو بھی اس سے ایک نئی زندگی ملے گی اور ملک کے دوسرے بندگانِ خدا کے لئے ہمارا دین ہی نہیں بلکہ ہماری ذات بھی قابل کشش بن جائیگی اگر کشش نہیں پیدا ہوگی تو کم سے کم نفرت و حقارت اور دشمنی و عداوت کے جذبات ضرور کم ہو جائیں گے۔ الانسان عبد الاحسان (انسان احسان کا غلام ہوتا ہے) کے اصول کے تحت ایسا ہونا ضروری ہے اور یہ چیز نہ صرف دعوت و تبلیغ کے لئے موثر ثابت ہوگی بلکہ اس کے لئے ملک میں ایک وسیع میدان پیدا کر دے گی۔ ہر شخص جس نے اپنی زندگی میں کبھی خدمت خلق کا کام کیا ہے وہ اسکے اثرات کی شہادت ضرور دے گا۔ راقم الحروف کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے، معمولی سی خدمت کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

شہر اعظم گڑھ میں جس کرایہ کے مکان میں میں بال بچوں سمیت رہتا تھا اسی کے سامنے ایک ہریجن لکڑی کی ٹال کرتا تھا اور اس کے گھر کے عورت، بچے میرے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دن چار بجے کے قریب میں دار المصنفین سے واپس آیا تو دیکھا کہ ہریجن کی بیوی رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ بولی نرائن (اس کے لڑکے کا نام) کے باپ کو پولیس والے کوتوالی پکڑ لے گئے ہیں۔ میں نے کہا گھبراؤ نہیں میں کوتوالی جاتا ہوں عصر کی جماعت کا وقت قریب تھا، میں نے نماز پڑھی اور پھر آکر واقعہ پوچھا تو بتایا کہ ایک لڑکا کنٹرول کی دوکان سے ایک آدمی کے غلہ کی گٹھری لے کر بھاگا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ لڑکا گٹھری لکڑی کی ٹال پر پھینک کر چمپت ہو گیا۔ جو پولیس والا لڑکے کی تلاش میں نکلا تھا اس نے لڑکے کو تو پایا نہیں مگر گٹھری ٹال پر مل گئی اس لئے اس نے ان کو پکڑ لیا اور کوتوالی لے گیا۔ میں نے شیروانی پہنی اور رکشہ کر کے کوتوالی پہنچا۔ اس سے پہلے کبھی کوتوالی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا میں ایک اجنبی کی طرح کوتوالی کے صحن میں ٹہلنے لگا۔ اتفاق سے کوتوال صاحب کمرے سے باہر نکلے اور ایک سفید پوش آدمی کو ٹہلتے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ آدمی جو حوالات کے قریب بیٹھا ہے اس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، انھوں نے کہا کہ کیا کہنا ہے۔ میں نے صحیح واقعہ بیان کیا ان کو میری بات پر یقین آگیا اور ڈانٹ کر ایک پولیس مین سے کہا کہ اس بیچارے کو کیوں بٹھا رکھا ہے۔ مولوی

صاحب کے ساتھ کر دو۔ میں نے اسے رکشے پر بٹھایا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آگیا۔ اس تھوڑی سی خدمت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بیس برس گزر جانے کے بعد بھی وہ ہریجن اور اسکے بچے ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ جیسے میں نے کوئی بڑا احسان کر دیا ہے۔ اس کے لڑکے پاس ہوتے ہیں تو میرا پیر چھونے آتے ہیں۔ ملازمت ملتی ہے تو ممنونیت کے اظہار کے لئے کچھ تحفہ تحائف بھی لاتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بچوں جیسا معاملہ رکھتا ہوں۔ وہ دوسروں سے کہتے ہیں کہ یہ دیوتا ہیں۔

اسی احساس کی بناء پر راقم الحروف کا بہت دنوں سے خیال تھا کہ تمام مسلمانوں اور خاص طور پر علماء وطلبہ اور دوسرے اہلِ علم کے سامنے تحریر و تقریر کے ذریعہ خدمت خلق کو عبادت کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور ان میں زیادہ سے زیادہ یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ تحریر اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اس سے بہت سے فائدوں کے ساتھ یہ فائدہ بھی انشاء اللہ سامنے آئیگا کہ آداب و اخلاق کے بہت سے احکامِ شریعت جن پر عمل کر نیکی ہم کو کبھی توفیق نہیں ہوتی، یا اگر ہوتی بھی ہے تو اسکی اہمیت قلب میں پورے طور پر نہیں بیٹھتی۔ خدمت خلق کی راہ سے ان پر عمل کرنے کی توفیق بھی مل جائیگی اور قلب میں اس کی اہمیت اور لطف و لذت کی کیفیت بھی محسوس ہو گی، مثلاً آپ جب ایک یتیم کی پرورش، ایک غریب کی مدد یا کوئی بے غرض کام کریں گے تو آپ اپنے دل میں ایک خاص قسم کی خوشی اور لطف ولذت کی ایک کیفیت ضرور محسوس کریں گے اور اس مدد کرنے میں اس بات کا بھی خیال ضرور رہے گا یا رہنا چاہئے کہ کسی مستحق کی مدد ہم اس طرح کریں کہ اسے کوئی ذلت محسوس نہ ہو، اس کی دل شکنی نہ ہو اور نہ احسان جتانے کی صورت پیدا ہونے پائے۔ پھر خدمت میں جو تکلیف یا خلاف مزاج بات قدم قدم پر پیش آتی ہے اسے خدمت کرنے والوں کو لامحالہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اسطرح آدمی کے اندر صبر و ضبط کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور ناگوار بات برداشت کرنے کی عادت پڑتی ہے جو بجائے خود بہت بڑی عبادت ہے اور پھر دوسروں کی مجبوری و بے چارگی دیکھکر اپنی مجبوری و بے چارگی کا تصور بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ ایک خدمت کے ذریعہ انفرادی طور پر آپنے کتنے فائدے حاصل کئے اور کتنے احکامِ شریعت پر عمل ہو گیا اور اس سے ایک بڑا اجتماعی فائدہ یہ بھی سامنے آئیگا کہ شریعت اسلامی، جو ہمارے گھروں اور مسجدوں میں بند ہو کر رہ گئی ہے وہ ان سے باہر نکل کر ہماری عملی زندگی میں ہر شخص کو دکھائی دینے لگے گی اور یہ ایک ایسی تبلیغ و دعوت ہو گی جس کا مقابلہ بڑی سے بڑی کتابیں، لمبی سے لمبی تقریریں اور دوسری بہت سی کوششیں بھی نہ کر سکیں گی۔ اس کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ آخرت میں اجر و ثواب کا احساس جو ہماری زندگی میں جامد اور

بے روح نظر آتا ہے جب آپ کوئی بے ریا اور بے غرض خدمت کا کام کریں گے تو اجر و ثواب کا یہ تصور زندہ اور متحرک ہو کر آپ کی نظروں کے سامنے آجائیگا اور ہمارے معاشرہ میں بھی اسکی افادیت کی مجسم تصویر سامنے آجائیگی۔ اگر زبان سے نہیں تو ہر ایک کا دل پکار اٹھے گا کہ اسلام کے ماننے والے اور آخرت طلب انسان ایسے ہوتے ہیں، بشرطیکہ خدمت خلق کو ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی دینی زندگی کا جزبنالیں۔ عارف شیرازی نے بہت صحیح کہا ہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خدا تک جلد پہنچنے کا راستہ خدمت خلق کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یہ راستہ محض ذکر و تسبیح عبادت و ریاضت اور گدڑی پہننے میں منحصر نہیں ہے۔

لڑکپن میں اسمٰعیل میرٹھی کی اردو کتاب میں یہ شعر پڑھا تھا۔ آج اسکی پوری معنویت سمجھ میں آتی ہے ؎

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو، چلے جاؤ

ایک عیسائی پادری کا طریقہ تبلیغ بھی ہمارے لئے قابل تقلید ہے۔ جب وہ تبلیغ میں کھڑے ہوتے تو پہلے اردو کے یہ دو شعر ضرور پڑھتے تھے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

یہ اشعار ان آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں سارے انسانوں کو ایک ماں باپ کی اولاد اور ساری مخلوق کو اللہ کا خانوادہ قرار دیگیا ہے۔ یہ ہماری دولت تھی جسے عیسائی مشنریوں اور دوسری قوموں نے اپنا لیا ہے۔ پوری تفصیل آگے آتی ہے۔ یہاں یہ چند آیات قرآنی اور حدیث نبوی ملاحظہ ہوں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي — اے لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو زندگی

خلقکم من نفس واحدۃٍ وخلق منھا زوجھا وبثّ منھما رجالاً کثیراً ونساءً واتّقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام۔
(نساء)

ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور پھر انھیں سے ان کا جوڑا (حوا) بنایا اور ان دونوں کے ذریعہ بیشمار مردوں اور عورتوں کو اس پروردگار نے پھیلایا۔ تو اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ و تعلق کا پاس و لحاظ رکھو۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

الناس کلّھم بنو آدم و آدم من تراب۔

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور حضرت آدمؑ مٹی سے بنائے گئے تھے۔

دوسری حدیث ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔
(شعب الایمان۔ بیہقی)

ساری مخلوق اللہ کا خانوادہ ہے تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب مخلوق وہ ہے جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

ایک حدیث میں ہے کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو۔ آسمان والا تم پہ رحم کرے گا۔

دوسری حدیث میں ہے:

المومن مألف ولا خیر فی من لایألف ولا یؤلف۔
(مشکوٰۃ)

مومن سراپا انس و محبت ہوتا ہے اور اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جسے نہ دوسروں سے انس و محبت ہو نہ دوسرے اس سے انس و محبت رکھتے ہوں۔

جو لوگ اپنی ذاتی اصلاح و تربیت کی خاطر اجتماعی حقوق کو نظرانداز کر دیتے ہیں انکے بارے میں آپ نے فرمایا

المومن الذی یخالط الناس ویحمل اذاھم خیر ممن لم یخالط الناس

وہ مسلمان جو لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان کی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں

ولم یحمل اذاھم ۔ (مشکوٰۃ) سے ملتا جلتا نہیں اور نہ ان کی تکلیفیں اٹھاتا ہے۔

یہ بات بھی ہمارے ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآن کا پیغام محض عام مسلمانوں کیلئے نہیں بلکہ ساری دنیا کیلئے ہے۔ اسی لئے قرآن میں الناس (عام) کا لفظ دو سو سے زیادہ جگہ اور انسان کا لفظ ساٹھ سے زیادہ مرتبہ استعمال کیا گیا ہے اور لفظ مسلمین صرف چالیس بیالیس جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح انبیاء کی تبلیغ و دعوت کے موقع پر "سلام" کے لفظ کو قرآن نے بار بار استعمال کیا ہے۔ سلام کے معنی سلامتی اور امن کے ہیں۔ یہ لفظ اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انبیاء کی دعوت و تبلیغ کی بنیاد انس و محبت، عام انسانوں کی بھلائی اور سلامتی پر ہے اور ساری اسلامی تعلیم اس کے گرد گھومتی ہے خود اسلام کا مادہ بھی یہی سلم اور سلام ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم کی اس عمومیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے خدمت کے علاوہ دوسرا اور کون سا راستہ ہے؟

یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام مجموعہ ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے حقوق کا دائرہ جتنا وسیع ہے اس سے زیادہ بندوں کے حقوق کا دائرہ وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت سے اپنے حقوق میں بہت سی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے یا معاف کر دینے کی امید ہے۔ مگر بندوں کے حق میں اگر کوتاہی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اس وقت تک معاف نہیں کرتا جب تک وہ بندہ راضی نہ ہو جائے۔ اس لئے اسکی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے اور اس وقت ہماری سوسائٹی میں دن بہ دن اس کی طرف سے توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔

امام نووی رحؒ نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اگر یہ گناہ اللہ کے حق سے متعلق ہے تو اس سے توبہ کرنے کی تین شرطیں ہیں (۱) گناہ کو ترک کر دے (۲) اس پر اس کو ندامت اور شرمندگی ہو (۳) اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اگر یہ گناہ بندوں کے حق سے متعلق ہے تو ان تین شرطوں کے ساتھ ایک چوتھی شرط یہ بھی ہے کہ وہ گناہ جس سے متعلق ہے اس سے معاف کرا لیا جائے۔ مثلاً کسی کو گالی دی ہے، کسی کی غیبت کی ہے، کسی پر ظلم کیا ہے، کسی کو بلا وجہ مارا پیٹا ہے، رشوت لی ہے یا کسی کی جائیداد اور زمین یا رقم ہڑپ کر لی ہے تو جب تک اس سے معافی نہ مانگ لے اور جو چیز لی ہے اسے واپس نہ کر دے اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا اور یہ موقع اسے دنیا ہی میں ہے، اگر اس نے بندوں کے یہ حقوق اس دنیا میں ادا نہیں کئے ہیں تو قیامت کے دن اس کی نیکیاں اہل حقوق کو دے دی جائیں گی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دنیا میں کسی قوم کے زوال و ترقی میں حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کا دخل ہوتا ہے۔ مغربی قوموں کے افراد اپنی انفرادی زندگی میں بہت سی برائیوں کے مرتکب ہوتے ہیں مگر وہی افراد اجتماعی زندگی کے معاملات میں انتہائی دیانت دار ذمہ دار واقع ہوتے ہیں۔ عام طور پر دھوکہ، فریب، جھوٹ اور بد معاملگی وغیرہ جیسی برائیوں سے ان کو آپ دوچار پائیں گے۔ پھر مصیبت کے مواقع پر جیسے زلزلہ، طوفان یا کسی اور آفت ارضی و سماوی پر عام انسانوں کی وہ جتنی جانی و مالی مدد کرتے ہیں اسکا دسواں حصہ بھی ہماری مسلمان حکومتیں نہیں کرتی ہیں۔ اگر وہ کرتی بھی ہیں تو صرف مالی مدد، جانی مدد تو خال خال وہ کرتی ہیں۔ اسی بنا پر پرائیویٹ اور نجی زندگی کی بے شمار برائیوں کے باوجود وہ دنیاوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں اور ہم انفرادی زندگی میں تو کچھ نیکیاں کر بھی لیتے ہیں مگر اجتماعی زندگی کی برائی ہم میں ان سے زیادہ موجود ہے اس لئے ہم زوال پذیر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے کے لئے محض حقوق اللہ کی رعایت کافی نہیں بلکہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی رعایت بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگی میں ضروری ہے۔

شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً اسی بنا پر لکھا ہے کہ "حکومت کفر و ایمان کی بنیاد پر نہ ملتی ہے اور نہ جاتی ہے بلکہ یہ ظلم و عدل کی بنیاد پر ملتی یا چھینی جاتی ہے"۔ اس سلسلہ میں جاپان کا ایک معمولی واقعہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے۔ ہندوستان کے ایک ممتاز اخبار نویس جاپان گئے۔ وہ جاپانی حکومت کے کسی ذمہ دار سے گفتگو کر رہے تھے، اثنائے گفتگو ہندوستانی اخبار نویس نے پوچھا کہ آپ کے ملک میں کوئی خاص پریشانی ہے؟ جاپانی افسر نے کہا کہ ملک میں دودھ کی کمی ہے۔ ہم پورے ملک کو دودھ سپلائی نہیں کر پا رہے ہیں جس سے ہمیں پریشانی ہے۔ ہندوستانی اخبار نویس نے اپنی ذہنیت کے مطابق کہا کہ اگر آپ لوگ دودھ میں تھوڑا سا پانی شامل کر دیں تو سب کو دودھ مل جائے گا اور کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا۔ جاپانی افسر بولا کہ آپ میرے دوست ہیں۔ آپ نے یہ بات مجھ سے کہہ دی مگر کسی اور سے نہ کہئے گا ورنہ وہ آپ کو قتل کر دے گا۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے آپ اسے ایک تاریخی مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس ملک پر مسلمانوں نے بھی حکومت کی اور انگریزوں نے بھی۔ ہماری حکومت کو گئے ہوئے ڈیڑھ دو سو برس گزر گئے مگر ہماری طرف سے ملک کی ایک بڑی آبادی کے دل کے اندر سے عناد اور انتقام کے جذبات اب تک نہیں نکلے ہیں مگر عیسائیوں کی حکومت گئے ہوئے ابھی تیس پینتیس برس ہوئے ہیں مگر ان کی طرف سے وہ کدورت دلوں میں ہماری طرف سے بھری

ہوئی ہے۔ دوسرے وجوہ کے ساتھ اس کی بہت بڑی وجہ راقم الحروف کے نزدیک یہ بھی ہے کہ ہم نے اس ملک میں اپنی سیاسی برتری کی جتنی طویل تاریخ اور تہذیب و تمدن کے جتنے نقش و نگار چھوڑے ہیں، عام انسانوں کی ہمدردی، محبت و خدمت کی اتنی وسیع تاریخ نہیں چھوڑی ہے۔ اس لئے ہماری افادیت کا پہلو عام آدمیوں کی نظروں کے سامنے پورے طور پر نہیں آسکا۔ برخلاف عیسائیوں کے انھوں نے سیاسی تغلب کے ساتھ پورے ملک میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کی ایک زندہ تاریخ چھوڑی ہے۔ اسلئے ان کی خدمت کو ہر شخص آج ہر بڑی آبادی میں اسپتال، اسکول یا دوسرے رفاہی اداروں کی شکل میں دیکھ سکتا ہے اور ان کی افادیت ہر شخص کی آنکھوں کو نظر آسکتی ہے۔ انھوں نے ان کاموں کے ذریعہ یہاں کی آبادی کا دل جتنا جیتا ہم اتنا نہ جیت سکے۔ مسلمانوں میں صوفیاء اور مجاہدین کا ایک گروہ ایسا رہا ہے جس نے اپنے پیچھے عام انسانی ہمدردی اور خدمت کے نقوش بھی چھوڑے ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے عناد و دشمنی کے بجائے محبت و عقیدت کے جذبات آج بھی موجود ہیں۔ آج ان کے مزاروں پر مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم حاضری دیتے ہیں اس سے بحث نہیں کہ ان کا یہ فعل صحیح ہے یا نہیں مگر غازیوں اور شہیدوں کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سب ان کی خدمت اور ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے۔ اسکے برخلاف آپ نے کسی بادشاہ کے مزار پر محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کرتے نہیں دیکھا ہوگا، حالانکہ ان کی زندگی میں لوگوں کا ہجوم سب سے زیادہ ان ہی کے گرد رہتا تھا۔ اس لئے موجودہ مادی دور اور اس ملک کے موجودہ ماحول میں ہمیں خدمت کے راستہ سے یہی الفت و محبت بندگانِ خدا کے دلوں میں پیدا کرنی ہے اور یہی چیز ہمیں اس دنیا میں باعزت مقام دلا سکے گی۔

اگر کسی بستی کی پوری مسلمان آبادی ختم ہو جائے تو اس بستی میں بسنے والے دوسرے لوگ آپکے نہ ہونے سے کیا کمی محسوس کریں گے؟ اور جہاں ایسا واقعہ پیش آچکا ہے وہاں کے لوگوں نے کیا کمی محسوس کی؟ کیا یہ بات ہمارے لئے باعث عبرت نہیں ہے کہ ہماری حیثیت "گاؤ آمد و خر رفت" کی سی ہو جائے۔

ہم اس ملک میں پچاس ساٹھ برس سے سیاسی سطح سے عزت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اس کے ذریعہ ہم نے جتنا پایا ہے اس سے زیادہ کھویا ہے اس لئے ہمیں خدمت کی راہ کو اپنانا چاہئے۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اور آئندہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جائے گا اس کا مطلب حاشا وکلا یہ ہرگز نہیں ہے کہ عبادت اور ذکر و اذکار کی اہمیت ہم کم کر رہے ہیں یا ہم "خدمت خلق" کیلئے خدائی خدمت گاروں کی کوئی نئی جماعت بنانے یا اس کے لئے کسی نئی تحریک کی بنیاد ڈالنے جارہے ہیں بلکہ اس کا مقصد صرف یہ

ہے کہ عبادت کے ساتھ خدمت کی اہمیت بھی ہمارے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اس وقت مسلمانوں میں جو جماعتیں دعوت و تبلیغ یا اصلاحِ معاشرہ کا کام کر رہی ہیں یا جو ادارے یا محترم شخصیتیں تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا کام کر رہی ہیں وہ اس کی اہمیت کو محسوس کر کے اسے اپنے پروگرام کا ایک جزء بنالیں اور تعلیم یافتہ حضرات اپنے اپنے دائرۂ اثر اور علماء و مشائخ اپنی نجی مجلسوں اور درس و تدریس کے حلقوں اور وعظ و پند کی محفلوں میں اس پہلو کو زیادہ سے زیادہ واضح کریں اور خود اپنی ذاتی زندگی سے اس کا مظاہرہ کریں، خاص طور پر ہمارے عربی مدارس کے اساتذہ کے اندر یہ جذبۂ خدمت پیدا ہو جائے اور طلبہ یا دوسرے لوگوں سے خدمت لینے کے بجائے اپنا کام اپنے ہاتھ سے کر کے اور عام بندگانِ خدا کی خدمت کر کے اس سنت کو زندہ کرنے لگیں، تو ہر سال ہزاروں آدمی اس سے متاثر ہونگے اور ایک پرامن اخلاقی انقلاب آجائیگا مگر اس کے لئے بزرگوں جیسی تواضع، سادگی اور بے نفسی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف بھی مولوی طبقہ کا آدمی ہے اس لئے عرض کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ہر مدرسہ بلکہ ہر مدرسہ کے جتنے اساتذہ ہیں ان سب کی الگ الگ ریاست قائم ہوتی ہے جس میں ایک چھوٹی سی ریاست کے لوازمات اور خدم و حشم سب موجود ہوتے ہیں۔ حالانکہ مدرسہ سے تنخواہ لینے کے بعد ہمیں طلبہ سے یا دوسرے افراد سے خدمت لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے البتہ اگر ہم ان کے ساتھ کچھ تبرع کریں یا پھر کوئی معذوری ہو یا کوئی ملازم اسی کے لئے مقرر ہو تو خدمت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء جب ان مدارس سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ان کی اکثریت چونکہ مدرسہ یا مسجد کے کام میں لگتی ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں خادم سے زیادہ مخدوم بننے کے مواقع ہوتے ہیں اسلئے وہ خادم بننے سے زیادہ مخدوم بننے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کا علم جسمانی اور مادی اعتبار سے تو ان کے لئے ضرور مفید ہوتا ہے مگر دوسروں کو اس سے بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے طلبہ کے اندر ذاتی اور انفرادی خدمت کے بجائے ادارہ یا ملت کی اجتماعی خدمت کا جذبہ ابھارنا چاہئے۔ اگر ہم اپنا مزاج ایسا بنالیں تو اس سے دین و ملت کو بے شمار فائدے پہنچیں گے۔ ایسا کرنا ہمارے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا ہے اور اسلئے بھی ضروری ہے کہ وقت و حالات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم اپنے اندر مخدومانہ تفوق پیدا کرنے کے بجائے خادمانہ تواضع اور خاکساری پیدا کریں۔ انشاء اللہ اس خادمانہ تواضع کے ذریعہ ہمکو مخدومانہ طرزِ عمل میں جو عزت حاصل ہے اس سے زیادہ عزت ہی

نہیں بلکہ محبت بھی حاصل ہو جائے گی، جس طرح ہم طلبہ سے مادی وجسمانی خدمت لیتے ہیں اسی طرح ہم کو بھی تعلیمی خدمت کے علاوہ کبھی کبھی ان کی مادی وجسمانی خدمت کرنی چاہئے مثلاً اگر ہم کو وہ روزانہ کھانا لا کر کھلاتے ہیں تو کبھی ہم کو بھی ان کو دستر خوان پر بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا لا کر کھلانا چاہئے۔ اگر وہ صحت و بیماری میں ہماری خدمت کرتے ہیں تو ہم کو بھی ان کی صحت و بیماری میں خدمت کرنی چاہئے۔ بیماری میں صرف مزاج پرسی کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا چاہئے جو ہم اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہیں ایک اور مفید بات ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ مخدوم بننے کی خواہش ہی سے ہمارے معاشرے میں اور خاص طور پر مدارس میں انتشار، اختلاف اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے مدرسوں میں کوئی شخص خادم بننا پسند نہیں کرتا، بلکہ اپنے اپنے دائرہ میں ہر شخص مخدوم بننا چاہتا ہے۔ تو ظاہر ہے جب بہت سے مخدوم بن جائیں گے یا اسکے لئے کوشش کریں گے تو ٹکراؤ کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے اگر خدمت کا جذبہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی جائے تو پھر بہت سے فتنے آپ سے آپ ختم ہو جائیں گے۔

عام طور پر یہ بات بھی مشاہدہ میں آتی ہے کہ ہم اپنے ہم مسلک یا ہم ذوق یا جماعتی تعلق رکھنے والوں کے لئے تو سراپا خادم بن جاتے ہیں مگر غیر مسلموں کے لئے یا اپنے ذوق و مسلک کے خلاف اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی ہمارے اندر کوئی جذبۂ احترام اور جذبۂ خدمت نہیں ابھرتا۔ حالانکہ ہماری خدمت کا میدان اپنوں سے زیادہ اجنبی اور غیر لوگ ہیں اسلئے کہ غیروں کی خدمت میں آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے، اور اپنی عزّت و وجاہت کی قربانی دینی پڑتی ہے اور اپنوں کی خدمت میں تو آدمی کے نفس کو طبعی طور پر قدرے تسکین بھی ہوتی ہے اور اپنوں سے کچھ نہ کچھ اغراض بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اس بنا پر غیروں کی مدد میں یقیناً زیادہ ثواب کی امید ہوتی ہے حدیث میں بار بار پوری مخلوق کو خدا کا خانوادہ قرار دیا گیا ہے اس لئے اس سلسلے میں بھی ہمارے قلب اور طرز عمل میں وسعت پیدا ہونی چاہئے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں اچھی طرح رہنی چاہئے کہ خدمت کو عبادت کی حیثیت سے ذہن نشین کرانا اور زندگی کی گاڑی کو اس راستہ پر ڈالنا آسان نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی پتہ ماری، استقامت اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ اجر و ثواب کے لحاظ سے تو یہ راستہ آسان تر ہے مگر فوری طور پر چونکہ اسکا کوئی محسوس نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آئے گا اس لئے گھبرا کر ہمیں اس راستہ کو چھوڑنا نہیں چاہئے بلکہ لگے رہنا چاہئے، برسوں کی محنت کے بعد انشاءاللہ اجر و ثواب کے علاوہ دنیا ہی میں اسکے کچھ محسوس اثرات بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔

عبادت کا مفہوم اور اس کی وسعت

ایمان وعقیدہ کی درستگی کے بعد اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت ان فرض عبادات کی ہے جنھیں ہم ارکان اربعہ (چار ارکان) کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ یہ عبادات نہ صرف یہ کہ فرض ہیں بلکہ خدا کی رضا حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہیں۔ ان فرض عبادات کے ساتھ سنن ونوافل اور ذکر و اذکار اور تسبیح وتہلیل کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس سے فرض میں جلا بھی پیدا ہوتی ہے اور قرب خداوندی اور رضائے الٰہی کا راستہ اور زیادہ آسان بھی ہو جاتا ہے مگر خدا کی خوشنودی اور اس کا قرب اور اسکی رضا محض فرض عبادات کی ادائیگی اور نوافل کی پابندی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی ذرائع ہیں۔ عام طور پر ہم ارکان اربعہ (نماز روزہ، حج، زکوٰۃ) یا زیادہ سے زیادہ ذکر واذکار کو ہی عبادت سمجھتے ہیں مگر ہماری فقہ کی تمام کتابوں میں فرض عبادات چار ہی نہیں بلکہ پانچ شمار کی گئی ہیں۔ ان چاروں کے ساتھ فقہائے اسلام جہاد کو بھی عبادت میں شمار کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ارکان اربعہ فرض عین ہیں اور جہاد فرض کفایہ ہے اور اس کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی فضیلت بسا اوقات فرض عین سے بڑھ جاتی ہے۔ جہاد کا درجہ اس لئے اتنا بلند ہے کہ یہ عبادت کے ساتھ ایک خدمت بھی ہے۔ اس میں دین کیلئے دعوت اور کوشش، ملک اور اسکی سرحدوں کی حفاظت، ہر طرح کی فوجی خدمت اور کمزور انسانوں کو ظلم وجور سے بچانا، سب کچھ شامل ہے اور اسکا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ان خدمتوں کی راہ میں کسی انسان کی زندگی کام آجائے۔ پھر عبادت میں ایک اہم رکن زکوٰۃ بھی ہے جو خالص بندوں کا حق ہے اور ان کی خدمت کا دوسرا نام ہے۔ صدقات وزکوٰۃ کا ذکر جتنی جگہ اور جس تفصیل کے ساتھ قرآن پاک میں ہے اتنی تفصیل نماز، روزہ کی نہیں ہے مگر ہماری عملی زندگی میں نماز کی جتنی اہمیت ہے اتنی زکوٰۃ کی نہیں۔ زکوٰۃ اور جہاد کو تو اسلامی شریعت نے براہ راست عبادت میں داخل کیا ہے مگر نکاح جو بظاہر ایک نفسانی فعل ہے اس کو بھی اسلامی شریعت عبادت قرار دیتی ہے۔ ابن عابدین لکھتے ہیں:

لیس لنا عبادۃ شرعت من عہد آدم الی الآن ثم تستمر فی الجنۃ الا النکاح۔	نکاح کے علاوہ کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر جنت تک رہنے والی ہو۔

"جنت تک باقی رہنے والی عبادت" سے اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں ہے کہ:

وزوجناھم بحور عین۔	ہم نے ان کا جوڑ لگا دیا ہے بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

لانہ عبادۃ من وجہ ومعاملۃ من وجہ　یہ ایک حیثیت سے عبادت ہے اور دوسری حیثیت سے معاملہ ہے

اس کے عبادت ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات، اولاد کی تربیت، ماں باپ اور رشتہ داروں کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو قرآن و حدیث میں اجر و ثواب اور خدائے تعالیٰ کی رضا کا سبب بتایا گیا ہے اور عبادت کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ آدمی اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرے۔ دوسری وجہ اس کے عبادت ہونے کی یہ ہے کہ نکاح کے ذریعہ آدمی بے شرمی، بے حیائی اور ان کے تمام لوازمات سے بچتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ہمدردی، محبت اور بہی خواہی کا جذبہ نشو و نما پاتا ہے اور یہ تمام چیزیں خدا سے اس کے تعلق کو مضبوط بناتی ہیں اور معاملات سے اس کا تعلق اس حیثیت سے ہے کہ اسی کے ذریعہ بندگانِ خدا کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی سے سارے معاشرتی تعلقات مثلاً وراثت اور وصیت وغیرہ کے احکام پیدا ہوتے ہیں پھر انہی کے ذریعہ معاشرہ میں آدمی کو اپنی حیثیت معلوم ہوتی ہے اور سارے رشتے و ناطے پیدا ہوتے ہیں اور انہی کے ذریعہ تمدنی و معاشرتی حقوق و فرائض کا علم ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد امام محمدؒ سے کسی نے فرمائش کی کہ آپ تقویٰ پر ایک کتاب لکھیں۔ انھوں نے کہا کہ "صنفت کتاب البیوع" میں نے خرید و فروخت اور دوسرے معاملات پر ایک کتاب لکھ دی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ معاملات میں شریعت کی پابندی اور حرام و مکروہ سے بچنا تقویٰ پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اسلئے میں نے یہ کتاب لکھ دی تاکہ لوگ اس کے ذریعہ حقیقی تقویٰ حاصل کر سکیں

حدیث میں آتا ہے:

التاجر الصدوق الامین مع الانبیاء والصدیقین۔　سچے امانت دار تاجر کا حشر انبیاء اور صدیقین کے ساتھ ہوگا۔

غرض یہ کہ ہر وہ کام جو قرآن پاک اور حدیث نبوی کے مطابق اور ثواب کی نیت سے کیا جائے وہ سب عبادت ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو تم کھاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے"۔ جو اپنی بیوی اور بچے کو کھلاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے اور جو اپنے خادم کو کھلاتے ہو وہ بھی صدقہ ہے (الادب المفرد)۔ صدقہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گویا ہم صدقہ خیرات کھاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح صدقہ خیرات کرنے میں آدمی کو ثواب ملتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے بال بچوں

کی خدمت شریعت کے حکم کے مطابق کرتا ہے تو اس میں بھی اجر و ثواب ہے۔

خدمتِ خلق بھی عبادت ہے

اس تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عبادت کا دائرہ محض نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔ جس طرح مذکورہ بالا عبادات قرب خداوندی اور اجر و ثواب کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں اسی طرح ایمان و یقین کی درستگی اور عبادت کی ادائیگی کے ساتھ مادی خدمت کے کام اور بندوں کے حقوق کی صحیح صحیح ادائیگی بھی عبادت اور عمل صالح ہے بلکہ کبھی کبھی معمولی خدمت سے خدا کی رضا جتنی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے اتنی نماز روزہ کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ تفصیل آگے آتی ہے اس لئے ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ادا کر کے مطمئن نہ ہو جانا چاہیئے بلکہ بندگانِ خدا کی خدمت کو بھی دین کا جز سمجھنا چاہیئے۔ بسا اوقات خدمت خلق کے لئے نماز، روزہ جیسی عبادت مؤخر کرنی پڑتی ہے۔ اگر مؤخر کر کے یہ خدمات انجام نہ دی جائیں تو نماز پڑھ کر بھی آدمی گناہ گار ہوتا ہے۔ ایک شخص نماز میں ہو اور اسے یہ یقین ہو جائے کہ نماز ختم کرنے تک ایک اندھا آدمی کنویں میں گر جائے گا تو نماز توڑ کر اندھے کو بچانا چاہیئے۔ ایک آدمی پیاس سے تڑپ رہا ہے دوسرا آدمی ذکر و تسبیح میں مشغول ہے تو اسے ذکر و تسبیح چھوڑ کر اس کی پیاس بجھانا چاہیئے۔ ایک پڑوسی فاقہ کر کے سو رہا ہے اور ہم اپنے گھر میں رات بھر تہجد میں مشغول ہوں تو اس تہجد سے افضل اس کی خبر گیری ہے۔ ایک مہمان کی خاطر نفل روزہ چھوڑ کر اس کے ساتھ کھانا پینا زیادہ افضل ہے۔ امام نووی نے ذکر و اذکار کی فضیلت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے؛

اعلم ان فضیلۃ الذکر غیر منحصرۃ فی التسبیح والتہلیل والتحمید والتکبیر ونحوھا۔ کل عامل للہ تعالیٰ بطاعتہ فھو ذاکر للہ تعالیٰ۔	ذکر کی فضیلت محض تسبیح تہلیل اور تحمید میں منحصر نہیں ہے بلکہ ہر کام جو اللہ کے لئے کیا جائے وہ ذکر ہے اور اس کا کرنے والا ذاکر ہے۔

پھر انھوں نے ان صورتوں کا ذکر کیا ہے جن میں ذکر چھوڑ کر خدمت کے اعمال میں لگنا افضل ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس میں نیت اللہ کی اطاعت ہو یعنی للہ فی اللہ ہو۔ شیخ عز الدین بن عبدالسلام جن کا شمار چھٹی صدی کے مجددین میں ہوتا ہے، اپنی مشہور کتاب قواعد الاحکام میں لکھتے ہیں؛

تقدیم انقاذ الغرقی علی اداء الصلوٰۃ ثابت لان انقاذ الغرقی المعصومین عند اللہ	کسی ڈوبتے کو بچا لینا نماز کے ادا کرنے سے مقدم ہے۔ اس لئے کہ ایک ڈوبنے والے معصوم کی جان

افضل من الصلوٰۃ والجمع بین المصلحتین ممکن بان ینقذ الغریق ثم یقضی صلاتہ ومعلوم ان ما فاتہ من اداء الصلوٰۃ لا یقارب انقاذ نفس مسلمۃ من الہلاک وکذالک لو رأی فی رمضان غریقاً لا یمکن تخلیصہ الا بالفطر فانہ یفطر وینقذہ لان فی النفوس حقاً للہ تعالیٰ وحقاً لصاحب النفس۔ فقدم ذالک علی اداء الصوم۔

(ج ۱ ص ۶۳ واصول فقہ ابوزہرہ ج ۱ ص ۳۷۴)

بچا لینا اللہ کے نزدیک نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔ دونوں مصلحتوں کو جمع کرنا اس طرح ممکن ہے کہ پہلے وہ ڈوبتے کو بچالے پھر اپنی نماز قضا کرلے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ نماز فوت ہونے کے مقابلے میں ڈوبنے والے کی جان بچا لینا زیادہ بہتر ہے اسلئے کہ نماز کی قضا ہو سکتی ہے مگر ڈوب کر مر جانیوالے کی کوئی تلافی ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اگر رمضان میں کسی کو ڈوبتے ہوئے دیکھے اور روزہ افطار کئے بغیر اسکو بچانا ممکن نہ ہو تو اسے روزہ توڑ کر بچانا چاہئے۔ اسلئے کہ انسانی جان میں اللہ کا بھی حق ہے اور بندوں کا بھی حق ہے، تو بندے کے حق کو روزہ پورا کرنے سے مقدم رکھا جائے گا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ایمان کے بعد سب سے اہم چیز دین میں عبادت ہے مگر جو لوگ عبادت میں غلو یا صرف اس کے مظاہر کو دین سمجھ کر بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی خدمت سے صرف نظر کرتے ہیں جیسا کہ یہود کا حال تھا، قرآن نے ایسے لوگوں کی ذہنیت پر گرفت کی ہے۔ جب قبلہ بیت المقدس سے بدل کر کعبہ مکرمہ کی طرف کر دیا گیا تو یہود نے اس پر بہت شور مچایا اور یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ اب تک تو مسلمان کہتے تھے کہ ہم پہلی کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، مگر اب تو انھوں نے اپنا یہ فیصلہ بھی بدل دیا۔ بعض مسلمانوں کے دل میں بھی کچھ وسوسہ پیدا ہونے لگا کہ شاید یہود صحیح کہتے ہیں۔ اس پر قرآن نے اعلان کیا:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاخر والملٰئکۃ والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمٰی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصٰبرین فی البأساء والضراء وحین البأس اولٰئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون ۵

(البقرۃ ع ۲۱)

بھلائی مشرق یا مغرب کی طرف رخ پھیر دینے میں منحصر نہیں ہے لیکن حقیقی بھلائی اس شخص کے لئے ہے جو اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود اعزا و اقارب، یتیموں، غریبوں، مسافروں اور سوال کرنیوالوں اور غلاموں پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جب وہ کوئی عہد کریں تو اسے پورا کریں اور بدحالی اور خوشحالی اور جنگ کی حالت میں صبر واستقامت دکھانے والے ہوں۔ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔

اس میں ایمان کے بعد بندوں کے حقوق پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے کہا گیا: واٰتی المال علیٰ حبہٖ۔ جس نے مال کو محبت کے باوجود خرچ کیا۔ مال کی محبت جو ہر ہود کی رگ وپے میں جاری وساری تھی اس کو سامنے رکھئے تو پھر اس کی اہمیت کا پورا اندازہ ہوگا۔ پھر مال کے مصارف کو صرف اپنے رشتہ داروں ہی میں محدود نہیں کیا گیا بلکہ مساکین، مسافر، سائل اور غلاموں کو آزاد کرانے کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی معاشرہ کی اہم تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی وہ عہد ومعاہدہ ہے یہ عہد ومعاہدہ کی پابندی محض دو فرد تک محدود نہیں ہے بلکہ قومی اور بین الاقوامی معاملات تک وسیع ہے پھر ان باتوں کا ذکر کرنے کے بعد نماز روزہ کا ذکر کیا گیا اور پھر کہا گیا: اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون۔ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فان اللہ تعالیٰ امر المومنین اولاً بالتوجہ الی بیت المقدس ثم حولھم الی الکعبۃ فشق ذلک علی نفوس طائفۃ من اھل الکتاب وبعض المسلمین فانزل اللہ بیان حکمتہ فی ذلک وھو ان المراد انما ھو طاعۃ اللہ وامتثال اوامرہ (ج ۱ ص ۲۰۷)

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بیت المقدس کی طرف رُخ پھیر دینے کا حکم دیا پھر بدل کر کعبہ کی طرف ان کا قبلہ کر دیا یہ بات اہل کتاب اور بعض مسلمانوں کو گراں گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے اپنی یہ حکمت بیان کی کہ نیکی سے مراد ہر معاملہ میں اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی بجا آوری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے حقوق کو سب سے اونچی گھاٹی قرار دیا ہے پھر اس اونچی گھاٹی کی تشریح کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

"غلاموں کو آزاد کرنا اور رشتہ دار یتیموں اور غریبوں کو فقر وفاقہ کے وقت کھانا کھلانا۔"[1]

قرآن نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو نہ تو یتیموں کی عزت کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں، اور ان کو دین کی تکذیب قرار دیا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے بندوں سے تقویٰ کی تاکید ہی نہیں کی ہے بلکہ بندوں کے حق اور انکی خدمت کو اپنے حق کے برابر قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص دکھاوے کے لئے نماز روزہ اور کار ثواب کرے تو اسکے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ نماز خدا کے یہاں مقبول نہیں ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ وصدقات جو خالص بندوں کے حقوق ہیں اگر اس کی ادائیگی میں بھی آدمی کے اندر ریا ونمائش پیدا ہو جائے تو یہ مال جو بندوں پر خرچ کیا گیا ہے اسکے لئے وبال ثابت ہوگا۔ قرآن پاک نے اس کی بڑی اچھی تمثیل بیان کی ہے:

---

[1] سورۃ بلد [2] سورۃ ماعون

"اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان اور تکلیف جتا کر ضائع نہ کرو۔ اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے چکنا پتھر ہو جس پر مٹی آگئی ہو اور اس پر بارش ہوئی ہو اس کی مٹی دھل کر صاف ہو گئی"۔

گویا جس طرح دکھاوا خدا کے حق میں گناہ ہے اور وہ کسی عمل کو غیر مقبول بنا دیتا ہے اسی طرح بندوں کے حقوق کی ادائیگی محض ظاہری صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ اخلاص اور قلب کی گہرائیوں سے ہونی چاہئے۔ اسکے ذریعہ بندوں کو راحت پہنچائی جائے نہ کہ تکلیف و اذیت پہنچائی جائے۔

یہاں ایک بات اور ذہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن نے ہر جگہ ایمان کے بعد عمل صالح پر زور دیا ہے۔ یہ عمل صالح کیا ہے، کیا محض نماز، روزہ ہی عمل صالح ہے یا پوری شریعت پر عمل کرنا عمل صالح ہے؟ اگر پوری شریعت پر عمل کرنا عمل صالح ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب ہم دین یا دیندار کا نام لیتے ہیں تو ہمارا ذہن نماز، روزہ اور حج کے ادا کرنے والے ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ زکوٰۃ بھی خالص عبادت ہے مگر اس کی طرف بھی ہمارا ذہن عبادت کی حیثیت سے کم ہی منتقل ہوتا ہے اور بندگان خدا کی خدمت، ان کے حق کی ادائیگی کے بارے میں تو ہمارا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا کہ یہ بھی عمل صالح یا عبادت ہے۔ ایک شخص کی کمائی حرام ہے مگر وہ نماز، روزہ اور نفل اور ذکر و اذکار کا بڑا اہتمام کرتا ہے تو اسے ہم دیندار سمجھتے ہیں مگر ایک شخص فرض اور سنت ادا کرکے لوگوں کی خدمت میں لگا رہتا ہے تو اسے ہم دیندار نہیں سمجھتے۔ ایک شخص کو ہم نماز سکھا دیں تو دین کا کام سمجھتے ہیں اور ایک دوسرا شخص کسی کو روزگار سے لگانے کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو ہم اسے دین کا نہیں بلکہ دنیا کا کام سمجھتے ہیں۔ پہلا کام بیشک دین کا ہے مگر دوسرا کام بھی دین کا چھوٹا کام نہیں ہے۔ کسی روزگار کے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی نہ جانے کتنی دینی و اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان تفصیلات کا مقصد یہ ہے کہ ہم نے دینداری کے مفہوم کو بھی بہت محدود کر دیا ہے اور اپنے عمل سے بھی ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ عبادت اور عمل صالح چند آسان کام پر عمل کر لینے کا نام ہے حالانکہ انسانوں کی خدمت، ان کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی اور حسن سلوک، اور ان کے حقوق کی ادائیگی بھی اسی طرح عبادت اور عمل صالح ہے جس طرح نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ عبادت ہے۔ اگر وہ فرض یا نفل عبادت میں کوتاہی کرے گا تو اس کے ذاتی اجر و ثواب میں کمی ہوگی لیکن اگر بندوں کی خدمت یا ان کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا تو اس سے اسکے نماز روزہ کا اجر و ثواب بھی کم ہو جائے گا اور اسکی نیکیاں اہل حقوق کو دے دی جائینگی اور سزا کا مستحق ہوگا۔ ذیل میں

کچھ قرآن کی آیات اور احادیث نبوی نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ایمان و اخلاص کے ساتھ ایک دنی خدمت آدمی کو کتنی آسانی سے جنت تک پہنچا دیتی ہے اتنی لمبی لمبی عبادتیں نہیں پہنچاتیں۔

صدقہ و زکوٰۃ ایک عبادت ہے لیکن اگر کوئی شخص زکوٰۃ دے کر احسان جتانے لگے یا لینے والے کو ذلیل سمجھ بیٹھے تو اس کی یہ عبادت ضائع ہو جائے گی۔ قرآن نے اسی لئے تنبیہ کی ہے کہ:

لاتبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ۔	اپنے صدقات کو احسان دھر کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔

نماز ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے لیکن اگر وہ کمزوروں کی خدمت اور انکے ساتھ حسن سلوک سے خالی ہو تو منافقین کی نماز ہے۔

ارءیت الذی یکذب بالدین۔ فذالک الذی	کیا آپنے دیکھا اس شخص کو جو دین کی تکذیب کرتا ہے، جو یتیم کو دھکو
یدع الیتیم۔ ولا یحض علیٰ طعام المسکین۔	دیتا ہے اور غریب کو کھانا کھلانے پر ابھارتا نہیں۔ تو ہلاکت
فویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم	ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز سے غافل ہیں اور جو ریاکاری کرتے
ساھون الذین ھم یرآؤن ویمنعون الماعون۔	ہیں اور معمولی چیزیں لوگوں کو دینے میں بخل کرتے ہیں۔

بندگان خدا کی خدمت و بھلائی دین کی سب سے اونچی گھاٹی ہے جس پر چڑھ کر مومن جنت تک پہنچ جاتا ہے۔

وھدیناہ النجدین فلا اقتحم العقبۃ وما ادراک	ہم نے بھلے اور برے راستے کو بتا دیا تو جو اس اونچی گھاٹی پر چڑھا
ما العقبۃ فک رقبۃ او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ	اور معلوم ہے کہ وہ اونچی گھاٹی کون سی ہے۔ وہ ہے
یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً ذا متربۃ ثم کان	غلاموں کو آزاد کرنا یا بھوک میں کھانا کھلانا، اپنے رشتہ دار
من الذین اٰمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ	یتیموں کو یا انتہائی مجبور غریبوں کو۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور
اولٰئک اصحٰب المیمنۃ۔ (البلد)	انھوں نے لوگوں کو صبر کی نصیحت کی اور رحم و کرم کی دعوت دی وہی

روزہ میں کھانا پینا اور عورت کے قریب جانا حرام ہے لیکن اگر آپ بھول چوک کر ایسا کریں تو آپکا روزہ نہیں ٹوٹے گا لیکن اسی روزہ میں آپ کسی بندے کی غیبت کردیں، کسی کو گالی بک دیں تو آپکا روزہ مکروہ ہو جائیگا اور بعض ائمہ کے یہاں غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ احادیث نبوی میں اسکی مزید تفصیل ملے گی۔

ایک صحابی نے آپؐ سے دو عورتوں کے بارے میں سوال کیا کہ ایک عورت نماز روزہ بھی کرتی ہے اور دوسرے بھلائی کے کام بھی کرتی ہے مگر کسی کو گالی دیتی ہے کسی سے بدزبانی کرتی ہے، پڑوسیوں کو ستاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ دوزخی ہے۔ ایک دوسری عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ معمولی طور پر فرض نماز ادا کرتی ہے اور روزہ رکھتی ہے مگر پڑوسیوں کا حق ادا کرتی ہے، لوگوں سے حسن سلوک کا معاملہ رکھتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔

آپؐ نے ایک بار سوال فرمایا کہ مفلس کون ہے۔ صحابہؓ نے کہا کہ جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن روزہ، نماز اور نیکیاں لے کر آئے گا مگر اس نے کسی کو مارا یا ستایا ہوگا کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا۔ اس کی ساری نیکیاں اہل حق کے درمیان تقسیم کر دی جائیں گی۔ جب وہ نیکیوں سے خالی ہو جائے گا تو دوسروں کی برائیاں اس کے سر منڈھ دی جائیں گی اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ (صحیح مسلم، کتاب البر و مشکوٰۃ ص ۴۳۵)

مقصد یہ ہے کہ ایسے تمام اعمال جو انسانوں کے دلوں کو جوڑنے کے بجائے توڑ دیں یا ان سے کسی کے حق میں کمی آتی ہو تو وہ حرام یا مکروہ ہیں۔

غار حرا میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نبوت کا پیغام ملا تو آپؐ اس ذمہ داری کا احساس کر کے گھبرا اٹھے اور آپ کا قلب مبارک کانپ گیا اور اسی حالت میں گھر پہنچے۔ حضرت خدیجہ سے فرمایا کہ مجھے چادر اڑھا دو مجھے اپنے اوپر خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ نے آپؐ کو چادر اُڑھا دی پھر جب سکون ہوا تو آپؐ نے غارِ حرا کا پورا واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ مجھے اپنے اوپر خوف محسوس ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ نے آپؐ کی تسکین کے لئے جو الفاظ فرمائے وہ تاریخ انسانی میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں یکسوئی کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے حتیٰ کہ کئی کئی دن آپ گھر تشریف نہیں لاتے تھے مگر حضرتؓ خدیجہ نے تسکین دیتے وقت خدا کی مدد کیلئے آپ کی عبادت اور ذکر و تسبیح اور تدبّر و تفکر اور ریاضت و مجاہدہ کا واسطہ نہیں دیا بلکہ آپ نے آپ کی ان خدمات اور اخلاقی خوبیوں کا ذکر کیا جو خدا کی مدد کو سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔ حضرت خدیجہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

کلّا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الکلّ وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

(بخاری۔ باب بدء الوحی)

خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ آپ کو ذلیل اور رسوا کر دے، جب کہ آپ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، تھکے ماندے کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں اور غریب اور لاچار کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور تمام اچھے کاموں اور لوگوں کی پریشانیوں میں معاون و مددگار بنتے ہیں۔

بالکل یہی بات مالک ابن الدّغنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس وقت کہی جب وہ

قریش کے ظلم وستم سے پریشان ہوکر اور حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر ہجرت کے ارادہ سے مکہ سے کچھ دور باہر نکل آئے تھے کہ اتفاقاً راستہ میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی اس نے پوچھا ابوبکر! کہاں کا ارادہ ہے، فرمایا کہ میری قوم (قریش) نے سخت اذیت دے رکھی ہے اور میرا رہنا دشوار کر دیا ہے۔ اس لئے مکہ چھوڑ کر باہر جا رہا ہوں، اس نے غصہ میں کہا کہ قریش کے لوگ آپ جیسے شخص کے ساتھ ایسا کر رہے ہیں۔

لتزین العشیرة وتعین علی النوائب وتفعل المعروف وتکسب المعدوم[۱] ارجع فانت فی جواری۔

(ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۳)

آپ تو خاندان و معاشرہ کی زینت ہیں، مصائب میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، ہر اچھے کام کرتے ہیں اور نادار غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ آپ لوٹ چلیے اور آج آپ میری پناہ میں ہیں۔

مالک بن الدغنہ مسلمان نہیں تھے نہ حضرت ابوبکر سے کوئی رشتہ تھا بلکہ اسلام کے اسی طرح مخالف اور دشمن تھے جس طرح قریش کے افراد تھے مگر حضرت صدیق کی خدمت اور اخلاقی خوبیوں کی بنا پر ان کے پشت پناہ بن گئے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی نصرت و مدد جتنی خدمت و اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ آتی ہے اتنی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں آتی، لوگوں کے دلوں میں جتنی کہ دشمنوں کے دلوں میں بھی محبت جتنی اس راستے سے پیدا ہوتی ہے اتنی دوسرے کسی راستہ سے نہیں پیدا ہوتی۔ آپؐ کے وصال کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور کارِ نبوت کی ذمہ داری اب امت پر ڈالی گئی ہے اس لئے امت کے افراد میں بھی ایمان و یقین کی پختگی اور عبادت میں اہتمام کے ساتھ خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ پیدا ہو تو ہماری کوششیں اور اس کے فوائد محدود ہو کر رہ جائیں گے۔ ●●

---

[۱] معدوم کے معنی ایک تو یہ ہیں جو محتاج ہیں، دوسرے اس کے معنی نفیس یعنی اچھی چیز کے ہیں۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ ترجمہ ہوگا کہ آپ کی مدد اچھی ہے۔

حج

اسلامی عبادتیں دو طرح کی ہیں، ایک جسمانی جیسے نماز، روزہ۔ دوسری مالی جیسے زکوٰۃ۔ مگر ان دونوں طرح کی عبادتوں سے مل کر ایک تیسری عبادت بھی اسلام میں فرض ہے اور وہ ہے حج، یعنی اس میں انسان کو جسمانی مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔

حج کی اہمیت اور فضیلت

جس طرح نماز، روزہ اور زکوٰۃ، یہ تمام عبادتیں اگلی شریعتوں میں فرض تھیں اسی طرح حج بھی تمام شریعتوں میں فرض تھا۔ عرب جو حضرت اسماعیل کی نسل سے تھے اور ان کی تعلیم کو بھلا کر خدا کے ساتھ شرک کرنے لگے تھے اور ان کو آخرت اور رسالت پر یقین نہیں رہ گیا تھا، جن کا دن رات کا مشغلہ لڑائی جھگڑا، لوٹ مار اور قتل و خونریزی اور شراب نوشی تھا ان میں حضرت اسماعیل کی تعلیم کا اتنا اثر باقی رہ گیا تھا کہ حج کے زمانہ میں ان برائیوں سے توبہ کر لیتے تھے اور مکہ میں آ کر کعبہ کا حج کرتے تھے۔ اگلی شریعتوں کی طرح اسلام میں بھی حج کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ البتہ حج میں جو برائیاں ان لوگوں نے پیدا کر دی تھیں مثلاً وہ ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، کھیل تماشہ کرتے تھے، ان کو اس نے دور کیا۔ قرآن میں کئی جگہ حج کا ذکر آیا ہے اور اس کے تمام ضروری احکام بتا دیئے گئے ہیں۔ ایک جگہ اس کو فرض قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً۔

خالص خدا کی خوشنودی کے لئے ان لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

دوسری جگہ ہے:

الحج اشھر معلومات فمن

حج کے مہینے (شوال۔ ذوقعدہ، ذوالحجہ) سب کو

فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللّٰہ وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی واتقون یا اولی الباب۔

معلوم ہیں۔ جو شخص ان مہینوں میں حج کرنے کا فیصلہ کرلے اس کو چاہئے کہ اس پوری مدت میں شہوانی بات نہ کرے اور نہ کوئی برا کام کرے اور لڑائی جھگڑا کرے۔ جو نیک کام تم کرتے ہو اللہ اسکو جانتا ہے اور حج میں جانے سے پہلے زادِ راہ یعنی راستہ کا خرچ لے لو اور بہترین زادِ راہ اللہ کا خوف اور پرہیزگاری ہے۔ تو اے عقل والو! میری نافرمانی سے ڈرتے رہو۔

قرآن نے جو تین لفظ رفث، فسوق اور جدال استعمال کئے ہیں اس میں وہ تمام برائیاں آگئیں جو حج کو خراب کر دینے والی ہیں۔ افسوس ہے کہ حج میں ان برائیوں سے بہت کم لوگ بچتے ہیں۔ خاص طور پر جدال یعنی لڑائی جھگڑے کا منظر تو بہت دیکھنے میں آتا ہے۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی حج کی بے حد فضیلت بیان کی ہے۔ ایک بار آپؐ حج کی فضیلت بیان فرما رہے تھے۔ اہمیت کے پیشِ نظر ایک شخص نے پوچھا۔ یا رسولؐ اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے؟ آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے یہی سوال تین بار کیا مگر آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہہ دیتا کہ یہ ہر سال فرض ہے تو خدائے تعالیٰ ہر سال فرض کر دیتا اور تم سے یہ ہر سال ادا نہ ہو سکتا۔ اس لئے میں جتنی بات کا حکم دوں اس پر عمل کرو اور جن باتوں سے روکوں رک جاؤ۔ سوال نہ کیا کرو۔ حج عمر میں صرف ایک بار فرض ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے خالص خدا کی خوشنودی کے لئے حج کیا اور اس سفر میں جب تک رہا۔ نہ تو خواہشِ نفسانی اور بے شرمی کی بات کی اور نہ کسی سے لڑائی جھگڑا کیا اور نہ دوسری کوئی برائی کی، تو وہ حج سے واپس ہوگا تو گناہوں سے اس طرح پاک ہو چکا ہوگا جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے وقت ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں ہے کہ حج سے تمام گناہ معاف ہو جائیں مگر جو شرطیں قرآن و حدیث میں حج کے صحیح ہونے اور گناہ کے معاف ہونے کے لئے لگائی گئی ہیں ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ اب جو شخص خدا کی خوشنودی کے بجائے نام ونمود کے لئے حج کرتا ہے، برائیوں سے بچنے کے بجائے

زمانۂ حج میں بھی وہ برائیاں کرتا ہے، ایسے شخص کا حج کیسے قبول ہو سکتا ہے اور اس شخص کے گناہ کیسے معاف ہو سکتے ہیں جو فریضۂ حج کو تجارت، نفع اندوزی، بلیک مارکٹنگ۔ اسمگلنگ اور وجاحت طلبی کے لئے استعمال کرتا ہے۔

جو لوگ حج کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں اور پھر بھی حج نہیں کرتے ان کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس زادراہ اور سواری موجود ہو اور وہ بیت اللہ تک پہنچ سکتا ہو پھر بھی وہ حج نہ کرے تو خدا کے نزدیک اس کے بے حج کئے مرنے اور یہودی و نصرانی ہوکر مرنے میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں برابر ہیں، کیونکہ خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صرف اس کی زبانی ہی تاکید نہیں فرمائی ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی کر کے دکھایا ہے۔ چنانچہ ۶ھ میں آپ نے عمرہ کا ارادہ کیا مگر کفار کی مداخلت کی وجہ سے نہ کرسکے، پھر دوبارہ ۱۰ھ میں کئی ہزار صحابہؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے مکہ تشریف لے گئے اور ایک لاکھ سے زیادہ مجمع کے ساتھ حج ادا فرمایا اور اس میں اپنا وہ مشہور خطبہ دیا جس کو خطبۂ حجۃ الوداع یعنی آخری حج کا خطبہ کہا جاتا ہے۔

آپؐ کی وفات کے بعد عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس فرض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ بعض صحابہؓ تو ہر سال حج کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم اپنے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی ملکوں کے تمام ذمہ داروں و اس موقع پر بلا کر ان سے ملک کے حالات معلوم فرماتے تھے اور ان کو ضروری ہدایات دیتے تھے۔ چونکہ عالم اسلام کے ہر حصہ سے مسلمان حج کے لئے آتے تھے۔ اس لئے اگر کوئی اہم حکم دینا ہوتا تو مجمع عام میں اس کا اعلان کر دیا جاتا تھا کہ آسانی سے ہر گوشہ میں حکم پہنچ جائے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں بہت سی نئی نئی قومیں کثرت سے مسلمان ہوئیں مثلاً عیسائی، مجوسی، صابی وغیرہ۔ جدید الاسلام ہونے کی وجہ سے ان کے ذہن میں اس کی فرضیت، کی اہمیت ابھی پورے طور پر نہیں بیٹھی تھی، اس لئے باوجود استطاعت کے بہت سے لوگ حج کے لئے نہیں آتے تھے۔ اسی طرح

بعض پرانے مسلمان بھی اس میں سستی کرنے لگے تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جو لوگ قدرت کے باوجود حج نہ کریں گے میں ان سے جہاد کروں گا جس طرح نماز اور زکوٰۃ چھوڑنے والے سے جہاد ہے۔

آپ نے اس میں اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف کیا جس میں حج چھوڑنے کو کفر کہا گیا ہے۔ اور اس حدیث کی طرف جس سے استدلال کر کے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں سے جہاد کیا تھا۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے نمائندوں کو بھیجوں اور تحقیق کروں کہ جو لوگ حج کی استطاعت رکھتے ہوئے حج پر نہیں آتے ان پر جزیہ[1] لگا دوں۔

ان تفصیلات سے اندازہ کیجئے حج پر کس قدر ایمان ہے اسلام میں کتنی اہمیت اور فضیلت ہے۔ اور اس کے ترک کرنے والوں کو اللہ کے رسول نے اور صحابہ کرامؓ نے کتنا زیادہ ناپسند کیا ہے اور کس قدر برا سمجھا ہے۔

حج کب فرض ہوا؟

حج کی اہمیت تو ملتِ ابراہیمی میں پہلے سے تھی مگر اس کی فرضیت ہجرت کے بعد ۶ھ میں ہوئی جب تک آپؐ اور صحابہؓ مکہ میں تھے کعبہ کی زیارت سے شرف اندوز ہوتے رہے۔ ہجرت کے بعد وہ اس سعادت سے محروم ہو گئے لیکن کعبہ کی زیارت کا شوق و ذوق سینوں میں باقی تھا۔ چنانچہ فرضیت حج کے فوراً بعد آپؐ عمرہ کی نیت سے ۶ھ میں چودہ سو صحابہ کو ساتھ لے کر مدینہ سے مکہ روانہ ہو گئے مگر کفارِ قریش مانع ہوئے اور آپؐ کو اور صحابہؓ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا۔ اسی موقع پر آپؐ نے ان سے وہ مشہور صلح کی جو "صلح حدیبیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد جہادی مشغولیت کی وجہ سے تین سال تک موقع نہیں ملا۔ پھر ۱۰ھ میں آپؐ نے باقاعدہ حج ادا فرمایا جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے اور اس کے تین چار مہینے کے بعد آپؐ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

حج کے معنی

لغت میں کسی باعظمت شخص یا مقام کی زیارت کا ارادہ کرنے کو حج کہتے ہیں اور اسلامی شریعت میں حج کے زمانہ میں خانہ کعبہ کی زیارت کرنے اور میدانِ عرفات میں پہنچنے کو حج کہتے ہیں۔[2]

---

[1] جزیہ وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت اور فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے لیا جاتا ہے۔

[2] هو زيارة مكانٍ مخصوصٍ في زمنٍ مخصوصٍ بفعلٍ مخصوصٍ (در مختار)

خانہ کعبہ مکّہ کا ایک خاص مقام جس کو ہم خانہ کعبہ کہتے ہیں اور جس کے اردگرد اور آس پاس حج کے سارے ارکان ادا ہوتے ہیں۔ اس کو قرآن میں بَیْتُ عَتِیْق (پرانا گھر)، مسجدِ حرام (محترم مسجد)، خدا کا گھر اور قبلہ کہا گیا ہے۔ اسی کی طرف ہم پانچوں وقت منھ کرکے نماز پڑھتے ہیں اور اس کی طرف منھ کرکے پیشاب پاخانہ کرنے سے روکا گیا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ خدا کی عبادت کے لئے اس زمین پر سب سے پہلی عبادت گاہ مکّہ میں تعمیر ہوئی۔ یعنی اس کی تعمیر سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی پھر حضرت نوحؑ کے طوفان میں اس کی عمارت منہدم ہوگئی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے اس کو دوبارہ تعمیر کیا۔ آپ کے بعد بھی یہ عمارت کئی بار گری اور بنی۔ حضرت ابراہیمؑ کے کعبہ کی تعمیر کا ذکر قرآن میں تفصیل سے ہے۔ اس تعمیر میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کے صاحبزادے اور مشہور نبی حضرت اسمٰعیلؑ بھی شریک تھے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے سے پہلے بھی ایک بار سیلاب کی وجہ سے یہ عمارت گر گئی تھی تو کفارِ قریش نے پھر اس کو اٹھایا مگر جب عمارت تیار ہوگئی تو حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کے وقت آپس میں لڑنے لگے۔ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ اس متبرک پتھر کو ہم رکھیں۔ یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہوتا نہیں نظر آیا تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ حجرِ اسود کو ایک بڑی چادر میں رکھ دیا جائے اور اس چادر کو ہر قبیلے کے لوگ پکڑیں۔ جب ان لوگوں نے چادر اٹھائی تو آپؐ نے حجرِ اسود کو اس جگہ پر رکھ دیا اور جھگڑا ختم ہوگیا۔

حج کے فائدے حج کا اصلی فائدہ تو یہ ہے کہ اس فرض سے قیامت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جس طرح قیامت کے دن سب لوگ اپنے اپنے کفن میں اٹھیں گے اسی طرح تمام حاجی ایک طرح کے لباس میں حج کرتے ہیں، جس طرح میدانِ حشر میں سب لوگ حاضر ہوں گے اور ان سے پوچھ گچھ ہوگی اسی طرح عرفات کے میدان میں سب لوگ جمع ہوکر اس تصوّر کو تازہ کرتے ہیں۔ اسی طرح حج کا ہر رکن خدا کی فرماں برداری اور قیامت کی کسی نہ کسی ہولناکی کی یاد دلاتا ہے۔ اس سے خدا کی محبت تازہ ہوتی ہے اور اس کے ساتھ عشق کا اظہار ہوتا ہے اور ایک مومن کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ عشقِ خداوندی اور محبتِ الٰہی کا مظہر بن جائے۔ اس سے آدمی میں خواہشاتِ نفس پر قابو پانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، تواضع و انکساری پیدا ہوتی ہے۔ صبر و تحمل اور بردباری کی عادت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے دنیاوی فائدے ہیں۔ اس کے ذریعہ دنیا کے تمام

مسلمان ملکوں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ اس میں شامی بھی ہوتے ہیں اور مصری بھی، عراقی بھی ہوتے ہیں اور سوڈانی بھی، انڈونیشین بھی ہوتے ہیں اور چینی و جاپانی بھی، یورپ کے بھی ہوتے ہیں اور امریکہ کے بھی۔ پھر سفر کرنے سے آدمی کے تجربے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ آدمی کو تکلیفیں اٹھانے اور زحمتیں برداشت کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ حج کے پورے پروگرام پر نظر ڈالی جائے اور اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ:

۱۔ یہ حج خدا کی محبت واطاعت اور اس کی عبادت کی ایک تاریخی یادگار ہے۔ خدا کے اس گھر یعنی خانہ کعبہ کے پاس پہنچتے ہی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء آئے ہیں ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کی یاد جن کی نسل میں سب سے زیادہ انبیاء ہوئے ہیں، ہر قدم پر تازہ ہوتی ہے۔ دین کے لئے ان کی ہجرت، خدا کی بے پناہ محبت، خدا کی خوشنودی کے لئے اپنی محبوب سے محبوب چیز قربان کر دینے کا جذبہ یہاں زندہ شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح یہاں پر نبی آخرالزماں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں سے بھری ہوئی تیرہ سالہ مکی زندگی کے نہ جانے کتنے گوشے اور واقعات بیک نظر سامنے آجائیں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نماز پڑھتے ہوئے آپؐ پر اوجھڑی ڈالی گئی۔ یہ حضرت اُم ہانی کا گھر ہے جہاں سے معراج ہوئی۔ یہ فاران کی وہ چوٹی ہے جہاں آپؐ کا پہلا وعظ ہوا۔ یہ مہبط جبریل ہے، یہ دار ارقم ہے جہاں چند بے نوا دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا منصوبہ بناتے تھے، یہاں سے رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی۔ غرض کہ آپ جس طرف سے گزریں گے یہ مصرعہ پڑھیں گے۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

۲۔ حج کے ہر رکن سے توحید کا نقش دل پر ابھرتا ہے۔ قیامت کی بازپرس اور اس کی ہولناکی کا ایک ہلکا سا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

۳۔ پھر اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خدا کی، خدا کے دین کی اور خدا کے رسولؐ کی محبت رسمی اور ضابطہ کی نہیں بلکہ اس میں والہانہ پن، بے پایاں ذوق و شوق اور وارفتگی اور عشق ہونا چاہیے۔

۴۔ پھر اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خدا کی مرضی اور اس کی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو بلا وجہ اذیت نہ دی جائے اور نہ ان کا دل دکھایا جائے اور غلطی سے ایسا کر بیٹھے تو فوراً اس کی تلافی کرنی چاہیے۔

زیارتِ مدینہ منورہ

مدینہ منورہ کی حاضری، مسجد نبویؐ کی نماز اور گنبدِ خضرا کی دید، گو حج کے ارکان و فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن اگر کوئی قصداً ان سعادتوں سے محروم چلا آیا تو اس کے بارے میں بلا مبالغہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ آبِ حیوان کے کنارے پہنچ کر ابدی زندگی سے محروم چلا آیا۔

غور کیجئے! یہ اسلام کی دولت اگر ہم کو نہ ملی ہوتی تو کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی نعمت سے محروم نہ رہتے؟ نہ تو خالق کو پہچانتے اور نہ اس کے حقوق کا علم ہم کو ہوتا، نہ مخلوق کی حیثیت سے ہم واقف ہوتے، نہ اس کے حقوق کو جانتے، پھر کیا ہم میں اور بے عقل جانوروں میں کوئی فرق ہوتا؟ پھر یہ دولت ہمیں کیسے ملی، یہ روشنی ہم نے کہاں سے پائی، اس نعمت سے ہمارا دامن کیسے مالا مال ہوا۔ ان سب باتوں کا جواب صرف ایک ہے، یہ ساری سعادتیں ہم کو خدا کے آخری نبی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دامن کے طفیل سے ملیں۔ ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، گو آپؐ کا جسمِ اطہر پردۂ خاک میں چھپا ہوا ہے اور ہماری ظاہری آنکھیں آپؐ کو قیامت سے پہلے نہ دیکھ سکیں گی مگر آپ وہاں جائیں گے تو حضورؐ کے معنوی وجود کی شہادت وہاں کا ایک ایک ذرہ دے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یہاں بیٹھتے تھے، یہاں آرام فرماتے تھے، یہاں نماز پڑھتے تھے، یہاں وضو فرماتے تھے، یہاں آپؐ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے، یہاں بیٹھ کر وفود سے باتیں کرتے تھے، اس مقام پر وحی آتی تھی، اس مقام پر ہجرت کے بعد آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی تھی۔ یہ خندق ہے جس کے ذریعہ آپؐ نے دولتِ اسلام کی حفاظت کی تھی۔ جو لوگ اس نورِ مجسمؐ پر خاک ڈالنے آئے تھے ان کے منھ خود خاک آلود ہو گئے۔ یہ مسجدِ قبا ہے جہاں آپؐ نے سب سے پہلی نماز پڑھی، یہ مسجد القِبلَتَین ہے جہاں آپؐ نے قبلہ بدلا، یہ مسجدِ نبویؐ ہے جو اپنی موجودہ شان و شوکت کے لحاظ سے دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ ابتدا میں اس کی دیواریں کچی اینٹوں اور چٹانوں سے بنائی گئی تھیں، چھت کھجور کی پتیوں سے بنائی گئی تھی جس کی تعمیر میں بذاتِ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے حصہ لیا تھا۔ فرش چھرّیوں کا تھا، جب آپؐ اور صحابہؓ سجدہ کرتے تو ان مقدس پیشانیوں پر چھرّیاں لگ جاتی تھیں اور بارش میں نم آلود ہو جاتی تھیں۔ اسی مسجد کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ اس کی بنیاد خالص خدا کے تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ یہ اِس دنیا میں کسی

نبی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی آخری مسجد ہے۔

زخاکش بے نمود رو ید معانی

غرض یہ کہ مسجد نبویؐ کی زیارت کرکے اور مسجد نبویؐ میں نماز ادا کرکے، روضۂ اقدس کا نظارہ کرکے آپ اس منبع سعادت کو دیکھیں گے جہاں سے آفتاب اسلام کی شعاعیں بلند ہوئیں اور پھر سارا عالم اُن سے جگمگا اٹھا۔ ہزاروں درود و سلام ہوں اس ذاتِ گرامی پر جس کے ذریعہ یہ سب کچھ ہمیں ملا۔

مدینہ منورہ کا قدیم نام یثرب ہے جس کے لغوی[1] معنی ملامت اور فساد وغیرہ کے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے وہاں تشریف لے گئے تو اس کا نام مدینۃ النبی (نبی کا شہر) پڑ گیا جو بول چال میں صرف مدینہ کہا جاتا ہے۔ اب اس کو یثرب کے نام سے پکارنا مناسب نہیں ہے، یہ جاہلیت کی یادگار ہے۔ اس کے اور بہت سے نام ہیں، طیبہ، طابہ، طَیِّبَہ وغیرہ۔ اس سرزمین کی خاک میں بھی خدا کے کتنے بندے خوشبو اور لطافت محسوس کرتے ہیں، اور یہ اس دعا کا اثر ہے جو آپؐ نے مکہ سے ہجرت کرتے وقت کی تھی " اے اللہ جب تو مجھے اس جگہ سے نکالتا ہے، جو میرے نزدیک سب سے محبوب جگہ ہے، تو پھر ایسی جگہ لے جا جو دوسری آبادیوں میں تیرے لئے محبوب ہو۔"

زیارتِ نبویؐ کی فضیلت

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز پڑھنے کی اور اپنی قبر کی زیارت کی خود تاکید فرمائی ہے تاکہ مسلمانوں کا رشتہ ایمانی محبّت رسولؐ سے ٹوٹنے نہ پائے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ " جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا۔"

غور فرمایئے کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی رمق بھی باقی ہے آپؐ پر ظلم کرنا پسند کریگا؟ آپؐ کی زیارت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے آثار، آپؐ کی قبر شریف کی زیارت کی جائے۔ چنانچہ دوسرے موقع پر آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ:

" جس نے میری قبر کی زیارت کی اس نے گویا زندگی میں میری زیارت کی۔"

---

[1] کانہ کرہ الـثرب۔ لانہ فساد فی کلام العرب

آپؐ نے اس میں گویا کا لفظ فرمایا ہے۔ جس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ کوئی یہ بھولے سے نہ سمجھ لے کہ زیارتِ قبرِ نبویؐ سے مرتبۂ صحابیت پر پہنچ گیا بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح صحابہؓ کو دوسرے مسلمانوں پر فضیلت تھی اسی طرح زائرینِ قبرِ نبویؐ کو بھی دوسروں پر فضیلت ہوگی۔

زیارتِ مدینہ منورہ کا طریقہ

مکہ معظمہ سے طوافِ وداع کے بعد ہی مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو جانا چاہئے۔ مدینہ کی منزلیں جتنی ہی قریب آتی جائیں اپنے دل میں ادب واحترام اور جذبۂ شوق و ذوق بڑھانا چاہئے اور زبان پر راستہ بھر صلوٰۃ و سلام جاری رہنا چاہئے۔ مدینہ سے باہر شہر پناہ بنی ہوئی ہے۔ بہتر ہے کہ یہاں سے پیادہ پا سراپا ذوق وشوق ہو کر مدینہ میں داخل ہو، اور جب گنبدِ خضرا اور قبۂ نور کی دید سے چشمِ شوق شرف اندوز ہو تو زبان پر الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ جاری ہو جائے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جب باہر سے آتے تھے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ادب واحترام کی وجہ سے سواری سے اتر جاتے تھے۔ اور گریبان کے بٹن کھول دیتے تھے کہ شاید نقشِ پائے نبویؐ کا کوئی ذرہ ان کے سینۂ دل کو چھو جائے، گویا وہ سراپا درد ہو کر زبانِ حال سے وارفتگانِ شوق کو یہ پیغام دیتے تھے کہ ؎

قدم اے راہ رَو آہستہ تر نہ ۔ کہ بر ہر ذرۂ او دردمند ست

غالباً اسی عالم میں عزت بخاری نے کہا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر ۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اِس دیارِ حبیبؐ سے خود حبیبؐ کو جو تعلق اور شیفتگی تھی اس کا اندازہ اس حدیث سے کیجئے کہ بارگاہِ نبویؐ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"جب آپؐ کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو جب مدینہ کی دیواروں پر نگاہِ سعادت نواز پڑتی تو غایتِ شوق و محبت میں سواری کو تیز تر کر دیتے تھے۔" (بخاری)

اسی ذوق وشوق کے ساتھ مدینہ میں داخل ہو، اپنی قیام گاہ پر جا کر سامان رکھے، غسل و وضو اور مسواک سے فارغ ہو، اگر ہو سکے تو کپڑے بھی بدلے، خوشبو لگائے اور فوراً قبرِ نبویؐ کی زیارت کا رُخ کرے، مسجدِ نبویؐ کے دروازہ پر پہنچ کر صلوٰۃ والسلام پڑھے اور پھر مسجد میں جاتے وقت جو

دعا پڑھی جاتی ہے پڑھ کر مسجد میں قدم رکھے، اس وقت مسجد کے نقش ونگار، اس کے فرش وفروش، اس کی زیبائش وآرائش پر نگاہ نہ ڈالے بلکہ مسجد میں پہنچ کر سب سے پہلے پورے حضورِ قلب کے ساتھ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے اور سجدۂ شکر ادا کرے، اگر ہو سکے تو یہ دو رکعت نماز محرابِ نبویؐ کے پاس ادا کرے۔ اگر وہاں جگہ نہ ملے تو پھر کشمکش نہ کرے، جہاں جگہ ملے پڑھ لے، نماز کے بعد پورے ادب واحترام کے ساتھ پسب جانب سے مواجہ شریف کی جالیوں کے پاس آئے اور صلوٰۃ وسلام پڑھے مگر آواز میں تیزی نہ ہو بلکہ پست آواز سے پڑھے، قرآن میں آپ کے سامنے آواز بلند کرنے سے منع کیا گیا ہے، وہ سلام کافی ہے جو نماز میں تشہد میں پڑھا جاتا ہے یعنی اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ ۔ پھر آپؐ کے دونوں محبوب صحابی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو سلام کرے اور پھر وہاں سے منبرِ نبویؐ کے پاس آئے اور اپنی دینی ودنیوی فلاح کے لئے دعا مانگے۔ مسجد نبوی میں ایک جگہ ریاض الجنّۃ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں اگر ہو سکے تو نماز پڑھے اور دعا مانگے، اس کے بعد پھر دوسرے مشہور مقامات ہیں ان کی زیارت کرے مثلاً جنۃ البقیع، جہاں نہ جانے کتنے فدایانِ اسلام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سپردِ خاک ہیں۔ مسجدِ قبا اور دوسری مسجدوں میں جائے، خاص طور پر جبلِ احد پر جائے جہاں اسلام وکفر کے درمیان دوسری جنگ ہوئی تھی، اور قلب ودماغ کو ولولۂ جہاد سے لبریز کرے اور ان شہدائے اُحد کی قبروں کی زیارت کرے جن میں سے کتنے بے کفن سپردِ خاک کر دیئے گئے تھے، یہاں پہنچ کر قرآن کی یہ آیت تلاوت کرے:

سَلَامٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ — تم پر سلامتی ہو کہ تم لوگ دینِ حق پر قائم رہے اس دنیا میں یہ کیا ہی اچھا انجام ہے۔

جب تک مدینہ منورہ میں رہے پورے ذوق وشوق سے پانچوں وقت مسجد نبویؐ میں باجماعت نماز پڑھے اور ہو سکے تو تہجد ونوافل بھی، پھر جب وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ ہو تو حتی الامکان مسجد نبویؐ میں دو رکعت نماز پڑھ کر قبرِ نبوی کے پاس صلوٰۃ وسلام پڑھ کر رخصت ہو۔
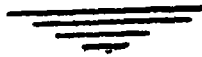
عارفانہ غزل

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ

یہ ہوشیار ہیں، یا ہیں یہ تیرے دیوانے
نثار ہوتے ہیں جن پر ہزار مے خانے

گیا میں بھول گلستاں کے سارے افسانے
دیا پیام کچھ ایسا سکوتِ صحرا نے

گذر رہی ہے جو دل پر وہ کوئی کیا جانے
بنا دیا مجھے بے کیف یادِ فردا نے

نہیں جو شمعِ محبت کے ہائے! پروانے
خدا کی شان وہ آئے ہیں مجھ کو سمجھانے

سکوں کی جان ہے واللہ تیری محفل میں
چلے عبث ہیں گلستاں میں دل کو بہلانے

کہیں بھی ہم ہوں، مگر فیض ہے یہ ساقی کا
ہمارے پاس پہنچتے ہیں اڑ کے پیمانے

نہ جس کے دل پہ لگی چوٹ ہو محبت کی
وہ بدنصیب، بھلا کیفِ درد کیا جانے

کمال یہ ہے کہ آواز تک نہیں آتی
وفورِ شوق میں یوں جل رہے ہیں پروانے

کریں گے خاک وہ رندی، سمجھ چکا ہوں میں
جو ایک گھونٹ ہی پی کر لگے ہیں اترانے

قبول کرلیں تو سمجھیں کہ ہم بھی مخلص ہیں
کئے ہیں پیش، دل و جاں کے ہم نے نذرانے

نثار جانِ حزیں کر دے شوق سے احمدؔ
کھڑا ہے کون ذرا دیکھ تیرے سرہانے

ذبح عظیم

ڈاکٹر آزاد بستوی ← استاذ جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ

فضلِ رحماں دیکھئے، الطافِ یزداں دیکھئے
اہتمام و التزام عیدِ قرباں دیکھئے

مژدۂ "ذبح عظیم" آیا خلیل اللہ کو
خواب میں بیداری کا عالم نمایاں دیکھئے

مرحبا صد مرحبا وہ جذبۂ حب خدا
جاں نثاری کا ذرا جوش فراواں دیکھئے

حب دنیا کیا، محبت دور تھی اولاد کی
پاس حکم خالق ہر جنّ و انساں دیکھئے

بند آنکھیں، لب پہ شکرِ حق، جبیں محوِ سجود
دیکھئے ارمان ذبیح اللہ کا، ہاں دیکھئے

بالیقیں اس سے رضائے ایزدی مقصود تھی
انتہائے بندگیٔ امر یزداں دیکھئے

ہو چکا جب ختم تسلیم و رضا کا امتحاں
کامیاب امتحاں پر حق کا احساں دیکھئے

لے لیا آغوش میں رحمت نے اسماعیل کو
امتحاں کی ہو گئی یوں شکل آساں دیکھئے

کھولئے آزاد بس چشم حقیقت کھولئے
دیکھئے پھر احترام عیدِ قرباں دیکھئے

الرّشاد کی ڈاک

محترمی حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب دامت برکاتہم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ
آپ کا مرسلہ رسالہ اور خط ملے۔ اس زحمت کے لئے ممنون ومشکور ہوں۔ اس میں آپ کا مضمون ہے جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں بھی تحریر فرمایا ہے۔
مجھے معلوم ہوا تھا غالباً سعودیہ میں علماء کی کوئی کانفرنس ہوئی تھی اور اس میں بالاتفاق یہ یہ مسئلہ طے کیا گیا کہ طلاق ثلث ثلث ہی رہے گی۔ اس کی پوری تفصیل کس رسالہ کے حوالے سے آپ نے الرشاد میں نقل فرمائی ہے۔ اصل میں اسی کی مجھے تلاش تھی۔
امارت سے متعلق معارف شیخ سے کچھ اقتباس ارسال کر رہا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو کچھ اس میں سے الرشاد میں شائع فرمائیں۔ عام طور پر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے اور معلوم ہوا سہارن پور کتب خانہ نے اس کو بینڈ کر دیا ہے۔
امارت کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اب تنظیمی فرمانے لگے ہیں اور ان کے اس بیان کے بعد عام طور پر اہل علم حضرات بھی مطمئن ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں حالانکہ ۱۳۶۴ھ میں سہارن پور جمعیۃ علماء کی طرف سے امارت وامیر کے انتخاب کے لئے جو دعوت نامہ جاری ہوا تھا وہ بھی تنظیمی امیر کے لئے ہی تھا اور اس انتخاب کو بھی حضرت شیخ نے غلط بتلایا، نہ صرف شیخ نے بلکہ اس وقت کے جبال علم وفضل علماء کا گویا یہ متفقہ فیصلہ تھا۔ شرعی الفاظ میں شرعی اصطلاحات واجب الرعایت ہوتی ہیں۔
بعض لوگوں کا معاملہ عجیب وغریب دیکھنے میں آیا۔ نجی گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ میں بھی اس سے متفق نہیں، مگر جب جلسوں میں مولانا اسعد صاحب کی موجودگی میں تقریریں فرمائیں تو اس میں چیلنج

"فرمایا کہ امارت کے مسئلہ پر جس کو اشکال ہو مجھ سے تشفی کرے۔ غضب پر غضب یہ کہ امارت کے انتخاب اور ۲۰ نومبر کی کارروائی کی تقویت کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کے انتخاب سے استدلال فرمایا۔

جمعیۃ علماء کے خبرنامے (مورخہ ۱۵ اپریل) میں آپ کے مضمون کا بڑا دلچسپ اور مضحکہ خیز جواب آیا ہے۔ پڑھ کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ ہو جائے۔

اصل بات یہ ہے اس وقت علماء کے طبقہ میں بھی یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اقتدار و جاہ کے لئے ان کو ہر وہ کام کرنا ہے جو ان کے اغراض و مقاصد کو پورا کرتا ہو اور کرنا بھی جائز کر کے ہی ہے لاکھ کوئی جھک مارے مگر ان پیر نما علماء کی اصلاح بڑی مشکل ہے۔ اب مظاہر علوم کا ڈرامہ آپ شاید اخبارات میں پڑھتے ہوں۔ بات یہ ہے اصلاح ہوتی ہے طالب اصلاح کی، مگر یہ علماء تو مصلح ہیں۔ وہ اصلاح سے اپنے کو بالاتر خیال فرما کر ہی کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ پھر اصلاح کا سوال ہی کیا۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ والسلام

مولانا معاذ الاسلام

محلہ دیپا سرائے، سنبھل، ضلع مرادآباد

مکرمی و محترمی جناب مجیب اللہ صاحب ندوی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

امید کہ بفضلہٖ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ جناب کے مؤقر رسالہ "الرشاد" میں امارت شرعیہ کے قیام کے سلسلہ میں مراسلات بھی شائع ہوئے ہیں اور اداریہ بھی سپرد قلم کیا گیا ہے، لیکن ان میں جمعیۃ علمائے ہند کے غلط اقدام کی مذمت کی گئی ہے جو بڑی حد تک بجا ہے۔ مگر نفس امارت سے متعلق نہ کوئی بات کہی گئی اور نہ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت پر کوئی روشنی ڈالی گئی۔

مسئلہ فقہی ہے۔ علماء کے مابین اب تک مختلف فیہ ہے، تصفیہ طلب ہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے مولانا مدنی صاحب نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی اس نے تاہنوز اپنی رپورٹ پیش نہیں کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے لیکن موصوف نے آج تک اس مسئلہ پر کمیٹی کی یا خود اپنی قطعی رائے کا اعلان نہیں کیا۔ اگر اظہار کیا ہوتا تو مفتی عبدالقدوس صاحب

رومی اکبرآبادی بمبئی سیشن مسلم پرسنل لا بورڈ ۸۶ء میں امارت ملیہ کے قیام پر میری تحریک کی مخالفت نہ کرتے۔ ان سے وجہ پوچھی گئی تو وہ جمعیت کے اجلاس کی ۴۵ء والی روداد پیش کرنے لگے جسمیں امارت شرعیہ کے قیام پر علمائے سہارنپور نے اختلاف کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ جس امارت شرعیہ کے قیام کے مسلمان ۴۵ء میں مجاز نہیں تھے اس مختلف فیہ مسئلہ کا تصفیہ ہونے کے قبل ۸۶ء میں مسلمان اسی ادارہ کے قیام کے کیسے مجاز ہوگئے اور وہ بھی جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے، اور پھر یہ کہ ۴۵ء والی کمیٹی کے ایک رکن نے تصفیہ کا قطعی اعلان کئے بنا اس ادارہ کی صدارت کو قبول کیسے کیا؟ کیا مولانا موصوف کا استقبال اور جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے سابق میں اس مختلف فیہ ادارہ کے قیام کو ہم تصفیہ شدہ اور مفتی بہ سمجھ کر قبول کرلیں؟ یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات اس وقت ابھرے جب میں آپ کے مؤقر رسالہ میں اس موضوع سے متعلق تحریرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سب سے بڑا تکلیف دہ امر یہ ہے کہ چھیالیس سال سے ایک اہم مسئلہ تشنۂ تصفیہ ہے۔ ڈاکٹر سید معین الدین قادری۔ حیدرآباد

نوٹ: گویا ہمارے اکابر ترک واجب کے گنہگار ٹھہرے اور یہ اضاغر اس کو ادا کر رہے ہیں۔ غور کیجئے! انتخاب امیر کو واجب کہنے میں بات کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہے۔ (مرتب)

مخدومی ومکرمی زید مجدکم ودامت فیوضکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بفضلہ تعالیٰ بہ عافیت ہوں۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ۸۶ء کے جولائی یا اگست میں ایک خط لکھا تھا جس میں خدمت میں حاضری کے ارادہ کا ذکر تھا، مگر پھر کچھ مصروفیت اور کچھ دیگر نامساعد حالات کے باعث حاضر نہ ہوسکا۔ تقریباً دس ماہ کے بعد ان سطور کو ذریعہ بناتے ہوئے حاضری کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے ارادہ تو اس وقت بھی ہے کہ اس سال کی تعطیلات میں عائلہ کے ساتھ ایک سفر لکھنؤ، رام پور وغیرہ کا کروں گا اور اسی مناسبت سے اعظم گڑھ بھی حاضری دوں گا، مگر ابھی سے کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔ اسی وجہ سے سوچا کہ بغیر اس وقت کا انتظار کئے مادر علمی کے حق میں سے جو ممکن ہو رہا ہے ابھی ادا کردوں۔ بعد میں جیسا ہوگا دیکھا

جائے گا۔ چنانچہ بمد زکوٰۃ ایک ہزار روپئے کا ڈرافٹ ملفوف ہے۔ رسید وغیرہ کی تو چنداں ضرورت نہیں ہے مگر اس بہانہ آپ کا شفقت نامہ موصول ہو جائے گا۔ یہیں دُبئی کے پتے پر ہو سکے تو بھیجیں۔

ابھی ہفتہ عشرہ پہلے نعیم صاحب سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی تھی، وہ کبھی کبھی یہاں آتے رہتے ہیں مگر بہت کم ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔ تو اس اتفاقیہ ملاقات کے موقع سے انھوں نے بتایا کہ جامعہ کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لئے احمد کمال صاحب وہاں آ گئے ہیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی۔ خدا کرے ان کی ذات سے جامعہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ پہلے بھی ایک آدھ بار نعیم صاحب سے تذکرہ ہوا تھا اور اس بار بھی بات نکلی کہ آپ کا ایک سفر امارات کا ہونا چاہئے۔ سعودیہ، کویت اور امارات تینوں جگہ کے لئے ایک ساتھ پروگرام بنتا تو اچھا تھا۔ بہت پہلے ایک بار ایسا سنا بھی تھا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہوتی۔

میرے حالات حسب معمول ایک خاص لائن کے مطابق چل رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ رات دن کا آنا، شام وسحر کا جانا۔ اسکول کی حاضری اور پھر گھر کی بے کاری یا دُبئی کی کوچہ گردی۔ پڑھنے لکھنے کا کوئی ماحول نہیں پھر بھی اپنے آپ کو مشغول رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ارادہ تھا کہ دو چار سال یہاں رہ کر واپس چلا جاؤں گا مگر چھ سال گزر گئے اور یہ تو ایک عجیب تماشا ہے کہ آدمی ایک ضرورت پوری کرتا ہے تو دوسری ضرورت آ کھڑی ہوتی ہے۔ انسان کی خواہش اور ضروریات کی کوئی حد نہیں ہے۔ چھ سال یہاں گزارنے کے بعد بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ چند سال اور گزار کر ہی واپس جاؤں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہاں رہ کر آدمی کچھ پیسے تو ضرور کما لیتا ہے مگر اتنے دنوں تک اپنی زندگی برباد ہی کرتا ہے۔ زندگی میں کوئی کشش اور لطف نہیں رہ جاتا ہے۔

گزشتہ سال تک عامر کے سعودیہ میں قیام کا علم ہے۔ اب تک وہیں ہیں یا واپس آ چکے ہیں۔ عماد سلمہٗ کے کیا حالات ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ امید کہ چچی جان بہ صحت ہوں گی ان کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام

خادم حبیب اللہ ندوی۔ دُبئی

نئی کتابیں

انعکاس | کبیر احمد جائسی، تقطیع $\frac{18}{22}$ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۶، قیمت -/۶۰،
ناشر کبیر احمد جائسی، غازی پور ہاؤس، سرسید نگر علی گڑھ۔

انعکاس: کبیر احمد جائسی لکچرر شعبہ مطالعات اسلامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو وہ مختلف اوقات میں لکھتے رہے ہیں۔ اس میں آٹھ مقالات ہیں پہلا مقالہ مجیر بیلقانی پر ہے جو خاقانی جیسے استاذ سخن کا شاگرد ہے۔ اس نے زیادہ تر ایک صنف سخن قصیدہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ مقالہ نگار نے اس کے سبھی ممدوحین کے ناموں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جس سے تاریخی واقعات کے بعض نئے گوشے سامنے آئے ہیں مگر مقالہ نگار کو اس کے کلام کی خصوصیات اور شاعرانہ محاسن و معائب پر کچھ روشنی ضرور ڈالنی چاہئے تھی۔ اس کے کلام کے جو نمونے مقالہ نگار نے نقل کئے ہیں ان میں قصیدہ عید الفطر کے علاوہ بہت کم اشعار میں برجستگی نظر آتی ہے۔

دوسرا مضمون "علی شریعتی اور اقبال" ہے جس میں مقالہ نگار نے دکھایا ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری، جو ان کی اردو شاعری سے زیادہ اہمیت اور معنویت رکھتی ہے اور جس کی طرف ابتداءً اہل ایران اور فارسی بولنے والے دوسرے حلقوں کے اہل علم نے کوئی زیادہ اعتنا نہیں کیا مگر آہستہ آہستہ پھر ان کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ علی شریعتی نے اس کو اپنا خاص موضوع بنایا اور ان پر بہت کچھ لکھا ہے البتہ ان کی "علی گونہ" کی اصطلاح ذوق سلیم کو زیادہ اچھی نہیں لگتی اور ان کا نام دینی احساس پر بار سا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بھی کہنا مشکل ہے کہ اقبال کی انھوں نے جو تصویر پیش کی ہے وہ صحیح ہے، لیکن بہرحال مقالہ نگار نے ان کے خیالات کو بڑے سلیقہ سے پیش کر دیا ہے۔

تیسرا مضمون "حافظ کی شاعری پر ایک نئی نظر" ہے۔ کتاب کا یہ مضمون راقم الحروف کے نزدیک اس

مجموعہ کا ایک اہم اور قیمتی مضمون ہے۔ حافظ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کی صہبا گساری اور خُم و خُم خانہ کی زندگی کو صوفیا نے "المجاز قنطرۃ الحقیقہ" قرار دیا اور ان کی شاعری اسی نقطۂ نظر سے پڑھی پڑھائی گئی۔ علامہ شبلی نے ان کی شاعری اور غزل گوئی کو الہامی اور انھیں ناخدائے سخن قرار دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم نے خواجہ میر درد کے دیوان کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ یہ شعر پڑھو ؎

دوستو اب لگ رہا ہے چل چلاؤ　　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تمہیں حافظ کے سینکڑوں شعر یاد آجائینگے، یعنی ان کے نزدیک بھی حافظ کی شاعری مجاز کے پردہ میں حقیقت منتظر کی غماز ہے۔ مگر حافظ کے بارے میں اس "طلسم ہوش ربا" کو سب سے پہلے اقبال نے اپنے مرتبہ کے رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے توڑنے کی کوشش کی مگر احمد کسروی نے تو اسے بالکل پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن احمد کسروی کی اس رائے سے تو کوئی صاحب ذوق اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان کی شاعری صرف قافیہ بندی اور تکلفات سے پُر ہے۔ اگر حافظ کے کلام کو "جزویست از پیمبری" کہنا مبالغہ سے خالی نہیں تو ان کو قاآنی وغیرہ کی صف میں کھڑا کرنا بھی بڑی ناانصافی ہے۔ جس طرح خیام کی بادہ نوشی کی بنا پر مستشرقین نے اس سے اعتنا کیا اسی طرح حافظ کی صہبا گساری سے بھی انھوں نے غیر معمولی اعتنا اسلئے کیا کہ اس سے اباحیت پسندی کو شہ ملتی ہے۔ غالباً احمد کسروی کے ذہن پر یہی چیز غالب رہی ہے جسکی وجہ سے انھوں نے ان کے خلاف اتنا سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔

چوتھا مضمون سعید نفیسی کے اجتہادات پر ہے۔ یہ اس مجموعہ کا سب سے زیادہ فکر انگیز مضمون ہے۔ ابتدا میں مقالہ نگار نے سعید کی ذاتی اور علمی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔ آگے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ایران کے مختلف حصوں میں کئی صدی تک ایرانیوں کی جو تحریکیں اٹھتی رہیں ان سب کا رخ عربوں ہی کی طرف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تھا۔ سعید نفیسی پہلے شیعہ عالم ہیں جنہوں نے واشگاف طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> دوسروں (عربوں) کی قید سے رہائی کیلئے مذہبی تحریکوں کو سب سے بڑی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ دوسری صدی کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک جبکہ ایرانی سلاطین کے مختلف سلسلوں کی ایران کے مختلف حصوں میں تاسیس ہوئی اور انھوں نے بیگانوں کی قوت و طاقت کو اکھاڑ پھینکا۔ ایران کے متعدد حصوں میں مختلف قسم کے مذاہب

ایرانیوں کے ہاتھوں عالم وجود میں آئے۔ ان مذاہب میں سے بعض ایسے تھے جن کی بنیاد
افتراق بین المسلمین اور ایرانیوں اور دیگر تمام دوسرے مسلمانوں کے درمیان اختلاف پر تھی
تاکہ اس طرح ایران بیگانوں کے اقتدار سے نجات پائے۔ اس زمانے کی اصطلاح میں جو لوگ شعوبیہ
کہلاتے تھے وہ ایرانیوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھے۔ کبھی کبھی یہ مذاہب قدیم زرتشتی عقیدوں کی
طرف مراجعت کرتے اور قدیم ایران کی احیاء کے لئے تحریکیں چلاتے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو
سال کے عرصہ میں جو تحریکیں سامنے آئیں ان میں سے دوسری صدی کی ابتداء میں ابو مسلم
خراسانی اور بہافرید کی تحریکیں خراسان میں غالیان اور سنباد کا ظہور، ترمذ میں جہم
بن صفوان، ماوراءالنہر میں اسحٰق ترک، عراق میں روندیہ ہرات میں بادغیس اور
سیستان میں اسب ذوبتی جماعت اور استاذسیس کا ظہور۔ ۱۵۹ھ میں ماوراءالنہر میں
مقنع اور سفید جامگان کی تحریک، ۲۰۱ھ میں بابک خرم دین اور اسکے ساتھیوں کا ظہور
جو سرخ علم کے نام سے موسوم تھے، اس کے پیرووں میں مازیار اور افشین خاص طور سے
قابل ذکر ہیں۔ تیسری صدی کے اوائل میں خراسان میں عبداللہ بن کرام کا ظہور اور مذہب
کرامیہ کی تاسیس، ۲۵۵ھ میں بحرین اور خورستان میں قرمطیوں کی تحریک اور اسی زمانہ
میں اسی علاقہ میں اصحاب الزنج کا ظہور، ۲۵۱ھ میں اسی علاقے میں طبرستان کے تمام
لوگوں کا زیدی ہو جانا، حسین بن منصور حلاج کے ذریعہ تیسری صدی کے اواخر میں صوفیا کے ایک
فرقے کے کام کی ابتداء اور اسی طرح کی دوسری اور تحریکیں اس لئے چلائی گئیں کہ ایرانیوں
نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ لوگ عربوں کی حکومت کے زور و قوت سے خود کو نجات
دلائیں۔ اسی وجہ سے تقریباً تین صدیوں تک مفتوح ایرانیوں اور فاتح عربوں کے درمیان
پورے ایران میں ایک مسلسل کشمکش و کشاکش جاری رہی۔

سعید نفیسی کے علمی کاموں میں ان کے ذاتی مذہبی عقیدے کا کوئی ادنیٰ سا بھی دخل دکھائی نہیں دیتا
انھوں نے اپنی کسی بھی کتاب میں اس بات کی وکالت نہیں کی ہے کہ ایرانیوں کا مذہب بعینہ وہی ہے جس پر
شیعہ ائمہ عمل کرتے رہے ہیں۔ ایک مؤرخ کی حیثیت سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایران کی شیعیت خالص
ایرانی افکار و نظریات کی حامل ہے اور اس کی ترویج و اشاعت میں صرف ایرانیوں کا حصہ رہا ہے، خواہ وہ

دوسرے ملکوں ہی میں کیوں نہ بس گئے ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی اس رائے پر مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایرانی شیعیت، زردشتیت کی اسلامی شکل کا نام ہے اور اس کی ترویج و اشاعت ایرانیوں نے صرف اس نقطۂ نظر سے کی تھی کہ اس طرح وہ اپنے قدیم آبائی مذہب کی اصل روح کو برقرار رکھ سکیں۔ سعید نفیسی نے ایرانیوں کے تعصب پر بھی مطلق پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ وہ ایک مجتہد مورخ کی حیثیت سے ایرانیوں کے تعصب کو بھی واشگاف الفاظ میں بے نقاب کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کا درج ذیل اقتباس ان کی اسی روش کی عکاسی کرتا ہے:

دوسری طرف فتنہ و فساد کا وہ بیج جو اسمٰعیلیہ نے بویا اور عربوں اور ترکوں کے خلاف جو شدید تعصب وہ رکھتے تھے اس نے عام لوگوں سے سکون اور اطمینان چھین لیا تھا۔ ہر وہ شخص جو اُن کے ساتھ نہ ہوتا وہ فنا کے خطرات سے دوچار رہتا۔ اسی وجہ سے وہ امن و سکون جو ادبیات کیلئے ضروری ہے ایران کے بہت سے علاقوں میں وجود نہ رکھتا تھا۔ اسمٰعیلیوں کے فتنہ کے علاوہ ایران میں بالخصوص اسکے مرکزی علاقوں میں شافعیوں اور حنفیوں کی جنگیں اور کبھی کبھی شیعوں اور سنّیوں کے اختلافات بھی ظاہر ہوتے (جسکے نتیجے میں) خونیں جنگیں بھی ہوتیں اور دونوں فرقوں کا آرام و سکون غارت ہوا۔ نتیجہ کے طور پر اسی فتنہ و فساد، روحانی کمزوریوں اور اختلافات نے ساتویں صدی کے شروع میں منگولوں کو ایران میں قدم جمانے کا موقع دیا اور جو کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا وہ سب کچھ ہوا۔

پانچواں مضمون پروفیسر ہادی حسن مرحوم کی علمی خدمات پر ہے۔ افسوس ہے کہ اب مسلم یونیورسٹی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ اسٹاف کی اکثریت بھی ان کی علمی خدمات سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے۔ چھٹا مضمون اقبال کی رمزیت پر ہے اور ساتواں مضمون محمد شاہی عہد کی ایک غیر مطبوعہ نادر فارسی مثنوی پر ہے۔

یہ تمام مضامین علمی و تحقیقی اعتبار سے اس قابل ہیں کہ ان کا بار بار مطالعہ کیا جائے اس سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوگا بلکہ نوجوان اہل علم کو تلاش و تحقیق کا سلیقہ بھی آئیگا۔

ترقی پسند تحریک نے اردو زبان کو اس کی مشرقی خصوصیات سے دور کر کے کمیونزم کی ملحدانہ رمزیت و اشاریت اور مغرب کی بوجھل اصطلاحات سے جس طرح مجروح کر ڈالا ہے کہ اسکی اصلی صورت پہچاننی مشکل ہو گئی ہے مگر کبیر احمد جائسی نے نہ صرف علم و تحقیق میں ترقی پسندوں کی سطحیت کو پیچھے چھوڑ دیا ہے بلکہ طرز بیان میں بھی حالی و شبلی کی پیروی کی کوشش کی ہے جو ہر طرح لائق تحسین ہے۔ امید ہے کہ ان کی یہ کوشش اہل علم کے یہاں قابل قبول ہوگی۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے مگر قیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی اے میں اور فضیلت پاس کرنیکے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے، کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے

اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں:

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ و قرآت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت و جلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیۃ جس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دو درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ

تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے

ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درس گاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہیئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہو جاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ شوال سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے اور ۳۰ شوال تک ختم ہو جاتا ہے۔

Regd. No. Azm./N.P. 42/84
Regd. No. R.N. 34937/81
Phone

MONTHLY J... TUR RASHAD
AZAMGARH ... (U.P.) INDIA

دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ - یوپی

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 30/-
خصوصی معاون 100/-
قیمت فی پرچہ 3/-

جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
پندرہ ڈالر امریکی
$ 15/-

جلد نمبر ۱۵ | ستمبر ۱۹۸۷ء مطابق محرم ۱۴۰۸ھ | شمارہ ۷۴

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ندوی

کاتب
رفیق احمد۔ شاہ پور۔ کندھرا پور۔ اعظم گڈھ

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے الفضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

رشحات

حرم پاک میں ایرانیوں کا ہنگامہ

اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ساری دنیا میں یہ خبر گشت کر چکی ہے کہ ایرانیوں نے حج کے مبارک موقع پر جو ہنگامہ کیا، اس میں چار سو آدمی مارے گئے جس میں اسّی پچاسی سعودی سپاہی اور عوام بھی شامل ہیں۔
ارضِ مقدس کے اس ہنگامہ پر دنیا کی اکثر مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کے ذمہ داروں نے ایران کی مذمت کی اور حرم پاک کو مجروح کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ ہمارے ملک کے اندر اور ملک کے باہر کا ایک مختصر سا طبقہ اس کو سعودی حکومت کا ظلم قرار دے رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں کھٹمل اور مچھر مارنے تک کی ممانعت ہے وہاں اتنے انسانوں کا خون بہانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، لیکن جو لوگ اس ہنگامہ کے پس منظر اور پیش منظر سے واقف ہیں وہ سو فیصد خمینی صاحب کی ایرانی شیعی حکومت اور ان کے جذباتی عوام کو ذمہ دار قرار دینے پر مجبور ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انھیں قتل نہیں کیا گیا بلکہ انھوں نے خودکشی ہے۔

سعودی حکومت کا مخالف سے مخالف آدمی بھی یہ کہنے پر مجبور رہے کہ آل سعود نے جب سے حکومت سنبھالی ہے اس وقت سے اب تک فریضۂ حج کی ادائیگی میں روز بروز ہر طرح کی سہولت بڑھتی جا رہی ہے اور حاجیوں کی عزت وآبرو اور جان ومال اس سے زیادہ محفوظ ہے جتنی کہ ان کے اپنے ملک کے اندر ہے۔ بیس لاکھ حاجیوں میں ایک شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے کھانے پانی کی، روشنی کی، پیشاب پاخانے اور وضو کرنے، نہانے یا جانے آنے کی کوئی زحمت پیش آئی ہو۔ وہاں کے گرم موسم میں ٹھنڈا پانی سب سے بڑی نعمت ہے، ہر طرف اس کی فراوانی تھی۔
حج اسلام کا بنیادی رکن اور اعلیٰ درجہ کی فرض عبادت ہے جس کی ادائیگی کے لئے ہزاروں روپے خرچ کرکے دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان مکہ مکرمہ آتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے یا ہونی چاہئے کہ اس

بلدِ امین (پُر امن شہر) میں پہنچ کر یکسوئی کے ساتھ اس فرض کو ادا کریں۔ اور پھر عافیت کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس ہو جائیں۔

ایران میں جب سے شیعی انقلاب آیا ہے برابر ان کے ذمہ دار سعودی حکومت کے خلاف بیانات دیتے رہتے ہیں اور حج کے پر امن ماحول کو مظاہرہ کر کے برباد کرتے رہے ہیں۔ اس سال انھوں نے سعودی حکومت کی اس ہدایت کے باوجود کہ ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ حاجی یہاں نہ آئیں ورنہ انتظامات میں دقت ہو گی، انھوں نے ایک لاکھ ستاون ہزار حاجی بھیج دیئے جس میں تیس ہزار ریٹائرڈ فوجی بھی شامل تھے۔ سعودی حکومت ان کی ہنگامہ پسند طبیعت کے پیش نظر ہمیشہ نرم پالیسی اختیار کرتی رہی۔ اور اس نرم پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو ہر سال مظاہرہ کرنے کی اجازت مل جاتی تھی مگر اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اس سال مظاہرہ اور نعرہ بازی ہی نہیں کی بلکہ ہنگامہ کی صورت پیدا کر دی۔ اتری جانب سے آنے والے مسجد حرام کے سارے راستے جام کر دیئے اس وجہ سے بعض حاجیوں سے ان کی تو میں میں اور ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ خود راقم الحروف مغرب سے پون گھنٹہ پہلے اپنے لڑکے کی گاڑی سے حرم جا رہا تھا۔ اس نے راستہ صاف کرنے کے لئے ہارن دیا تو ہارن دینا ان کو اتنا ناگوار ہوا کہ اس پر کئی ایرانی لپک پڑے اور گاڑی پر چھڑی سے مارنے لگے مگر عین وقت پر ایک سپاہی نے گاڑی کو واپس کر کے دوسرے راستہ سے جانے کا اشارہ دیا۔

پولیس آخر وقت تک صبر و تحمل سے کام لیتی رہی اور مجمع کو حرم کی طرف بڑھنے سے روکتی رہی مگر ان کا تشدد یہاں تک بڑھا کہ دو سپاہیوں کی رائفل چھین کر ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور ان کی ایک اسکوٹر اور جیپ میں آگ لگا دی اور پولیس پر پتھراؤ کیا اور چاقوؤں سے حملہ کر دیا جس سے موجودہ پولیس پیچھے ہٹ گئی اور اس صورت حال کو دیکھ کر ذمہ داروں کو مزید فورس بھیجنی پڑی اور پھر انھوں نے ان پر لاٹھی چارج کیا، آنسو گیس چھوڑی، ممکن ہے کہ کچھ فائرنگ بھی ہوئی ہو۔ اس کے بعد مجمع میں بھگدڑ مچ گئی اور پھر اس بھگدڑ میں کتنے مرد اور کتنی عورتیں زخمی ہوئیں اور کتنے مرد اور کتنی عورتیں مریں اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حکومت کے بیان کے مطابق چار سو آدمی مرے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس سال کا یہ مظاہرہ سادہ طریقہ کا مظاہرہ تھا تو اس سے پہلے ان کے مظاہرہ پر نہ کبھی لاٹھی چارج ہوا اور نہ اس سے پہلے کوئی ایرانی یا سعودی سپاہی زخمی ہوا۔ تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس سال ان کے مظاہرہ میں کوئی ایسی ہنگامہ خیز تشدد کی صورت

ضروری تھی جس کی بنا پر مجبوراً پولیس کو ہنگامہ رفع کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کرنی پڑی اور اگر یہ پر تشدد ہنگامہ نہیں تھا تو پھر بچاسی سعودی سپاہی کیسے مارے گئے؟

یہ کہنا کہ یہاں کھٹی مچھر کا مارنا منع ہے تو احرام میں یقیناً یہ چیز ممنوع ہے لیکن اگر اسی حالت میں سانپ یا بچھو نکل آئے اور ان کے ڈس لینے کا شبہ ہو تو پھر ان کا مارنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ قتل بہت بری چیز ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ بری چیز ہے۔ قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ فتنہ قتل سے زیادہ سخت جرم ہے الفتنة اشد من القتل۔ پھر قرآن پاک نے حج کے ایام میں رفث، فسوق اور جدال سے منع کیا ہے۔ انھوں نے حرم میں فسق و جدال کا پورا ماحول بنا دیا تھا۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر ہر ملک کے لوگ اپنے اختلافی مسائل کو لے کر وہاں مظاہرہ کرنے لگیں تو ایام حج کی ساری حرمت سیاسی ہنگامہ آرائی کی نذر ہو کر رہ جائے گی اور وہاں کا پر امن ماحول برباد ہو کر رہ جائے گا۔ اگر کوئی اس کو ضروری سمجھتا ہے تو حرمین شریفین کے حدود کے باہر مظاہرہ کرے، کانفرنس کرے اور جو بات کہنی ہو کہے پھر اس وقت ذرائع ابلاغ اتنے وسیع ہو گئے ہیں کہ حرم پاک میں اس طرح کے مظاہرے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اپنی بات کو دنیا تک دوسرے ذرائع ابلاغ سے آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایرانیوں کا یہ اقدام کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کو اس کی مذمت کرنی چاہئے۔ اور سعودی حکومت کسی مصلحت کی وجہ سے اگر ان پہ پابندی عائد نہیں کر سکتی تو ان کی تعداد کو سختی سے محدود کر دینا انتہائی ضروری ہے اور آئندہ حج کے موقع پر کسی طرح کے جلسہ و جلوس اور مظاہرہ کی اجازت نہیں دینی چاہئے علامہ خمینی صاحب شیعی اسلام کے نام پہ اپنے عوام کو گمراہ کر رہے ہیں مگر ان کو یہ فکر نہیں ہے کہ ان کے ان اقدامات سے دنیا میں اسلام کی اور مسلمانوں کی کتنی بدنامی بلکہ جگ ہنسائی ہو رہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حج سے ایک ماہ پہلے شیعوں نے سنیوں کے ایک طبقہ کو ملا کر لکھنؤ میں ایک حج کانفرنس اپنے ادارہ سلطان المدارس میں کی تھی جس میں سعود حکومت کو ہر طرح کی گالی دی گئی تو دایرانی قونصل نے پریس کانفرنس میں کہا کہ سعود حکومت کو ہم غاصب سمجھتے ہیں اور اس کو

مقامات مقدسہ کی خدمت کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہم یہ کانفرنس ان کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

اب آپ اس پس منظر اور پیش منظر میں حرم پاک کے ہنگامہ پر غور کریں گے تو پورا اندازہ ہو جائے گا کہ خمینی صاحب کی حکومت کے عزائم کیا ہیں؟ اور وہ امن کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں یا بدامنی پیدا کرنا ان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

انشاء اللہ آئندہ ہم فریضۂ حج کی ادائیگی کی دوبارہ سعادت اور سعودی حکومت کی حیثیت اور اس کے اختلافات کے سلسلہ میں اپنے کچھ تاثرات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہندوستان کے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مسائل کے سلسلہ میں سعودی حکومت ہمیشہ خاموشی اختیار کرتی ہے اور ایران آواز اٹھاتا ہے۔ انشاء اللہ ہم اخبارات کے تراشوں اور حوالوں سے بتائیں گے کہ اریٹیریا، فلپائن، افغانستان اور ہندوستان کے فسادات وغیرہ کے سلسلہ میں سعودی حکومت اور عوام کا کیا طرز عمل ہوتا ہے۔

بقیہ: وفیات

بازی گری سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا رفاہی کام ہوا ہو جس میں ان کا حصہ نہ رہا ہو اللہ سے دعا ہے کہ ان کی ان نیکیوں کے بدلے ان کی مغفرت فرمائے۔ انشاء اللہ مدرسہ پر ان کے نام کی بھی ایک تختی لگا دی جائے گی تاکہ آنے والی نسل ان کو یاد رکھے اور ان کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔

قسط ۴

احکام ستر و حجاب

مولانا عبدالرحمن کیلانی ۔ لاہور

احکام حجاب کی رخصت کس کس سے

ا۔ محرم رشتہ داروں سے قرآن کریم میں بارہ قسم کے لوگوں یا رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے جن سے حجاب کی ضرورت نہیں البتہ ستر کے احکام بدستور برقرار رہیں گے۔ بالفاظ دیگر ان مذکورہ بارہ قسم کے لوگوں یا رشتہ داروں کے سامنے عورتیں اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ ابتدائی اقسام ایسے رشتہ دار ہیں جو ابدی طور پر محرم ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) خاوند (۲) باپ (۳) سسر (۴) حقیقی بیٹے (۵) سوتیلے بیٹے (۶) بھائی (۷) بھتیجے اور (۸) بھانجے

پھر اس فہرست میں وہ رشتہ دار بھی شامل ہو جاتے ہیں جو رضاعت کی بنا پر حرام ہوں مثلاً رضاعی باپ، رضاعی بھائی یا رضاعی بیٹے وغیرہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۲۳ سے ہی استشہاد کر کے نسب اور رضاعت کو ایک ہی سطح پر رکھ کر فرمایا کہ:

"جو رشتے نسب کے لحاظ سے حرام ہیں وہی رشتے رضاعت کے لحاظ سے بھی حرام ہیں"۔ [۱]

محرم رشتہ داروں کی مزید تفصیل آخری باب میں بیان ہو گی۔

ب۔ ملک یمین سے رخصت عورتوں کا ذکر ہوا تو یہ وضاحت کر دی گئی کہ عورتوں کو اپنی لونڈیوں سے اپنی زینت کے اظہار کی رخصت ہے۔

ج۔ خدام سے رخصت کی شرائط تابعین سے مراد مطیع و منقاد، نوکر چاکر اور شاگرد

---

[۱] بخاری۔ کتاب الشہادات۔ باب الشہادات علی الانساب والرضاع۔ (مسلم۔ کتاب الرضاع۔ پہلی حدیث)

قسم کے لوگ ہیں لیکن ان سے رخصت صرف اسی صورت میں ہے کہ انھیں "ہمبستری کی خواہش نہ ہو"۔ یہ عدم خواہش بچپن کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے بھی، بیماری یا نامردی کی وجہ سے بھی اور مالک کی عزت اور وقار کی وجہ سے بھی۔ یعنی یہ خدام ایسی بات کا تصوّر تک بھی نہ کر سکتے ہوں اور اگر یہ خطرہ ہو کہ ایسے لوگوں کے شہوانی جذبات بھی کسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں تو پھر ان سے یہ رخصت ختم ہو جاتی ہے ان پر حجاب کے احکام لاگو ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے اظہار زینت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لہذا اپنے ڈرائیور، خانسامے اور بیرے وغیرہ سے حجاب کی رخصت کی کوئی گنجائش نہیں۔

د۔ بچوں سے رخصت

بچوں اور لڑکوں سے یہ رخصت اس وقت تک ہے جب تک ان کے شہوانی جذبات بیدار نہ ہوئے ہوں یعنی اندازاً دس گیارہ سال تک کے بچوں کے سامنے تو عورت اپنی زینت کا اظہار کر سکتی ہے، بعد میں نہیں۔

عورت کا عورت سے پردہ

نویں قسم جن سے حجاب کی ضرورت نہیں یا ان کے سامنے عورت اظہار زینت کر سکتی ہے وہ "اپنی عورتیں ہیں۔" اپنی عورتوں" سے مراد آپس میں میل ملاقات رکھنے والی مسلمان عورتیں ہیں جو ایک دوسرے کو جانتی پہچانتی اور ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتی ہوں ایسی عورتوں کے سامنے اظہار زیب و زینت کیا جا سکتا ہے رہی دوسری غیر مسلم، مشتبہ اور اَن جانی عورتیں، تو ایسی عورتوں سے بھی ایسے ہی حجاب کا حکم ہے جیسے غیر مردوں سے۔ وجہ یہ ہے کہ عورتیں ہی ہوتی ہیں جو قحبہ گری کی دلالی بھی کرتی ہیں۔ نوخیز اور نادان لڑکیوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا کر غلط راستوں پر ڈالتی ہیں اور ایک گھرانہ کی بھید کی باتیں کسی دوسرے گھر میں بیان کر کے فحاشی کو پھیلانے میں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں۔ ایسی عورتوں سے سخت پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا تمام اَن جانی اور غیر عورتوں سے حجاب کا حکم دے دیا گیا۔

علاوہ ازیں ہیجڑوں (مخنث) یا زنانہ وضع قطع رکھنے والے مردوں سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاب کا حکم دیا ہے۔ دورِ نبویؐ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دفعہ آپؐ حضرت ام سلمہؓ کے ہاں تشریف فرما تھے۔ گھر میں ایک ہیجڑا تھا۔ وہ حضرت ام سلمہؓ کے بھائی عبداللہ بن ابی ربیعہ سے کہنے لگا اگر اللہ نے کل کے دن طائف فتح کرا دیا تو میں تمہیں غیلان کی بیٹی کی نشاندہی کروں گا۔ فانها تقبل باربع وتدبر بثمان (یعنی اگر سامنے آتی ہے تو چار بٹیں لے کر اور پیٹھ

موڑتی ہے تو آٹھ بٹیں لے کر) رسول اللہ ؐ نے یہ بات سن لی تو فرمایا۔ " یہ ہیجڑا آئندہ کبھی تمہارے ہاں نہ آیا کرے" [۱]

یہ مخنث یا زنانہ یا خسرہ یا ہیجڑا چونکہ عورتوں کے امور سے دلچسپی رکھتا تھا لہٰذا آپ نے اس سے مکمل طور پر حجاب کا حکم دے دیا اور داخلہ بند کر دیا۔ عورت کے عورت سے پردہ کے متعلق مزید تصریحات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔

۱۲۔ حرکات پر پابندی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں اس انداز سے زمین پر نہ ماریں کہ ان کے زیوروں کی جھنکار سنائی دینے لگے اور معلوم ہو جائے کہ اس نے کیا کچھ زیور پہن رکھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ عورت کا پاؤں زمین پر پڑنے کے ساتھ ساتھ کسی عاشق مزاج کے دل پر بھی جا پڑے۔

اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا کا مفہوم بعض علماء قرآن کریم کے الفاظ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا سے یہ مراد لیتے ہیں کہ احکام حجاب سے چہرہ اور ہاتھ مستثنیٰ ہیں۔ یعنی عورتوں کو غیر مردوں سے بھی چہرہ اور ہاتھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔

یہ توجیہ درج ذیل وجوہ کی بنا پر غلط ہے۔

۱۔ اس آیت میں احکام حجاب کی رخصتوں کا ذکر ہے نہ کہ احکام حجاب کی پابندیوں کا۔ یعنی ذکر تو یہ چل رہا ہے کہ فلاں فلاں ابدی محرم رشتہ داروں سے بھی حجاب کی ضرورت نہیں۔ اپنی عورتوں سے بھی، لونڈیوں سے بھی، خدام اور نابالغ بچوں سے بھی اظہار زینت اور حجاب کی کوئی پابندی نہیں۔ اب دیکھئے کہ اس آیت میں کہیں عام لوگوں یا غیر مردوں کا ذکر آیا ہے کہ ان سے بھی اظہار زینت کی کوئی پابندی نہیں؟ لہٰذا اگر ان حضرات کے مصداق ما ظھر منھا سے مراد چہرہ اور ہاتھ ہی لے لئے جائیں تو بھی چنداں فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس آیت میں مذکور اشخاص کے سامنے ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنے کی اجازت ہی کا تو ذکر ہے۔

۲۔ اس بات کے باوجود بھی یہ توجیہ غلط ہے کیونکہ " ما ظھر منھا " میں ھا کی ضمیر زینتھن کی طرف

---

[۱] بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب ماینھی عن الدخول

لوٹتی ہے جو قریب ہی مذکور ہے نہ کہ اعضائے بدن کی طرف جن کا یہاں ذکر ہی نہیں اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ "عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو اس زینت سے از خود ظاہر ہو جائے"۔ گویا اللہ تعالیٰ عورتوں کو تکلیف مالایطاق نہیں دینا چاہتے یعنی اگر جلباب یا بڑی چادر یا برقع کسی وقت ہوا سے اٹھ جائے یا غفلت یا کسی دوسرے اتفاق کی بنا پر عورت کا . . . . زیور یا زینت ظاہر ہو جائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ اکثر صحابؓ اور تابعین نے ماظھر منھا سے یہی مفہوم مراد لیا ہے۔

۳۔ ہم بخاری شریف کے حوالہ سے پہلے یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ سورۂ احزاب کی آیات کی رو سے مسلمان عورتوں میں چہرے کے پردہ کا رواج ہو چکا تھا اور حضرت عائشہؓ نے واقعۂ افک کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس بات کی صراحت بھی کی تھی اور خود بھی صفوان بن معطل سلمی سے چہرہ کو چھپا لیا تھا۔ اب اگر اس کے بعد میں نازل ہونے والی سورۂ نور کے اس جملے کا یہی مطلب لیا جائے جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں تو کیا کچھ ایسے شواہد یا آثار ملتے ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ بعد میں مسلمان عورتوں نے غیر مردوں سے چہرہ کے پردہ کو ختم کر ڈالا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو مذکورہ آیت کے اس جملہ کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ چہرہ اور ہاتھ پردے سے مستثنیٰ ہیں۔

۴۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ تمام تر بدن میں چہرہ ہی ایسا عضو ہے جس میں غیروں کے لئے دلکشی کا سب سے زیادہ سامان ہوتا ہے۔ پھر اگر اسے ہی پردہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے تو باقی احکام حجاب کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے؟

اختلاف کی اصل وجہ

تمام تر صحابہ کرام میں حضرت ابن عباسؓ نے پھر ان کے شاگردوں نے پھر بعض فقہائے حنفیہ نے الا ما ظھر منھا سے یہ مطلب لیا ہے کہ ہاتھ اور چہرہ حجاب سے خارج ہیں اور یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر منکرین حجاب اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرت ابن عباس کی جلالت شان وعلم اپنی جگہ پر مسلم۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ کئی اہم مسائل میں تمام امت سے الگ اپنی منفرد رائے رکھتے ہیں مثلاً پہلا تو یہی حجاب الوجہ والکفین کا مسئلہ ہے۔ جو

لہ تفہیم القرآن۔ ج ۳۔ ص ۳۸۶

آگے زیر بحث آرہا ہے۔ دوسرا مسئلہ متعہ کا ہے۔ متعہ دورِ نبوی کی جارحانہ جنگوں میں تین دفعہ (جنگ خیبر، فتح مکہ یا جنگ حنین و ہوازن اور جنگ تبوک) دورانِ جنگ مباح ہوا اور خاتمہ پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔ بالآخر حجۃ الوداع کے موقع پر ابدی طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دے دیا۔ تاہم بعض وجوہ[1] کی بنا پر متعہ کا خفیہ در خفیہ سلسلہ دورِ فاروقی تک چلتا رہا۔ متعہ کے مؤید بھی یہی حضرت ابن عباسؓ تھے۔ پھر جب حضرت عمرؓ نے اسے "عین زنا" اور قابل حد جرم قرار دیا تو اس وقت بھی حضرت ابن عباس نے متعہ کی حرمت کو دل سے تسلیم نہیں کیا بلکہ یوں فرمایا "متعہ کا جائز ہونا خدا کی طرف سے اپنے بندوں پر شفقت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر عمرؓ نے اس کی ممانعت نہ کر دی ہوتی تو کبھی کسی کو زنا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

اس روایت کے راوی بھی آپ کے شاگرد عطاء بن ابی رباح ہیں جن سے ابن جریج نے، محدث عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں درج کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے دوسرے شاگرد مثلاً سعید بن جبیر اور طاؤس بھی اس مسئلہ میں آپ کے ہمنوا تھے۔

تیسرا مسئلہ اختلاف قرأت کا ہے۔ آپ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبي[2] کے بعد ولا محدث بھی پڑھا کرتے تھے۔ چونکہ آپ کی اس قرأت کی حیثیت خبر واحد کی تھی اور قرآن کی تدوین میں خبر واحد مقبول نہیں لہذا یہ ولا محدث کے الفاظ مصحف عثمانی کی ترتیب و تدوین کے وقت شامل کتاب نہیں کئے گئے۔ تاہم مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کی راہ ہموار کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کی اسی روایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباس یدنين عليهن من جلابيبهن کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں:

نقال ابن عباس و ابو عبیدۃ،	ابن عباس اور ابو عبیدہؓ نے فرمایا: مومنوں کی
امرنسآءُ المؤمنین ان یغطین	عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ چادروں سے اپنے

---

[1] اس کی تفصیل ہم نے اپنے مضمون متعہ کی اباحت و حرمت میں بیان کر دی ہے۔
[2] الحج - ۵۲

رؤسهن ووجوههن بالجلابیب الا عینا واحدة لیعلم انهن حرائر ؎۱

سر اور چہروں کو ڈھانپ کر رکھیں، مگر ایک آنکھ کھلی رکھ سکتی ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں۔

بالکل ایسی ہی ایک دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

قال علی بن ابی طلحة عن ابن عباس رضی اللہ عنهما امر اللہ نساء المؤمنین اذا خرجن من بیوتهن فی حاجة ان یغطین وجوههن من فوق رؤسهن بالجلابیب ویبدین عینا واحدة ؎۲

علی ابن ابی طلحہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں سے کسی ضرورت کے تحت نکلیں تو چادروں سے اپنے سروں کے اوپر سے چہروں کو ڈھانپ لیں اور (صرف) ایک آنکھ ظاہر کریں۔

اب دیکھئے، جلباب کا تعلق گھر سے باہر کی دنیا سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس گھر سے باہر مکمل پردہ (یعنی چہرہ سمیت) کے قائل تھے۔ ان کے موقف میں اگر کچھ لچک ہے تو وہ گھر کے اندر کی دنیا سے ہے۔ یعنی اگر گھر کے اندر ایسے رشتہ دار آجائیں جو محرم نہیں تو ان سے چہرہ اور ہاتھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا آج کے مہذب طبقہ کے لئے حضرت ابن عباس کا یہ موقف کچھ زیادہ سودمند نہیں

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک

تیسری بات یہ ہے کہ اگر امام ابوحنیفہؒ نے حضرت ابن عباس کا مسلک اختیار کیا ہے تو ایک عظیم اکثریت نے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مسلک اختیار کیا ہے۔ یہ دونوں ائمہ فقہ عورت کا پورے کا پورا جسم محل حجاب سمجھتے تھے جیسا کہ درج ذیل روایت سے واضح ہے:

واما العورة بالنسبة للرجل فجمیع بدنها عورة علی الصحیح وهو مذهب الشافعیة والحنابلة

اور جہاں تک عورت کے ستر کا تعلق ہے تو صحیح بات یہی ہے کہ آدمی کے لئے عورت کا سارا بدن ہی ستر ہے اور امام احمد بن حنبل نے تو

؎۱ (معالم التنزیل) نیز دیکھئے تفہیم القرآن۔ ج ۳، ص ۱۲۹

؎۲ تفسیر ابن کثیر۔ ج ۳، ص ۳۱۸ جامع البیان للطبری ص ۳۳ مطبوعہ مصر

وقد نص الامام احمد رحمہ اللہ علیٰ ذالك فقال وكل شئ من المرأة عورة حتى ظفر [1]

بالوضاحت فرمایا ہے کہ عورت کی ہر چیز حتی کہ اس کے ناخن بھی ستر ہیں۔

تفاسیر مفسرین خواہ متقدمین ہوں یا متاخرین، ان کا کثیر طبقہ حجاب الوجہ والکفین کا قائل ہے اور ان کے حوالہ جات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا درج کرنا اس مختصر سے مقالہ میں ممکن نہیں۔ ان تفاسیر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کا بھی کثیر طبقہ چہرہ اور ہاتھوں کے حجاب کا قائل تھا۔

تعامل اُمّت دورِ نبوی سے لے کر آج تک دین دار گھرانوں میں عورتوں کا یہی معمول رہا ہے کہ چہرہ اور ہاتھوں کو بھی عورتیں غیروں سے چھپائیں۔ اس دعویٰ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ منکرین حجاب کو اس طرز عمل کے خلاف باقاعدہ جہاد اور اجتہاد کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

یاایھاالذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلٰث مرات من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ و من بعد صلوٰۃ العشآء۔ ثلٰث عورٰت لکم لیس علیکم ولا علیھم جناح بعدھن طوّافون علیکم بعضکم علیٰ بعض کذالك یبین اللہ لکم الایات واللہ علیم حکیم۔ واذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستاذنوا کما استاذن الذین

اے ایمان والو! تمہارے مملوکوں اور ان بچوں کو، جو ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے، چاہئے کہ تین اوقات میں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے کی) اجازت لیا کریں ایک تو صبح کی نماز سے پہلے، دوسرے دوپہر کو جب تم کپڑے اتار دیتے ہو اور تیسرے عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تینوں وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ آنے جانے میں نہ تم پر کچھ گناہ ہے نہ ان پر، تمہیں ایک دوسرے کے پاس بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ بہت علم والا اور حکمت والا ہے اور جب

---

[1] روائع البیان ج ۲۔ ص ۱۵۴

من قبلهم کذالک یبین اللہ لکم اٰیتہ واللہ علیم حکیم۔

والقواعد من النسآء الّتی لا یرجون نکاحا فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجت بزینۃ وان یستعففن خیر لھن۔ ؎۱

تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں تو انھیں بھی اسیطرح اجازت لینی چاہئے جسطرح تم سے دوسرے بالغ پہلے اجازت لیا کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتوں کو وضاحت فرماتا ہے اور اللہ بہت علم والا اور حکیم ہے۔

اور بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی توقع نہیں رہی اگر وہ اپنی چادر اتار دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں اور اگر وہ اس بات سے بھی بچی رہیں تو یہ ان کے لئے بہتر ہے۔

۱۴۔ گھروں میں داخلہ پر مزید پابندی

پہلے احکام میں یہ مذکور تھا کہ دوسرے لوگوں کے گھروں میں جانے کے لئے اہل خانہ کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ان آیات میں دو ایسی اقسام کا ذکر ہے جن سے کوئی حجاب نہیں ہوتا ان میں سے ایک تو اپنے ہی مملوک ہیں جنھیں ہر وقت گھر کے کام کاج کے سلسلہ میں گھر سے نکلنا اور داخل ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے نابالغ بچے ہیں۔ ان آیات کی رو سے تین اوقات میں ان پر بھی گھروں میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اوقات عموماً سونے اور میاں بیوی کے خلوت کے اوقات ہوتے ہیں۔ ایسے وقتوں میں تو میاں بیوی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے حقیقی بیٹے بیٹیاں بھی انھیں اس حالت میں دیکھنے نہ پائیں۔ لہٰذا ان اوقات میں اس قسم کی پابندی عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔

گھر کی خلوت PRIVACY

آیات کی ترتیب نزول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے گھر کی خلوت کو بہت اہمیت دی ہے۔ سب سے پہلے نبی کے گھروں پر عام لوگوں کے داخلہ پر پابندی لگائی گئی پھر اس پابندی میں تمام مسلمانوں کے گھروں کو شامل کیا گیا۔ اس کے بعد نوکروں چاکروں اور بچوں پر بھی خاص اوقات میں داخلہ کے لئے استیذان کو ضروری قرار دے دیا گیا۔ اب اس سلسلہ میں چند احادیث نبوی ملاحظہ فرمائیے۔ اجازت

؎۱ سورۃ نور ۵۸۔۶۰

ملنے سے پیشتر کسی کے گھر میں نظر داخل کرنے کو بھی جرم قرار دیا گیا۔ ارشاد نبوی ہے:

(۱) اذا دخل البصر فلا اذن [۱] — جب نگاہ اندر چلی گئی تو پھر اذن کا کیا موقع رہا؟

نیز آپؐ نے فرمایا:

(۲) انما جعل الاذن من اجل البصر [۲] — نظر بازی کی وجہ سے ہی اذن لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۳) لو ان امرا اطلع علیك بغیر اذن فخذفته بحصاۃ ففقات عینه ما علیك من جناح۔ [۳] — اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پہ کچھ گناہ نہیں۔

اس اذن کا طریقہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ اذن مانگنے والا دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر السلام علیکم کہے اور اپنا نام بتلائے (جب کہ گھر والے اس کی آواز سے اس کو پہچان نہ سکتے ہوں) پھر اگر تین دفعہ السلام علیکم کہنے کے باوجود بھی اجازت نہ ملے تو واپس چلا جائے اور افرادِ خانہ کی اجازت کی صورت یہ ہوگی کہ اس کے ایک ہی دفعہ آواز نکالنے، السلام علیکم یا کھانسنے ہی میں گھر والے اسے پہچان کر متنبہ ہو جاتے ہیں۔ پھر اگر کسی کو ضرورت ہو تو اسے رکنے کے لئے کہہ سکتے ہیں ورنہ اس کے استیذان کا تقاضا پورا ہو گیا۔

خلوت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کا خط اس کی اجازت کے بغیر نہ پڑھا جائے چنانچہ آپؐ نے فرمایا

من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار۔ [۴] — جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔

۱۴۔ بوڑھی عورتوں کو مشروط رخصت

اس آیت میں ایسی بوڑھی عورتوں کو احکام حجاب میں رخصت دی گئی ہے جو نکاح کے قابل ہی نہ رہی ہوں اور جن کے شہوانی جذبات مر چکے ہوں لیکن اگر اتنی عمر کے باوجود زینت و آرائش

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب باب فی الاستیذان۔ [۲] مسلم، کتاب الاستیذان، باب تحریم النظر فی بیت غیرہ

[۳] مسلم، کتاب الاستیذان باب تحریم النظر فی بیت غیرہ

[۴] ابوداؤد

کی دلدادہ اور اس زینت کا اظہار بھی پسند کرتی ہوں تو ان کے لئے یہ رخصت نہیں ہے۔ انہیں احکام حجاب کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ایک اور صورت یہ ہے کہ عورت بوڑھی ہے اور وہ زیب و زینت اور اس کے اظہار کی دلدادہ بھی نہیں تو اس کے لئے احکام حجاب سے رخصت تو ہے مگر پھر بھی اگر وہ اس رخصت کا استعمال نہ کرے تو یہی بات خود اس کے حق میں بہتر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے دیکھنے والے سارے بوڑھے یا متقی لوگ تو نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شہوت کا مارا نوجوان اس سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دے اور اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہ چوکے۔ لہٰذا بوڑھی عورتیں بھی اس رخصت کو موقع و محل کا لحاظ رکھ کر استعمال کریں۔ بصورت دیگر اس رخصت کا استعمال نہ کریں۔

احکامِ ستر و حجاب اور سنّتِ نبویؐ

۱۵۔ اختلاط مرد و زن

اختلاط مرد و زن کا مسئلہ شریعت اسلامیہ کے جس قدر مخالف ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بعض عبادات اور جہاد تک سے عورت کو سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ لے دے کر ایک حج ایسا رکن اسلام ہے جو عورت پر بھی فرض ہے مگر یہ بھی بغیر خاوند یا محرم کے جائز نہیں۔ مسجد میں نماز ادا کرنے سے عورت کا گھر نماز ادا کرنا بہر حال بہتر ہے۔ پھر مسجد میں عورتوں کے جانے پر پابندیاں شریعت نے عائد کی ہیں ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جنازہ کے ہمراہ جانا اور نماز جنازہ میں شرکت سے عورتوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ یہی صورت حال جہاد کی بھی ہے۔ بارہا رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو جہاد میں شرکت سے روکا ہے۔ اب چند مزید ارشادات نبوی ملاحظہ فرمائیے:

(۱) عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یخلون رجل بامرأۃ الا مع ذی محرم ۔ [1]	ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دیکھو! کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ اس کے محرم کی موجودگی کے بغیر تنہائی اختیار نہ کرے۔
(۲) لا یخلون رجل بامرأۃ الا کان	کوئی شخص کسی غیر عورت کے ساتھ خلوت کرتا ہے تو ان

---

[1] بخاری۔ کتاب النکاح۔ باب لا یخلون رجل

ثالثهما الشیطن۔ [۱]
دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

(۳) لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم۔ [۲]
علیحدگی میں رہنے والی عورتوں پر مت داخل ہوا کرو کیونکہ شیطان ہر انسان میں یوں دوڑتا پھرتا ہے جیسے اس کا خون رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔

(۴) خبردار غیر عورتوں پر داخل نہ ہوا کرو۔ ایک انصاری صحابی نے پوچھا۔ یارسول اللہؐ! خاوند کے رشتہ داروں کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا خاوند کے رشتہ دار (بغیر خاوند کے باپ کے) تو موت ہیں۔ [۳]

ان ارشادات مبارکہ کو سامنے رکھ کر بتلائیے کہ مخلوط تعلیم، عورتوں اور مردوں کی کلب گھروں میں مجلس، دفتروں میں ملازمت وغیرہ وغیرہ کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟

احکام لباس

لباس ایسا ہونا چاہئے جو ساتر ہو، یعنی نہ تو اتنا باریک ہو کہ اس میں سے بدن کے اعضاء نظر آئیں اور نہ اتنا چست ہو کہ موٹا ہونے کے باوجود بھی جسم کے اعضاء کی ساخت پوری واضح نظر آرہی ہو۔ ارشاد نبوی ہے:

نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنة ولا یجدن ریحھا وریحھا یوجد مسیرة خمس مائة سنة۔ [۴]
وہ عورتیں جو کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوتی ہیں، مردوں کی طرف مائل ہوجانے والی اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے والی ہوں وہ نہ جنت میں داخل ہونگی نہ ہی اسکی خوشبو پائیں گی حالانکہ جنت کی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت سے آتی ہے۔

اس حدیث میں ان عورتوں کی وعید کا ذکر ہے جو کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوتی ہیں اور اسکی کئی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کپڑے اتنے باریک ہوں کہ ان سے بدن نظر آرہا ہو، دوسرے یہ کہ کپڑے خواہ موٹے ہوں لیکن اتنے چست ہوں کہ بدن کے سب ابھار نظر آرہے ہوں۔ تیسرے یہ کہ بدن کا کچھ حصہ ملبوس ہو اور کچھ حصہ ویسے ہی ننگا چھوڑ دیا گیا ہو۔ جو بھی صورت ہو اس قسم کے لباس حرام ہیں۔

---

[۱] ترمذی۔ ابواب رضاع۔ باب کراہیة دخول علی المغیبات۔ [۲] ترمذی۔ ایضاً

[۳] بخاری، کتاب النکاح باب لا یخلون رجل......

[۴] موطا۔ کتاب الجامع، باب مایکرہ لنساء......

مروجہ برقع اس حدیث کو سامنے رکھ کر یہ بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جلباب اور اس کی مختلف ادوار میں بدلتی شکلیں اور مروجہ برقع کس قسم کا ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں کا مروجہ برقع جسے عام زبان میں "ترکی برقع" کہتے ہیں، شرعی لباس کے تقاضے پورے نہیں کرتا کیونکہ :

۱۔ یہ زینت چھپانے کے بجائے بذاتِ خود زینت بن گیا ہے۔ شوخ رنگ اور وضع دار ہوتا ہے۔ جو صورت مردوں کے لئے کوٹ کی ہے وہی صورت عورتوں کے لئے برقع کی بن چکی ہے۔

۲۔ اس کا نقاب اتنا باریک کپڑے کا لگایا جاتا ہے کہ اس سے چہرہ نظر آسکتا ہے۔

۳۔ اس کے دو الگ الگ حصے ہوتے ہیں، ایک سر پر رکھنے کا دوسرا کوٹ کی طرح پہننے کا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دو جانب سے عورت کی گردن اور کانوں کا زیور نظر آسکتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ان امور کی اصلاح کے لئے خصوصی توجہ دینا ضروری ہے۔

۱۷۔ دلکش ادائیں عورت کی فطرت یہ ہے کہ طبعی شرم کی وجہ سے فحاشی کی طرف پیش قدمی نہیں کرتی تاآنکہ اس کی یہ فطرت مسخ نہ ہو جائے اس کے بجائے وہ ایسی دلکش ادائیں اختیار کرتی اور بنتی سنورتی ہے کہ مرد خود اس کی طرف مائل ہوں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کی آواز میں لوچ ہو اور دوسرے پاؤں کی جھنکار ہے۔ ان دونوں باتوں سے قرآن کریم نے منع کر دیا ہے۔ تیسری صورت عطر لگا کر گھر سے باہر نکلنا ہے جس کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ :

المراة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا وكذا يعني الزانية۔ [1]	جب کوئی عورت عطر لگا کر باہر نکلتی ہے اور کسی مجلس سے گزرتی ہے تو وہ ایسی اور ویسی گویا زانیہ ہے۔

اور ہم پہلے مسلم کے حوالہ سے بتلا چکے ہیں کہ عورت اگر رات کو مسجد جائے تو عطر کا استعمال حرام ہے ایک دوسری روایت کے مطابق اس کی نماز ہی قبول نہیں ہوتی جب تک وہ نہا نہ لے اور یہ غسل، غسل جنابت کی طرح ہے چوتھی صورت یہ ہے کہ عورت بالوں کی آرائش غیر فطری طور پر کرتی ہے یا جلد پر نقش و نگار گدواتی ہے یا مصنوعی طریقوں سے اپنے جسمانی اعضاء میں خوبصورتی کی غرض سے تغیر و تبدل کرتی ہے۔ ایسی تمام باتوں کے سلسلہ میں آپؐ کا ارشاد ہے کہ :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن الواشمات والمستوشمات والمتنمصات مبتغيات للحسن	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گودنے والی، گودوانے والی اور بال اکھیڑنے والی عورتوں پر، جو افزائش حسن کیلئے یہ کام کرتی ہیں سب پر لعنت

---

[1] ترمذی۔ ابواب الادب باب کراھیۃ خروج المراۃ المتعطرۃ

مغیرات خلق اللہ۔ [1] کی ہے اور ایسی عورتوں کو اللہ تعالیٰ کی پیدائش میں تبدیلی کرنے والی قرار دیا۔

دورِ نبوی میں عورتیں اپنے جسم میں جاذبیت اور کشش پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کام کرتی تھیں:
۱۔ بدن پر تل وغیرہ بنوانا، گودنا، ۲۔ چہرہ اور ماتھے سے روئیں یا سفید بال اکھیڑنا تاکہ نوعمر معلوم ہوں، ۳۔ بالوں میں جوڑ لگاکر چوٹیہ بنانا تاکہ گنجان اور خوبصورت معلوم ہوں، ۴۔ دانتوں کو رگڑ کر برابر کرنا۔ ۵۔ دانتوں کے درمیان فاصلہ کی یکسانیت رگڑ کر پیدا کرنا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسے کام کرنے والی اور کروانے والی تمام عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [2]

پھر ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ جنسی اختلاط کی راہ ہموار کرنے کے لئے عورتیں مردوں کا سا لباس اور وضع اختیار کرنے لگتی ہیں اور اس کام میں مرد بھی شریک ہوکر عورتوں کی مشابہت کرنے لگتے ہیں ایسے طبقے کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

عن ابن عباس قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبھات بالرجال من النساء والمتشبھین بالنساء من الرجال۔ [3]	ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں اور ایسے ہی ان مردوں پر بھی جو عورتوں کی سی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

یہی وہ عورتوں کے اٹھائے ہوئے فتنے ہیں جن کی بناء پر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ:

ماترکت بعدی فی الناس فتنۃ أضر علی الرجال من النساء۔ [4]	میرے بعد سب سے زیادہ نقصان دہ فتنہ جو لوگوں پر آئیگا وہ عورتوں کی طرف سے مردوں پر ہوگا۔

مقامِ عبرت اب آپ خود دیکھ لیجئے کہ کیا آج کا مغربی تہذیب سے مرعوب مسلمان ان تمام بندشوں کو ایک ایک کرکے کھولنے کی کوشش نہیں کر رہا؟ اور وہ کام جن سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے واضح طور پر منع کر دیا تھا، دو راز کار تاویلات و تحریفات کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لعنت کا مصداق نہیں بن رہا؟

(جاری)

---

[1] ترمذی۔ ابواب الادب باب کراہیۃ خروج المراۃ المتعطرہ۔ [2] دیکھئے نسائی، کتاب الزینۃ۔ [3] متفق علیہ، مشکوٰۃ کتاب النکاح، ترمذی ابواب ا۔ ب۔ باب المتشبہات بالرجال۔ [4] ترمذی ابواب الادب، باب تحذیر فتنۃ النساء

تیسری اور آخری قسط

عبادت و خدمت

ان کاموں میں سے کوئی ایک دو کام آپ اپنے ذمّہ لے لیں

ہم نیچے خدمت کے کچھ چھوٹے بڑے کاموں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہر مسلمان اپنی ضروریات کے لحاظ سے اپنی زندگی میں ان میں سے دو ایک خدمتوں کو داخل کرلے تو امید ہے کہ سیاسی کشمکش کے ذریعہ مسلمان جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ سب اسی خدمت کی راہ سے حاصل ہو جائے گا بشرطیکہ اس کو سیاسی کامیابی کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کو اپنا فرض اور انسانیت کا تقاضا سمجھ کر کیا جائے۔ اگر ہمارے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں تو انشاء اللہ جو عزت ہم حقوق طلبی اور قانونی سہاروں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بغیر ان سہاروں کے حاصل ہو جائے گی۔ ان خدمات میں اس وقت میں ان خدمتوں کا ذکر نہیں کروں گا جو آدمی اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں اپنے طبعی تقاضے کی بناء پر انجام دیتا ہے یا اپنے اعزہ واقارب کے حقوق کی ادائیگی میں جو تکلیف اٹھاتا ہے بلکہ میں یہاں ان خدمات کا ذکر کروں گا جن کا فائدہ عام مخلوق کو یا ایک انسان کو انسانی رشتہ کی بناء پر پہنچے خواہ اس سے ہمارا کوئی وطنی، دینی اور خاندانی تعلق ہو یا نہ ہو مگر خدمت کرتے وقت چند باتیں ہمارے ذہن میں ضرور رہنی چاہئیں۔

۱۔ سب سے پہلے ہم کو اپنے اندر انسانیت کا احترام پیدا کرنا چاہئے۔ انسانیت کے احترام کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت انسان سارے انسان خواہ وہ کسی مذہب یا کسی مسلک کے ماننے والے یا کسی ملک کے ہوں، خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی ہوں، کالے ہوں یا گورے ہوں، غریب ہوں یا امیر ہوں، اللہ کی مخلوق کی حیثیت سے سب کے سب برابر اور آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے ان کی خدمت ہمیں کسی غرض، توقع یا مجبوری کی بناء پر نہیں بلکہ یہ سمجھ کر کرنا چاہئے کہ ان کی خدمت انسانی فرض اور بھائی چارگی کا تقاضہ ہے

جس طرح ہم مجبوری کے وقت دوسروں کی مدد چاہتے ہیں اور مدد نہ ملنے کی صورت میں ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح ہر انسان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔ اسی کو حدیث میں کہا گیا ہے " ساری مخلوق اللہ کا خانوادہ ہے، تو جو اس کے خانوادہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اللہ کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب ہے "۔

ب۔ دوسری بات ہمارے ذہن میں یہ رہنی چاہئے کہ ہم کو یہ کام کسی مجبوری، خوشامد یا احساس کمتری کی بناء پر نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو انسانی رشتہ اور دینی احساس کی بناء پر کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں ہمارا کام، دوسروں کے پیچھے چلنا نہیں بلکہ چلانا ہے۔ ہم دنیا کے لئے ہدایت کا پیغام لے کر آئے ہیں خدا کے اس آخری پیغام کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے اندر محبت اور جذبۂ خدمت پیدا کریں۔ نفرت و حقارت سے دور رہیں اور پھر خدمت کا راستہ انبیاء کرام کا راستہ ہے اور اس کے ذریعہ ہدایت کا پیغام بندگانِ خدا تک جتنی تیزی سے پہنچتا ہے اتنی تیزی سے دوسرے طریقہ سے نہیں پہنچتا۔ اس بناء پر ہم نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

ج۔ تیسری بات یہ کہ خدمت کا راستہ بہت ہی خشک، دشوار گزار اور پتہ ماری کا ہے اس لئے اس کام کو سیاسی اور سطحی انداز سے نہیں بلکہ قلب کی پوری گہرائی، خلوص اور لگن اور تعریف و تائید اور صلہ و غرض کی توقع کے بغیر کیا جائے اور اسی صورت میں اس کے بہترین نتائج سامنے آئیں گے۔ سیلاب، طوفان یا کسی فساد اور جھگڑے کے مواقع پر ہم جو خدمات انجام دیتے ہیں وہ انتہائی قابل قدر ہیں مگر ضرورت یہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کرنا ہمارا مزاج بن جائے یا ہم کو خدمت کی دشواریوں میں لذت محسوس ہونے لگے اسے ہم اپنی زندگی کا جز بنالیں، اسے ایک دن کا نہیں بلکہ پوری زندگی کا کام سمجھنے لگیں۔

خدمت خلق کے کام بے شمار ہیں، سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے مگر پھر بھی ہم یہاں ان میں سے چند کاموں کی ایک فہرست دے رہے ہیں۔ آپ اپنے وقت، صلاحیت اور اہمیت کے لحاظ سے جو کام مناسب سمجھیں ضرور اختیار کریں مگر کچھ خدمتوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا معمول ضرور بنالیں۔

خدمت کے کچھ کام

- سب سے پہلے اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرنے کی عادت ڈالئے اور اپنے بچوں کو بھی اس کی ترغیب

دیجئے اور سمجھایئے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں توہین محسوس کرنا غرور اور زوال کی علامت ہے مثلاً رات کے وقت اپنا بستر اپنے ہاتھ سے بچھایئے۔ صبح کو نماز و تلاوت سے فارغ ہو کر اپنا بستر خود اٹھایئے۔ کمرے میں جھاڑو لگایئے۔ گھر کی صفائی کیجئے۔ ہر چیز سلیقہ سے رکھئے اور اپنے بچّوں میں بھی ان کاموں کی عادت ڈالیئے۔

- اپنے کو زیادہ سے زیادہ محنت و مشقت کا عادی بنایئے۔ سادہ زندگی گزاریئے اور عیش و آرام سے پرہیز کیجئے۔ سادگی اور قناعت سے آدمی کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔
- اپنے پڑوسیوں کی خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، خبر گیری کیجئے۔ ضرورت پڑے تو ان کا کام کر دیجئے اور ان کی جو ضرورت آپ پوری نہ کر سکتے ہوں تو اپنے بچّوں سے یا دوسروں سے کہہ کر ان کو پورا کرانے کی کوشش کیجئے۔
- اپنے بال بچّوں، اعزہ و اقارب کے علاوہ محلہ پڑوس کے معذوروں کی دیکھ بھال کیجئے۔ ان کے بیماروں کی عیادت کو جایئے اور اگر ضرورت ہو تو ان کی تیمار داری کیجئے۔ تیمار داری میں ان کی دیکھ بھال کے ساتھ دوا وغیرہ لا دینا، ڈاکٹر کو دکھا دینا، مالی مدد کر دینا اور راحت کے دوسرے کام بھی شامل ہیں۔
- بے نمازیوں کو نماز پڑھنے کی ترغیب دیجئے اور جو لوگ نمازی اور دیندار ہوں ان کے اندر بندوں کے حقوق ادا کرنے اور حق تلفی سے بچنے اور عام لوگوں کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔
- اپنے محلہ پڑوس کے نادار یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی فہرست تیار کیجئے اور خود ان کی مالی اور اخلاقی امداد کیجئے۔ اگر ان کو مالی مدد کی ضرورت ہو اور آپ خود نہ کر سکتے ہوں تو دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کیجئے۔
- آپ اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی سے پیسہ بچا کر اپنے کسی غریب عزیز یا کسی غریب پڑوسی کے بچّے یا بچّی یا کسی یتیم بچے یا بچّی کی شادی کا انتظام کر دیجئے۔
- آپ اپنے بچّے اور بچّیوں کے ساتھ کسی غریب عزیز یا پڑوسی کے بچّے یا بچّی کی تعلیم میں مدد دیجئے۔
- اگر کوئی ضرورت مند ہو اور وہ اپنی ضرورت کسی ذمہ دار تک نہ پہنچا سکتا ہو تو آپ بغیر کسی غرض اور لالچ کے ذمہ دار کے یہاں اس کی سفارش کر دیجئے۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِشْفَعُوْا اِلَیَّ تُؤْجَرُوْا "لوگوں کی سفارش کرو میرے پاس تم کو ثواب ملے گا"
- اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ سادگی پیدا کیجئے اور اپنی صحت کو برباد کرنے والی چیزوں سے پرہیز کیجئے،

اگر کوئی نوجوان یا بوڑھا بیڑی، سگریٹ یا کسی اور برائی کا عادی ہے تو اسے سمجھا کر یا ڈانٹ ڈپٹ کر اس سے باز رکھنے کی کوشش کیجئے۔

- اپنے والدین یا خاندان یا محلہ اور پڑوس کے بڑے بوڑھوں کی روزانہ چھوٹی یا بڑی کوئی نہ کوئی خدمت کرنے کی ضرور کوشش کیجئے۔ خاص طور پر جب وہ بالکل معذور ہو جائیں۔
- اپنے محلہ کی مسجد کی روزانہ خود صفائی کیجئے۔ اس کی چٹائی درست کیجئے اور لوٹے وغیرہ کو قرینہ سے رکھ دیجئے۔ وضو کے پانی کا انتظام نہ ہو تو کر دیجئے۔ مؤذن یا ملازم پر اسے نہ ٹالئے۔
- اپنے مکان و صحن کے ساتھ محلہ کی گلیوں اور نالیوں کی صفائی کی بھی کوشش کیجئے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیجئے، گھر کا کوڑا کرکٹ لیک جگہ پھینکئے اسے اِدھر اُدھر نہ پھیلائیے۔
- اگر کوئی شخص راستہ یا کسی کا پتہ پوچھے تو صرف اشارہ سے نہ بتائیے بلکہ کچھ دور چل کر اسے بتائیے۔ اگر آپ کو نہ معلوم ہو تو یہ جواب نہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا بلکہ کسی دوسرے سے پوچھ کر اسے بتلائیے۔
- راستہ میں اگر کوئی کنکر، پتھر، گندگی یا کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہو تو اسے ہٹا دیجئے۔ اسی طرح انسانی زندگی کی ہر رکاوٹ دور کرنا اپنے ایمان کا تقاضہ سمجھئے۔
- اگر کہیں سیلاب، طوفان یا اور کوئی ارضی یا سماوی مصیبت آجائے تو مصیبت زدوں کی دل کھول کر مالی مدد کیجئے، اگر مالی مدد نہ کر سکتے ہوں تو اخلاقی اور جسمانی مدد کیجئے۔
- آپ اپنی ذاتی سواری سے جا رہے ہوں اور راستہ میں کوئی بوڑھا یا معذور یا پریشان حال آدمی آپ کو نظر آجائے تو سواری روک کر اس سے پوچھ لیجئے۔ اگر وہ آپ کے راستہ ہی میں کہیں جانا چاہتا ہو تو اسے پہنچا دیجئے۔

اس سلسلہ میں راقم الحروف یہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا کہ ہم لوگ مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد ٹیکسی سے مکہ مکرمہ واپس آرہے تھے کہ مدینہ منورہ سے کچھ دور باہر آنے کے بعد ایک بوڑھے اجنبی آدمی نے ہاتھ دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور اسے بٹھا لیا۔ دو چار میل چلنے کے بعد اس نے ڈرائیور سے اتارنے کے لئے کہا ڈرائیور نے اتار دیا۔ اترتے ہی عربوں کے قاعدے کے مطابق اس نے دوبار "شکراً لک" کہا اور کچھ کرایہ دینے کی کوشش کی۔ ڈرائیور نے بڑی لجاجت کے ساتھ معذرت کی اور جواب میں کئی بار اس جملے کو دوہرایا "شرفتنا یا شیخ شرفتنا یا شیخ" یعنی آپ نے سوار ہو کر مجھے عزت بخشی، یہ

جملہ اس نے جس محبت، خلوص اور شرافت کے انداز میں کہا کہ قلب پر اس کے اخلاق کا عجیب اثر پڑا اور بے ساختہ تعریفی کلمات زبان سے نکلے۔

- اگر محلہ و پڑوس کے آدمیوں میں اختلاف یا جھگڑا ہو جائے تو تماشائی بن کر دیکھتے نہ رہئے بلکہ آپس میں میل ملاپ پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور ظالم کا ساتھ کبھی نہ دیجئے۔
- گورنمنٹ غریبوں کو روزگار سے لگانے کے لئے جو اسکیمیں نافذ کرتی ہے اس سے اپنے بھائیوں کو آگاہ کرتے رہئے۔
- کسی غریب یا بے سہارا یا لاوارث آدمی کی موت ہو جائے تو اس کی تجہیز و تکفین کی کوشش کیجئے۔
- اگر کوئی شخص آپ سے مشورہ طلب کرے تو اس کو صحیح مشورہ دیجئے۔ غلط مشورہ دینا بد دیانتی ہے۔
- زیادہ سے زیادہ رفاہی ادارہ مثلاً اسپتال، زچہ خانہ قائم کیجئے اور غریبوں و معذوروں اور غریب طالب علموں کی مدد کے لئے بیت المال قائم کیجئے اور لوگوں کو ضرورت کے وقت غیر سودی قرض دیجئے یا اس کے ذریعہ ان کی مدد کرا دیجئے۔
- اگر آپ تاجر ہیں تو کسی غریب یا بے روزگار کو کاروبار سے لگانے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ کوئی صنعت یا حرفت جانتے ہیں تو کچھ غریب بچوں کو اپنا ہنر سکھا دیجئے۔ اگر آپ ٹیچر ہیں تو کچھ غریب اور ذہین طلبہ کو خارج اوقات میں مفت پڑھا دیجئے۔ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو کچھ غریب مریضوں کا مفت علاج کر دیجئے۔
- مختلف خیال اور مختلف مسلک کے مسلمانوں میں محبت و قربت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے ان میں دوری پیدا کرنے والی باتوں سے پرہیز کیجئے۔
- جہاں بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ ہو وہاں مکتب قائم کیجئے یا اور کسی ذریعہ سے ان کا انتظام کیجئے اسکول و کالج کے وہ بچے یا بچیاں جو اردو زبان، قرآن پاک نہ پڑھ سکتے ہوں تو وقت نکال کر آپ دو چار بچوں کو روزانہ خود پڑھا دیجئے یا کسی دوسرے کو اسکے لئے آمادہ کیجئے۔
- اگر سڑک پر یا عام راستہ پر نل لگا ہوا ہو اور اس کا پانی بے کار گر رہا ہو تو نل کی ٹونٹی بند کر دیجئے اسی طرح اگر سڑک پر بجلی بے کار جل رہی ہو تو اسے بجھانے کی کوشش کیجئے۔
- آپ کے محلہ یا پڑوس میں جو بالغ کسان، مزدور یا دوسرے لوگ اَن پڑھ ہوں ان کو روزانہ ایک گھنٹہ آپ خود پڑھا دیا کریں یا ان کے پڑھانے کا انتظام کر دیں۔

- اگر بس یا ریل میں کسی مسافر کے پاس سامان زیادہ ہو یا کسی راہ گیر کے پاس زیادہ بوجھ ہو تو اس کے سامان کو اتارنے یا چڑھانے میں اس کی مدد کر دیجئے۔
- آپ اپنے بچوں اور طالب علموں اور شاگردوں سے ذاتی خدمت کم اور اجتماعی خدمت زیادہ لیجئے۔

چار باتیں اگر ساری دنیا کے مسلمانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر یہ چار باتیں پیدا ہو جائیں تو یہ سرزمین جوان کے لئے تنگ نظر آتی ہے وسیع سے وسیع تر ہو جائے گی اور ان کو عزت کا وہ مقام جسے وہ حقوق طلبی اور سیاسی سطح سے حاصل کرنا چاہتے ہیں خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

۱۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان و یقین میں پختگی پیدا کریں۔ ایمان و یقین میں پختگی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ نہ تو کسی سے امید رکھیں اور نہ ڈریں اور نہ کسی کو حاجت روا اور رزاق سمجھیں اور جو صحیح کام کریں خدا سے اس کی کامیابی کا یقین دل میں رکھیں۔

۲۔ دوسری چیز یہ کہ فرض عبادات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام رکھیں۔ عبادات میں صرف نماز، روزہ اور حج ہی کو نہیں بلکہ زکوٰۃ کو بھی عبادت سمجھیں اور ایک ایک دانے اور ایک ایک پیسے کی زکوٰۃ نکالیں اور بغیر کسی نمود و نمائش کے اسے مستحقین تک پہنچا دیں۔

۳۔ تیسری چیز یہ کہ خدمت کو، جس کی تفصیل اس رسالہ میں کی گئی ہے اس کو اپنی زندگی کا جز بنالیں اور اس کو ایک عبادت سمجھ کریں ۔

۴۔ چوتھی چیز یہ کہ زندگی کے ہر میدان میں آپ رعایت طلبی کے بجائے اپنے اندر خود اعتمادی اور مقابلہ کی قوت پیدا کریں اور پوری نسل میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں خواہ یہ میدان تعلیمی ہو یا اقتصادی ہو ، اخلاقی ہو یا سیاسی، دوسروں کے سہارے جینا اپنے اوپر حرام کرلیں۔ اس سلسلہ میں امریکہ کے ایک یہودی کی بات ضرور یاد رکھئے۔ جب اس سے ایک ہندوستانی سیاح نے پوچھا کہ تم لوگ امریکہ میں تین چار فیصد ہوتے ہوئے بھی اس کی سیاست و معیشت پر کیسے حاوی ہو گئے؟ تو وہ بولا "ہم نے سو برس پہلے یہ طے کیا تھا کہ اگر امریکی طالب علم کسی پرچہ میں ۵۰ فیصد نمبر لاکر امتیاز حاصل کرے گا تو اس میں جب ہمارا بچہ دو سو نمبر حاصل کرے گا تب وہ امتیاز حاصل کرے گا۔ اسی جذبہ کے تحت ہم نے اپنی نسل کو تیار کیا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔" خود ہمارے ملک میں سکھ اقلیت کی مثال ہمارے لئے

کافی ہے۔ ان کی خود اعتمادی اور مقابلہ کی قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی داڑھی اور صلفے کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں اور دنیا کے ہر ملک میں رواں دواں نظر آرہے ہیں۔

کاش ہم بھی یہ مثال قائم کرتے

کوڑھیوں کی خدمت اور ان کی راحت رسائی کے سلسلہ میں مدر مسنر ٹریسا کو ۱۹۷۹ء کو نوبل انعام ملا اور پھر ۱۹۸۲ء میں دوبارہ ان کو یہ اعزاز ملا۔

مدر ٹریسا ایک غیر ملکی خاتون ہیں جو آج سے پچاس برس پہلے عیسائی مشینری کی ایک رکن کی حیثیت سے ہندوستان آئیں اور انھوں نے کوڑھیوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور ان کو اس کام سے اتنا لگاؤ پیدا ہوا کہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔

عام طور پر کوڑھیوں کو دیکھ کر خوف، حقارت اور نفرت کی ایک عجیب وغریب کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ہم ان کے قریب جانے ہی سے نہیں بلکہ ان کے سایہ سے بھی بچتے ہیں۔ مگر مدر ٹریسا نہ تو ان کے مرض سے خوفزدہ ہوئیں اور نہ ان کے دل میں حقارت ونفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔ بلکہ انھوں نے ان کو اپنی آغوشِ محبت میں بٹھایا اور ان کی خدمت ایسی لگن اور خلوص سے کی کہ دنیا کی تاریخ میں نہ صرف اپنا نام زندہ جاوید کر لیا بلکہ عیسائی مشینریوں کی قدر وقیمت بھی دلوں میں اور زیادہ بڑھا دی۔ عیسائی مشینریوں کے تین بنیادی اصول ہیں۔

تعمیری کام، خاموش خدمت، اور ٹھوس نتائج

انھوں نے ان اصولوں کی دنیا کے سامنے عملی مثال پیش کی۔ مدر ٹریسا یہ خدمت ایک دو دن سے نہیں بلکہ پورے پچاس پچپن برس سے انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے اس اثناء میں نہ تو شہرت وپروپیگنڈہ کا حربہ استعمال کیا نہ اپنے کاموں کا اخبارات میں اشتہار دیا اور نہ اس "پیام انسانیت" کے لئے جلسے جلوس کا اہتمام کیا، نہ اپنی اور نہ اپنے کاموں کی تصویریں شائع کرائیں اور نہ بساط سیاست کی ہنگامہ آرائیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمزور نحیف اور بوڑھی تنہا عورت اپنی ذات سے خدمت خلق کے لئے ایک ادارہ بن گئی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو اس کی خدمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اسی کے نتیجہ میں اسے نوبل پرائز ملا۔ اب تک ادبی اور سائنسی خدمات پر نوبل پرائز ملتا رہا ہے مگر شاید خدمت

کے نتیجہ میں یہ پہلا نوبل پرائز ہے جو مدر ٹریسا کو ملا ہے۔

کاش مسلمان قوم میں کچھ لوگ مدر ٹریسا کی مثال قائم کرتے جس کی ان کی قوم کو مدر ٹریسا کی قوم سے زیادہ ضرورت ہے۔ آج کسی آفت ناگہانی یا مصیبت یا طوفان کے وقت یورپ و امریکہ کی امدادی ٹیمیں جس تیزی کے ساتھ پہنچ کر عام انسانوں کی خدمت کرتی ہیں افسوس ہے کوئی مسلمان حکومت اس سلسلہ میں اتنی تیزی و تندہی نہیں دکھاتی۔ حالانکہ یہ ان کے دین کا تقاضہ بھی ہے اور دعوت و تبلیغ کے لحاظ سے بھی یہ انتہائی ضروری کام ہے مگر ہم اس طرف سے انتہائی غفلت سے کام لے رہے ہیں۔

اگر آج مسلمانوں کے ہر طبقہ کے ذمہ دار حضرات اور خاص طور پر علماء اسی انداز میں قوم کی ذہنی تربیت کریں تو بہت سی خرابیوں کے باوجود ہماری قوم میں اب بھی بہت سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اور اس کی خاکستر میں بہت سی دبی ہوئی چنگاریاں موجود ہیں، ذرا ان کو ہوا دی جائے تو شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں ؎

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان گزارشات کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کی اہمیت بٹھا دے۔ دلوں کو پھیرنا اور مائل کرنا سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم

اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کا حل

مولانا محمد رفیق چوہدری

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں فقہی اور مذہبی اختلافات موجود ہیں جس کی وجہ سے یہاں اسلامی قانون سازی کے ہر مرحلے پر الجھن اور دشواری پیش آتی ہے اور پھر ہر مسلک کے لوگوں کی طرف سے ان کی فقہ کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا جاتا ہے جس سے تلخی اور کشیدگی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

اس صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر ہمارے اہل اقتدار نے نفاذ شریعت کے عمل کو صحیح طور سے نہیں اپنایا ہے۔ پھر کبھی کوئی جزوی کام بطور نمائش کے کر دیا ہے لیکن اصلاح احوال اور نفاذ شریعت کی مکمل تنفیذ نہیں ہو سکی یا پھر مروجہ انگریزی قوانین میں رد و بدل کر کے اسے "شریعت اسلامیہ" کے نام سے ملک میں نافذ کر دیا ہے۔ اس پر تمام مسالک کے لوگوں نے بالعموم خاموشی اختیار کر کے حکمران طبقے کے من پسند اسلام کو قبول کر لیا ہے اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ ٹھیک ہے اگر ہماری فقہ نافذ نہیں ہوئی تو کیا ہوا، دوسروں کی فقہ بھی تو نافذ نہیں ہوتی۔ یوں ہمارے ہاں برطانوی عہد کے نظام قانون کا تسلسل جاری ہے اور اس کی عمر طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔

دوسری جانب علمائے کرام کی جانب سے بھی کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جاتا جس کے نتیجے میں نفاذ شریعت کا عمل صحیح طور پر بروئے کار لایا جا سکے بلکہ اہلِ اسلام کا حال اب بقولِ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ہو گیا ہے:

"اِتَّفَقُوْا اَنْ لَّا یَتَّفِقُوْا" انھوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ کبھی اتفاق نہیں کریں گے۔

نفاذِ شریعت کے معاملے میں یہی صورت حال ہے کہ اسلامی قانون کے بارے میں اختلافات پیدا

کر کے مروجہ کافرانہ نظامِ قانون پر اتفاق و اکتفا کر لیا گیا ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک کم و بیش یہی کیفیت ہے جس سے ہم دوچار ہیں۔

اگرچہ بعض لوگ تو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ آخر ملک میں نفاذِ شریعت کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ نفاذِ شریعت کی بات کرنا ایک قسم کی رجعت پسندی، دقیانوسیت اور احمقانہ فعل ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال کے مطابق دورِ حاضر کی کسی جدید ریاست کو اسلام یا کسی اور دین کی بنیادوں پر استوار کرنا اور چلانا نہ ہی مناسب اور معقول ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ پھر ان کے خیال میں پاکستان کا نظامِ حکومت بھی سیکولر SECULAR یا لادین ہونا چاہئے۔ ایسے لوگوں سے تعرض کا اگرچہ یہ محل نہیں تاہم ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر متحدہ ہندوستان سے الگ پاکستان کے وجود کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے اور اگر پاکستان کے قیام کا جواز صرف دین اور وہ بھی دینِ اسلام تھا تو پھر اس ملک میں "اسلامی قانون" کیوں نافذ نہیں ہونا چاہئے؟

لیکن جو لوگ فی الواقع اس ملک میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور اس کی بالادستی قائم کرنے کی بات کرتے ہیں خود ان کی طرف سے بھی اسلامی قانون سازی کی راہ میں حائل فقہی اختلافات کو دور کرنے کے لئے اتنی مختلف اور متضاد باتیں کہی جاتی ہیں کہ جن کی موجودگی میں کوئی صحیح راہِ عمل متعین نہیں ہوتی۔ اور اس مسئلے کا کوئی تسلّی بخش حل سامنے نہیں آتا۔

اس سلسلے میں چند گروہوں کی آرا اور ان کی طرف سے پیش کردہ مختلف حل کا استقصار کر کے ان پر اپنا محاکمہ پیش کریں گے۔

۱- پہلے گروہ کی رائے اور اس کا جائزہ

اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کی حائل رکاوٹ دور کرنے کے لئے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ صرف قرآن مجید ہی کو ماخذ قانون مانا جائے اور اس کی روشنی میں موجودہ حالات میں نئے سرے سے اسلام کے فقہی قانون مدون و مرتب کئے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سنت، اجماع اور دوسرے سابقہ اجتہادات کو از کار رفتہ، فضول اور ناقابل اعتبار ٹھہرایا جائے اور مغربی جمہوریت کی بنیاد پر قائم ہونے والی ہر پارلیمنٹ (یا جسے وہ "مرکزِ ملت" کہتے ہیں) کو اس کام کے لئے اہل مجاز اور با اختیار قرار دیا جائے کہ وہ آج کے حالات کے پیش نظر قرآن کے مطابق جدید قانون سازی فرمائے۔ پھر یہ مردانہ اور زنانہ

پارلیمنٹ یا مرکزِ ملت جس چیز کو خلافِ قرآن قرار دے اسے غیر اسلامی اور کالعدم سمجھا جائے۔
بقول اصغر مرحوم ؎

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

لیکن اس نقطۂ نظر کے حامی لوگوں کی مصیبت یہ ہے کہ وہ بے چارے جس قرآن مجید کو ماخذِ قانون بناتے ہیں خود اس کے ہجے بھی نہیں کر سکتے کیونکہ اتفاق سے اللہ تعالیٰ نے اسے عربی زبان میں نازل کیا ہے اور یہ لوگ عربی زبان نہیں جانتے۔ گویا ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

زیادہ سے زیادہ ان کا مبلغ علم یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ پڑھ لیتے ہیں اور ان میں جو زیادہ "تعلیم یافتہ" ہیں وہ اردو ترجمے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے جن علوم کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے مثلاً علم صرف ونحو اصول تفسیر، علم بیان ومعانی، علم اسباب نزول آیات، علم ناسخ و منسوخ اور علم قرارت وغیرہا۔ ان تمام علوم سے یہ حضرات" کما حقہ "بے بہرہ ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ اس کے باوصف اپنے آپ کو اسلامی مفکر اور دانشور سمجھنے کی جہل مرکب کا شکار ہیں۔

پھر دوسری طرف یہی لوگ سنت اور اجماع کی مسلمہ دستوری اور قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہیں یہ خبر ہی نہیں کہ آج جس ذریعے (SOURCE) سے قرآن کا قرآن ہونا ثابت ہو سکتا ہے اسی ذریعے سے سنت کا سنت ہونا ثابت ہے۔ پھر کیوں ایک ہی ذریعے سے حاصل شدہ دو حقیقتوں میں سے ایک حقیقت کو مان لینا اور دوسری حقیقت کا انکار کر دینا جائز ہو سکتا ہے؟ وہ اگر گواہ کو سچا اور ثقہ تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس کی آدھی گواہی کو کیوں درست قرار دیتے اور آدھی گواہی کو کیوں غلط قرار دیتے ہیں؟ اور کیا ایسا طرزِ عمل علمی اور معقول ہو سکتا ہے؟ اسے تو صرف ہٹ دھرمی اور جھگڑالو پن کہا جائے گا۔

یاد رکھئے! جو شخص آج سنت کی حجیت (AUTHORITY) سے انکار کرتا ہے وہ در اصل قرآن کی حجیت (AUTHORITY) سے انکار کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جو آدمی سنت کو نہیں مانتا وہ در حقیقت قرآن کو بھی نہیں مانتا۔ یہ گروہ اصل میں دل میں اسلام کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے من کی حکمرانی کو

تسلیم کرتا ہے لیکن قرآن کا نام اس لئے لیتا ہے تاکہ اسے کہیں بے دین، ملحد اور مغرب زدہ قرار نہ دیا جائے اور پھر دین کے بارے میں ان کی رائے بے وزن نہ ہو جائے۔ قرآن مجید کی من مانی تفسیر کرکے اسے موم کی ناک بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ تجدد پسند لوگ دین کو اپنا رہبر نہیں اپنا پیرو کار سمجھتے ہیں۔

پھر اس گروہ کی طرف سے موجودہ حالات میں پارلیمنٹ یا نام نہاد "مرکز ملت" کو اسلامی قانون سازی کا اختیار دینا بھی محل نظر ہے۔ ہمارے یہاں دولت ذات برادری اور دوسرے ذرائع اثر و رسوخ کے بل بوتے پر جس طرح کے لوگوں کی اکثریت اسمبلیوں میں جاتی ہے اور جن کی تعلیم اور جن کے کردار کا کوئی مناسب معیار مقرر نہیں ہوتا۔ کیا ایسے لوگ اس بات کے اہل ہیں کہ وہ اسلامی قانون سازی کی ذمہ داری اٹھا سکیں؟ اگر وہ اس کے اہل ہیں تو پھر دنیا میں کوئی کسی کام کے لئے نا اہل نہیں ہے۔

پھر اس گروہ کا یہ خیال کہ دینِ اسلام پر مُلّا کی اجارہ داری ہے جسے ختم کیا جانا ضروری ہے، ایک نہایت لغو خیال ہے۔ ہمارے ملک کا ملّا بھارت کا برہمن نہیں ہے کہ اس نے دوسرے لوگوں کے لئے علم و عمل کے دروازے بند کر رکھے ہوں یا اگر ہمارا کوئی مرد یا ہماری کوئی عورت علمِ دین سیکھنا چاہے تو ملّا اسے اس کا موقع فراہم نہیں ہونے دیتا۔

رہی یہ بات کہ دین اسلام کی تشریح و تعبیر کا حق صرف علمائے دین کو حاصل ہے تو یہ ایک معقول بات ہے اور اسے یوں کہنا کہ دین پر ملّا کی اجارہ داری ہے ایک نامعقول بات ہے۔ اگر دین پر ملّا کی اجارہ داری ہے یا پھر یہاں کون سا کام ہے جس پر مخصوص لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔ کیا علاج معالجے پر اطباء اور ڈاکٹروں کی، آئین و قانون کی تشریح و تعبیر پر وکلاء اور ججوں کی، انجینئرنگ پر انجینئروں کی، ہوائی جہازوں کو چلانے پر پائلٹوں کی، صنعت سازی پر صنعت کاروں کی، زمین کاشت کرنے پر کاشت کاروں کی اور مزدوری کرنے پر مزدوروں کو اجارہ داری حاصل نہیں ہے؟ پھر اگر ان تمام اجارہ داریوں کے خلاف کوئی نہیں بولتا اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی تحریک چلاتا ہے تو بعض لوگ صرف ملّا کی اجارہ داری پر کیوں سیخ پا ہوتے ہیں؟

پھر جس طرح دوسرے کاموں اور شعبوں میں مناسب اہلیت پیدا کرکے ہر شخص حصّہ لے سکتا ہے اور اس کی رائے کو اہم اور وقیع سمجھا جائے گا تو اسلامی قانون اور دینی معاملات کو سمجھنے کی اہلیت پیدا کرنے والے ہر آدمی کو دین کے بارے میں رہنمائی کا منصب کیوں حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کی رائے کو کیوں معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔

الغرض اس گروہ کا یہ نقطۂ نظر کسی طرح بھی معقول اور مناسب نہیں ہو سکتا اور اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کو دور کرنے کے ان کی طرف سے پیش کردہ حل کسی طور پر بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ تو دینی اور الحاد کو دین سمجھنا اور ضلالت کو ہدایت گردانا ہے۔

۲- دوسرے گروہ کی رائے اور اس کا جائزہ

بعض لوگوں کے نزدیک اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کو حل کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ سرے سے کسی فقہ ہی کو تسلیم نہ کیا جائے، نہ کوئی فقہ مدون کی جائے اور نہ ہی نافذ کی جائے۔ صرف حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہو کہ آج سے ملک میں کتاب و سنت کا قانون چلے گا اور باقی قوانین از خود کالعدم قرار پائیں گے۔ کتاب و سنت کے قانون کی تشریح و تعبیر علمائے دین اور قاضی حضرات کیا کریں گے جو اپنی بصیرت اور صوابدید کے مطابق ہر معاملے کا فیصلہ کتاب و سنت کی روشنی میں فرمایا کریں گے۔ بس اللہ اللہ خیر سلّا، نہ اسلامی قانون کی تدوین (CODIFICATION) کی ضرورت ہے اور نہ سابقہ فیصلوں کو محفوظ رکھ کر انھیں نظائر PRECEDENTS بنانے کی حاجت ہے۔

اس نقطۂ نظر کا حامل گروہ اپنے موقف کے حق میں دورِ صحابہ کی مثال دیتا ہے کہ اس دورِ مبارک میں نہ تو کوئی معین فقہ رائج تھی، نہ کوئی فقہ مدون کی گئی تھی۔ فقط کتاب و سنّت ہی دستور و قانون تھا اور قاضی حضرات اس کے مطابق تمام معاملات میں فیصلے صادر فرمایا کرتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس گروہ کی رائے کے مطابق فقہی اختلافات واقعی ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جب کوئی فقہ ہی باقی نہ رہے گی تو فقہی اختلاف کہاں سے پیدا ہوگا۔ گویا "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" والا معاملہ ہوگا۔

یہ گروہ ایک اور دلیل بھی پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فقہ کی تدوین کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت میں جو توسع اور رخصتیں موجود ہیں وہ بھی تدوین فقہ کے بعد ختم ہو جائیں گی۔ اس میں منشائے شریعت پورا نہیں ہوگا اور ہم اللہ کی دی ہوئی اس نعمت سے محروم ہو جائیں گے۔ قاضی مجبور ہوں گے کہ صرف مدون قانون کی پیروی کریں خواہ ان کو حق و انصاف اس کے باہر نظر آئے۔ یوں عدل کا تقاضہ بھی کما حقہٗ پورا نہیں ہوگا۔

لیکن پیش آمدہ مسئلے کا یہ حل بھی صحیح نہیں ہے اور اس میں بھی بہت سی عملی پیچیدگیاں ہیں جن کو دور کرنا آج کے دور میں ممکن نہیں ہے مثلاً:

۱۔ آج دورِ صحابہ جیسے علم و تفقہ اور تقویٰ کے حامل قاضی صاحبان کہاں سے ملیں گے جو اتنی مجتہدانہ بصیرت کے مالک ہوں کہ کتاب اللہ کے احکام پر کامل استحضار رکھتے ہوں۔ احادیث کے پورے ذخیرے پر جن کی گہری نظر ہو اور جو کتاب و سنت کے توسعات اور رخصتوں میں سے بھی مناسب اور عادلانہ تعبیر کو اختیار کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں اور پھر ہر معاملے میں حق کو معین بھی کر سکتے ہوں۔ اگرچہ ایک بہتر نظام تعلیم اور اصلاح یافتہ معاشرہ آج بھی اچھے اور قابل افراد پیدا کر سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج معاذ بن جبلؓ اور قاضی شریح جیسے جج پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے آج کی عدالتوں کی سہولت اور رہنمائی کے لئے فقہ اسلامی کی تدوین ضروری ہے اور قانون کی تعلیم اور نصاب بھی اس ضرورت کا تقاضہ کرتا ہے۔ تدوین فقہ سے شریعت کی وسعت بھی تنگ نہیں ہو گی بلکہ آج کے دور میں علم و کردار کے عام زوال کی وجہ سے نفاذ شریعت کا عمل آسان ہو جاتا ہے پھر بھی اگر ایک قاضی مدون قانون سے ہٹ کر فیصلہ کرنا چاہے تو اسے غور کرنا چاہئے کہ یہ اس کی انفرادی رائے اور تفرد ہے اور ایک جماعت علماء کے مدون قانون سے بڑھ کر اس کی اہمیت نہیں ہو گی اور اقرب الی الصواب اور محفوظ راہ بہر حال جماعت ہی کی ہو سکتی ہے نہ کہ ایک فرد کی۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ جو فقہ بھی مدون ہو گی وہ علمائے دین اور ماہرین قانون کے ایک قلیل گروہ ہی کی طرف سے ہو گی گویا یہ مدون قانون بھی ایک طرح کا اجتہاد ہو گا جو ایک اقلیت کے ہاتھوں مسلمانوں کی اکثریت پر نافذ ہو گا۔ لیکن یاد رہے کہ تدوین فقہ اگر نئے سرے سے اجتماعی طور پر ہو اور اہل علم و تفقہ کے ذریعے ہو اور ملک کے ارباب حل و عقد کی تائید سے ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک ملک کے علماء کا اجماع اس ملک کے عامۃ المسلمین کے لئے ناقابل قبول ہو بلکہ یہ کام بالکل جائز اور شریعت میں عین مطلوب ہے کیونکہ ایک علاقے کے علماء کا اجماع وہاں کے لوگوں کے لئے حجتِ شرعی کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ کسی مدون قانون اسلامی کے بغیر ایک جیسے مقدمات میں بھی عدالتی فیصلے مختلف غیر یکساں اور ناہموار طریقے سے ہوں گے۔ اور زیادہ امکانات اور توسعات کی موجودگی میں اس دور کے قاضیوں کے لئے بدعنوانی کے مواقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

۳- تیسرے گروہ کی رائے اور اس کا جائزہ

تیسرے گروہ کے نزدیک اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کے حل کا یہ طریقہ ہے کہ چونکہ فقہ حنفی کو اس ملک کی اکثریت تسلیم کرتی ہے اور اس کی پیروکار ہے لہذا قانون ملکی (PUBLIC LAW) فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہیئے اور یہاں پر فقہ حنفی نافذ کردی جائے اور باقی اہلِ مسالک کے شخصی معاملات ان کے قانونِ شخصی (PERSONAL LAWS) کے مطابق طے کئے جائیں۔

یہ گروہ اپنے حق میں بعض مسلمان ممالک کی مثالیں دیتا ہے کہ جہاں اکثریت کی فقہ نافذ ہے مثلاً ہمارا ہمسایہ ملک ایران ہے جہاں ملکی قانون شیعی اکثریت کی فقہ کے مطابق ہے اور شخصی قانون میں اقلیتی گروہ۔ اہل سنت کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔

لیکن اس حل سے بھی زیر بحث مسئلہ حل نہیں ہوتا اور اس کے نتیجے میں بھی الجھنیں پیش آتی ہیں جن کا تدارک ممکن نہیں ہے۔

۱۔ اگرچہ ہمارے ملک میں فقہ حنفی کے پیروکاروں کی اکثریت ہے لیکن دو اہم گروہ۔ اہل حدیث اور شیعہ۔ فقہ حنفی کو تسلیم نہیں کرتے، لہذا فقہ حنفی کے نفاذ سے ان دونوں طبقوں میں قدرتی طور پر بے چینی پیدا ہو گی اور یہ بے چینی اتحاد ملت کے لئے بہت نقصان دہ ہو گی۔

۲۔ فقہ حنفی کے نفاذ سے مذکورہ بالا دونوں طبقے یہ تاثر لیں گے کہ پھر ملکی دستور و قانون میں ان کی حیثیت ایک غیر مسلم اقلیت سے بڑھ کر نہیں رہتی۔ کیونکہ جہاں تک شخصی قانون کا تعلق ہے، تو اس کے تحفظ کا حق یہاں کی تمام غیر مسلم اقلیتوں کو حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں مسلم گروہوں کو اپنی اس پوزیشن کے اندر اپنے لئے توہین و احتقار کا پہلو نظر آئے گا جس کا نتیجہ کسی صورت میں بھی خوشگوار نہیں ہو سکتا۔ لہذا فقہ حنفی کا نفاذ بھی ہمارے ہاں کے فقہی اختلافات کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

ہماری رائے

ہمارے نزدیک ملک میں اسلامی قانون سازی کی راہ میں حائل فقہی اختلافات کو دور کرنے کا صحیح اور محفوظ طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک قانون ملکی کا تعلق ہے وہ صرف اکثریتی گروہ۔ اہل سنت (جس میں احناف اور اہل حدیث شامل ہیں) کے عقائد و نظریات

پر مبنی ہونا چاہئے کیونکہ اہلسنت اور اہل تشیع کا اختلاف صرف فقہی ہی نہیں بلکہ اعتقادی بھی ہے لہذا اس الجھن کا علاج سوائے اس کے ممکن نہیں ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ اور عہد حاضر میں یہ ایک معقول طریقہ ہے جسے بالعموم ہر جگہ اختیار کیا گیا ہے کہ قانون ملکی اکثریتی گروہ کے معتقدات ونظریات کے مطابق ہونا چاہئے۔ ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہاں کا قانون ملکی شیعی نظریات کا آئینہ دار ہے۔ لہٰذا ہمارے ملک کا قانون ملکی بھی اہل سنت کی اکثریت کے اعتقادات کا آئینہ دار ہونا چاہئے اور اقلیتی گروہ کو شخصی معاملات میں آئینی تحفظات حاصل ہونے چاہئیں۔

دوسری طرف اہل سنت کے تمام گروہوں کو اپنا ایک ہی او شخصی قانون بنانے کے لئے اپنے اپنے نمائندہ معتمد اور مستند علمائے دین پر مشتمل ایک مجلس یا بورڈ تشکیل دینا چاہئے جس میں جدید ماہرین قانون بھی شامل ہوں اور یہ اسلامی مجلس قانون ساز ہر قسم کے گروہی اور فقہی تعصبات سے بالاتر ہو کر ملکی قانون بنانے کے لئے ایک نئی اسلامی فقہ کا مجموعہ مدون کرے جس کے رہنما اصول یہ ہوں۔

۱۔ کتاب وسنت کو بنیادی ماخذ قانون بنایا جائے اور نصوص پر مبنی تمام احکام وقوانین ایک ضابطہ تیار کیا جائے۔

۲۔ اجماع صحابہ اور اجماع امت کے تمام فیصلے، جن میں ائمہ مجتہدین کی متفقہ آرا بھی شامل ہوں، ان سب کو شریعت کا قانون قرار دے کر مدون کیا جائے۔

۳۔ اس کے علاوہ اختلافی اور جدید مسائل کو حل کرنے کے لئے مذکورہ مجلس علمائے امت کے اجتہادات کی روشنی میں اپنے فیصلے صادر کرے اور یہ فیصلے بھی نئے مجموعہ قوانین میں شامل کئے جائیں۔

اس کے بعد قاضی حضرات تمام معاملات میں فیصلہ دینے کے لئے کتاب وسنت کے نصوص، اجماع صحابہؓ اجماع امت، ائمہ مجتہدین کی متفقہ آراء اور اسلامی مجلس قانون ساز کے فیصلوں کے پابند ہوں۔ دوسرے الفاظ میں ان تمام نہج شرعیہ پر مبنی نئے مجموعہ قوانین کی پابندی تمام قاضی صاحبان کے لئے لازم ہو۔

اس کے علاوہ باقی امور میں نئے حالات کے اندر قاضی حضرات اسلامی مجموعہ قوانین کی روشنی میں آزادانہ فیصلے دینے کے مجاز ہوں۔

حاصل یہ کہ ہمارے یہاں اسلامی قانون سازی میں فقہی اختلافات کو حل کرنے کے لئے نہ تو یہ طریقہ صحیح ہے کہ صرف قرآن مجید کو ماخذ قانون قرار دے کر ہر اہل ونااہل کو اس کی تشریح وتعبیر کا حق دے دیا جائے

نہ ہی آج یہ طریقہ مناسب ہے کہ بغیر کوئی مجموعۂ قوانینِ اسلامی مرتب کئے موجودہ دور میں ججوں اور قاضیوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ صرف کتاب و سنّت کی روشنی میں ہر قسم کے معاملات کا فیصلہ دیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ فقہ حنفی کو اکثریت کا مسئلہ سمجھتے ہوئے نافذ کیا جائے بلکہ ہمارے موجودہ حالات میں قابلِ عمل، محفوظ اور اقرب الی الصواب طریقہ یہی ہے کہ اعتقادی اختلاف رکھنے والے شیعہ گروہ کے شخصی قانون کو آئینی تحفظ دے کر اہلِ سنّت (احناف اور اہل حدیث) کے عقائد و نظریات پر مبنی ملکی قانون از سرِ نو مدون کیا جائے۔ اس کے لئے اہلِ سنّت کے تمام گروہوں کے علماء اور ماہرینِ قانون ہر قسم کے فقہی اور گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر چند متفقہ رہنما اصولوں کے مطابق (جن کی وضاحت اوپر بیان کی گئی ہے) جرأت اور حوصلے کے ساتھ ایک نیا مجموعۂ قوانینِ اسلامی مرتب کریں۔

ہم ساری رائے میں صرف اسی طریقے سے اپنی موجودہ مشکل کو حل کر سکتے ہیں اور پاکستان میں صحیح اسلامی قانون و شریعت کو نافذ کر سکتے ہیں لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر یہاں پر ہمیشہ طاغوت کے قانون کی حکمرانی رہے گی تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ جنوبی ایشیا میں ایک ایسی مسلمان قوم آباد تھی جس نے اسلام اور اسلامی قانون کے نفاذ کی خاطر بے شمار قربانیاں دے کر پہلے ایک آزاد ملک حاصل کیا اور پھر اپنی نااہلی اور نااتفاقی کی وجہ سے اس ملک میں نفاذِ اسلام سے قاصر رہی اور ہر معاملے میں غیروں کی محتاج اور دستِ نگر بن گئی

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ" — بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

بقولِ حالی مرحوم: ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

پہلی قسط

مسئلۂ کفاءت

مجیب اللہ ندوی

نسبی اور خاندانی برتری کے احساس اور تفاخر میں پہلے کے مقابلے اب مسلمانوں میں بہت کمی آگئی ہے اور برادریوں کی جو مصنوعی دیوار قائم ہوگئی تھی وہ گری تو نہیں مگر ذہنی طور پر بڑی حد تک کمزور ضرور ہوگئی ہے مگر خاندانی اور نسبی تفاخر کی جگہ اب سیاسی و معاشی برتری، مال و دولت کی خواہش اور تعلیم کی ہم آہنگی اور حسن و جمال نے لے لی ہے۔ اور ادھر کچھ دنوں سے سیاسی مفاد کے پیش نظر حکمراں طبقہ کے لوگ برادریوں کی تقسیم اور طبقاتی عصبیت کو نئے سرے سے ہوا دیئے جا رہے ہیں جس سے نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ دین و اخلاق ہمارے پاکستانی و ہندوستانی مسلم معاشرے میں نہ تو پہلے معیار شرافت تھا نہ اب ہے۔ خاص طور پر اس وقت غیر مسلموں کا ایک طبقہ جو غیر مسلم معاشرہ سے دور ہو کر اسلامی معاشرہ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس میں بہت سے اسباب کے ساتھ معاشرتی اونچ نیچ اور اونچی ذات کے ہندوؤں کا نسبی تفاخر سب سے بڑا محرک دکھائی دے رہا ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے اندر سے اس ذہنیت کو ختم کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ اور تنگی و نسبی تفاخر محسوس نہ ہو جس سے وہ بیزار ہو کر اس نئے معاشرہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس مضمون میں اسی پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شریعت نے شادی بیاہ میں برابری (کفائت) کا جو لحاظ کیا ہے اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور اس کے بارے میں ائمہ فقہ کی رائے کیا ہے؟

میاں بیوی کے تعلقات کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار استوار بنانے اور اس میں زیادہ محبت و مودت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے شریعت نے نکاح میں دوسری قیود کے ساتھ یہ بھی قید لگادی ہے کہ رشتہ قائم کرنے میں دینی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی مناسبت کا بھی لحاظ کیا جائے ورنہ اس رشتہ میں استواری اور

خوشگواری پیدا ہونا مشکل ہے اور جب یہ بات نہ پیدا ہوگی تو پھر نکاح کا اصل مقصد یعنی ایک اچھے خاندان کا وجود میں آنا فوت ہو جائے گا۔ اسی مناسبت اور برابری کو اسلامی شریعت میں کفاءت کہتے ہیں۔ کفاءت کے لفظی معنی برابری کے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بھی کفاءت کا لحاظ فرمایا ہے اس کا حکم بھی فرمایا ہے:

تخیروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء۔ (ابن ماجہ) — اپنے لطفہ کے لئے (اچھی لڑکی کے) رشتہ کا انتخاب کرو اور اپنی برابری کے لوگوں میں شادی بیاہ کرو۔

مگر آپؐ نے ایک دوسری حدیث میں برابری کی یہ تشریح فرمائی ہے:

اذا جآءکم من ترضون دینہ وخلقہ فانکحوا۔ (جامع الترمذی وغیرہ) — جب تمہارے پاس ایسے لڑکے کا رشتہ آئے جس کے دین واخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو لڑکی کا نکاح اس سے کردو۔

یہ کفاءت اور مساوات کن کن چیزوں میں ہونی چاہئے؟ مختلف احادیث اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں ائمہ اربعہ کی رائیں اس میں مختلف ہو گئی ہیں جن کی کچھ تفصیل یہ ہے:

کفاءت کن چیزوں میں ہونی چاہئے

ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نکاح میں کفاءت (برابری) مندرجہ ذیل پانچ یا چھ چیزوں میں ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) اسلام (۲) دیانت وتقویٰ (۳) نسب (۴) مال (۵) پیشہ (۶) مرض[1] اور عیوب سے خالی ہونا۔

مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ صرف دو چیزوں میں برابری کا لحاظ کرتے ہیں ایک[1] دین یعنی ان کا دین وایمان درست ہو دوسرے[2] صلاح وتقویٰ یعنی بداخلاق و بدکردار نہ ہوں۔

بعض تمدنی ومعاشرتی مصالح کے پیش نظر ائمہ ثلاثہ نے دین واخلاق کے ساتھ دوسری چیزوں میں بھی برابری کا لحاظ کیا ہے لیکن امام مالکؒ کی رائے میں ایک مسلمان کے لئے اصل چیز دین اور صلاح وتقوےٰ ہے اس سے برابری بھی پیدا ہوتی اور اسی سے مناسبت بھی۔ اس لئے ان دو خوبیوں کے بعد اب تیسری کسی

---

[1] مستقل مرض اور عیوب جسمانی سے خالی ہونے کی شرط کا تعلق نفس کفاءت سے نہیں ہے بلکہ اس کا لحاظ ہر صورت میں کیا جائے گا۔ امام مالکؒ کے نزدیک بھی ان اعذار کا لحاظ کیا جائے گا۔

چیز کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دوسری چیزیں بھی حاصل ہوں تو فبہا، مگر ان کے نزدیک وہ انتخاب کا معیار نہ بنائی جائیں۔ جہاں تک ائمہ ثلاثہ کی رائے کا تعلق ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اسلام سے ذہنی اور عملی لگاؤ کو ضروری قرار نہیں دیا ہے بلکہ انھوں نے دین کے ساتھ بعض دوسری چیزوں کا لحاظ اس لئے کیا ہے کہ تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کا بالکل خیال نہ کیا جائے تو میاں بیوی میں الفت و محبت کی روح پیدا نہیں ہوگی۔ ایسا نہیں ہے کہ ائمہ ثلاثہؒ ایک ممتاز سید یا صدیقی خاندان کے فاسق و فاجر لڑکے کو دوسرے کسی غیر ممتاز سید یا صدیقی یا فاروقی خاندان کے نیک اور دیندار لڑکے پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک ایک خاندان میں بھی اسی لڑکے یا لڑکی کو ترجیح دی جائے گی جو دیندار بھی ہو اور جس کا اخلاق و کردار اچھا ہو۔ کفارت میں ائمہ ثلاثہؒ نے جن چیزوں کا لحاظ کیا ہے ہم ان میں سے ہر ایک کی تشریح کرنے کے بعد پھر امام مالکؒ کی رائے اور ان کے دلائل بیان کریں گے۔

۱- اسلام یعنی عورت و مرد کے رشتہ نکاح میں سب سے پہلے جو چیز دیکھی جائے گی وہ یہ ہے کہ دونوں عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہیں یا نہیں اگر اسلام کا رشتہ ان دونوں میں نہیں ہے تو پھر رشتہ نکاح قائم نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص جو قدیم زمانہ سے کافر و مشرک ہے اور ایک شخص مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتے ہوئے اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ سے منحرف ہو گیا ہے تو نکاح کے معاملہ میں یہ دونوں برابر ہیں۔ ان کے ساتھ یہی نہیں کہ کسی مسلمان لڑکی کے ساتھ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ نکاح کے سلسلے میں وکیل اور گواہ بھی نہیں بن سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکی عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان نہ ہو تو کسی مسلمان لڑکے سے اس کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔

۲- دیانت و تقویٰ دیانت و تقویٰ میں برابری کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی صرف عقیدے کے اعتبار سے مسلمان ہے مگر اس کا عمل اس کے عقیدہ و فکر کے مخالف ہے تو وہ لڑکی یا لڑکا اُس لڑکی یا لڑکے کے (کفو) برابر نہیں ہو سکتے جس کا عقیدہ بھی درست ہو اور عمل بھی، جو ذہنی و فکری اعتبار سے بھی مسلمان ہو اور عملی اعتبار سے بھی۔ چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

لانہ من اعلی المفاخر والمرأۃ تعیر بفسق الزوج فوق ما تعیر بضعۃ نسبہ۔
(ہدایہ صفحہ ۳۰۱۔ جلد ۲ کتاب النکاح)

کیونکہ دیانت و تقویٰ سب سے زیادہ عزت و فخر کی چیز ہے اور عورت کے لئے شوہر کا کم نسب ہونا اگر عار کی بات ہے تو اس کا فاسق و فاجر ہونا اس سے زیادہ عار کی بات ہے۔

غور کیجئے، وہ فقہاء جنھوں نے رشتہ نکاح میں نسب وخاندان کا لحاظ رکھا ہے انھوں نے بھی اسلام پر عقیدے کے ساتھ اس کے مطابق عمل کو کتنا ضروری قرار دیا ہے مگر ہندوستانی و پاکستانی مسلمانوں میں نسب ہی کی اہمیت باقی رہ گئی ہے اور دین و تقویٰ ان کے نزدیک کوئی قابلِ لحاظ چیز ہی نہیں رہ گئی ہے۔ بلاشبہ یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے، قدیم جاہلیت کا بقیہ ہے۔

۳۔ مال کفوء کے سلسلے میں مال کا بھی اعتبار کیا گیا ہے یعنی لڑکی اگر مالدار اور خوش حال گھرانے کی ہو تو حتی الامکان اس کا رشتہ کسی مفلس، قلاش، بے صلاحیت کے ساتھ نہ کرنا چاہیئے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک کسی دولت مند اور لکھ پتی کا لڑکا نہ ملے اپنی لڑکی بٹھائے رکھے اور مال کے لحاظ سے کم درجہ کے آدمی سے اس کا نکاح نہ کرے، بلکہ مال کے لحاظ کا مطلب صرف یہ ہے کہ

وھو ان کان مالکا للمھر والنفقۃ۔ (ہدایہ ص۳۰۱، ج ۲ ۔ کتاب النکاح)	جو لڑکا مہر ادا کرنے اور بیوی کا خرچ اٹھانے کی قدرت رکھتا ہو وہ مالدار لڑکی کا کفوء ہو سکتا ہے۔

یعنی اگر نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی کی صلاحیت اور ایک مہینہ تک کا خرچہ اس کے پاس موجود ہے تو ایسا شخص مالدار لڑکی کا کفوء ہے اور اگر اس وقت اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو مگر بظاہر اس میں یہ صلاحیت موجود ہے تو صحیح اور راجح قول کی بنا پر وہ بھی مالدار لڑکی کا کفوء ہو سکتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے:

الصحیح انہ اذا کان قادراً علی النفقۃ علی طریق الکسب۔ (ہدایہ ۔ ج ۲ ص۳۰۲)	صحیح یہ ہے کہ جب وہ کما کر بیوی کو کھلانے پہنانے پر قادر ہو تو اس کا کفوء ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ردالمحتار میں ہے:

وصحیح فی المجتبیٰ الاکتفاء بالقدرۃ علیھا بالکسب۔	مجتبیٰ میں اس قول کو صحیح کہا گیا ہے کہ صاحب مال لڑکی کے کفوء ہونے کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ کما کر بیوی کا خرچ اٹھانے کی قدرت وصلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔ پیشہ ایک پیشے کے لوگوں کا رہن سہن اور طرز معاشرت عموماً ایک ہی طرح کا ہوتا ہے اس لئے اپنے پیشے والوں کے یہاں شادی بیاہ کرنے میں سہولت بھی ہوتی ہے اور میاں

بیوی میں اس کی وجہ سے مناسبت بھی رہتی ہے اور بسا اوقات ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے معاشی اعتبار سے بھی دونوں کو سہولت ہوتی ہے اس لئے ائمہ ثلاثہ نے رشتہ نکاح میں اس کا اعتبار و لحاظ کرنے کی بھی اجازت دی ہے مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ کسی پیشہ کے ساتھ ذلت اور کسی پیشے کے ساتھ عزت چمٹی ہوئی ہے کہ جہاں کسی نے دو ایک پشت کوئی خاص پیشہ کیا بس وہ ذلیل ہو گیا، اب وہ کتنی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو جائے پیشے کی ذلت اس کے ساتھ لگی رہے گی۔ چنانچہ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت زیادہ صحیح طریقہ سے مروی ہے وہ یہی ہے کہ دائمی طور پر یہ کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

ان الحرفة لیس بلازمة ویمکن التحول من الخسة الی النفیسة۔	پیشہ کسی کے ساتھ چمٹا نہیں رہتا بلکہ ایک آدمی معمولی پیشہ چھوڑ کر دوسرا کوئی پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ پیشوں کا معیار زمانہ کے حالات کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک پیشہ جو کسی زمانہ میں صرف پست درجہ کے اور جاہل لوگ اختیار کرتے رہے ہوں وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کا پیشہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ حالاتِ زمانہ کی تبدیلی سے اہلِ علم اور باعزت لوگ بھی اس کو کرنے لگیں۔ ہمارے زمانہ میں یہ ہو رہا ہے کہ جوتا بنانا نہایت گھٹیا لوگوں کا پیشہ تھا لیکن اب اہلِ علم اور گریجویٹ اور شرفاء اس طرح کا کام کر رہے ہیں۔ اس لئے کسی پیشہ کو ذلیل سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

۵۔ نسب نسب کے شرف اور اس کی فضیلت کا اعتبار بھی شریعت میں کیا گیا ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شرف اور فضیلت دائمی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ یعنی یہ سمجھ لینا کہ فلاں خاص برادری کے اندر جو پیدا ہو گیا ہے وہ ہمیشہ ذلیل رہے گا اور جو ایک دوسرے خاندان کے اندر پیدا ہو گیا وہ ہمیشہ اور بہر حال معزز ہی رہے گا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ جاہلی تصور تھا جس کی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مذمت فرمائی ہے۔ آپ نے اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا:

قد اذھب عنکم عبیة الجاھلیة وفخرھا بالآباء انما ھو مومن تقی او فاجر شقی۔	اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا کبر و نخوت اور آباء و اجداد پر فخر کو مٹا دیا ہے۔ اب انسانوں کے دو ہی طبقے ہیں یا تو وہ پاکباز مومن ہوگا یا پھر بدبخت گناہ گار۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، ترمذی باب المفاخرۃ)

شرعی نقطۂ نظر سے نسب کا یہ شرف اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک اس میں شرف و فضیلت

کے اوصاف باقی رہیں۔ عام طور پر ہندوستان اور پاکستان میں برادریوں اور خاندانوں کی پیشوں اور معاشرتی تفاوت یا نسبی تعلق کی بنا پر جو تقسیمیں ہو گئی ہیں مثلاً کوئی سید ہے، کوئی شیخ صدیقی اور فاروقی ہے کوئی مغل ہے، کوئی پٹھان ہے، کوئی عراقی ہے کوئی نداف یا راعی ہے، کوئی انصاری یا جولاہا ہے کوئی درزی اور کوئی موچی ہے، کوئی چق اور کوئی قصائی ہے۔ پیشے، کام یا نسب کی اس تقسیم کو ایک ایسی مستقل چیز سمجھ لیا گیا ہے کہ خواہ دوسری برادری اور خاندان کا کوئی کتنا ہی پڑھا لکھا اور صالح لڑکا یا لڑکی کیوں نہ ہو اس کا نکاح کسی دوسری برادری کے لڑکے یا لڑکی سے کرنا ننگ و عار سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض برادریوں میں تو ایسا شخص برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کی روح کے بالکل منافی ہے اور جن ائمہ اور فقہاء نے اس کا کسی درجہ میں اعتبار کیا ہے انھوں نے بھی اس کو کوئی دائمی چیز نہیں سمجھا ہے۔ اوپر اس سلسلہ میں ہدایہ کی عبارت ہم نقل کر چکے ہیں۔ فقہ حنفی کی دوسری مشہور کتاب درمختار میں مذکور ہے کہ اگر چمڑا پکانے والا اپنا پیشہ چھوڑ کر تجارت کرنے لگے تو وہ خصوصیات جن کی بنا پر اس کی حیثیت کو کمتر سمجھا جاتا ہے اس میں باقی نہ رہیں تو وہ پھر کسی بھی تاجر کا کفو ہو سکتا ہے۔ (ص ۱۲۹۸ : ج ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی پیشہ کی وجہ سے نسب میں ذلت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان خصوصیات کی وجہ سے ذلت پیدا ہوتی ہے جو اس پیشے کے ساتھ مخصوص ہو گئی ہیں مثلاً رہن سہن، بات چیت وغیرہ میں جہالت علم و فضل کی کمی وغیرہ، لیکن اگر کوئی اس پیشے کو ان خصوصیات سے پاک کر دے تو پھر وہ اس کا مصداق قرار نہیں دیا جائے گا چنانچہ اگر نسب کے اعتبار سے ایک شخص سید یا صدیقی ہو مگر جاہل یا بدکردار ہو، دوسرا پٹھان، انصاری، درزی یا اور کسی برادری کا ہو مگر صاحب علم و فضل اور صالح ہو تو کفو کے اعتبار سے اس جاہل صدیقی سے بڑھا ہوا سمجھا جائے گا۔ صاحب ردالمحتار اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وکیف یصح لاحد ان یقول ان مثل ابی حلیفة والحسن البصری وغیرھا ممن لیس بعربی انہ لا یکون کفواً لبنت قرشی جاھلٍ اولبنت عربی بوّالٍ علی عقبیہ۔

یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما جیسے ائمہ جو عربی النسل نہیں ہیں وہ کسی جاہل قریشی یا کسی ایسے عربی بدو کی لڑکی کے کفو نہیں ہو سکتے جس کو پیشاب کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے؟

(ج ۲ صفحہ ۳۳۱-۳۳۲، طبع مصر ۱۳۲۳ھ)

پھر لکھا ہے کہ اسی رائے کو ابن ہمام صاحب فتح القدیر اور صاحب النہر وغیرہ نے بھی اختیار کیا اور پسند کیا ہے۔ صاحب فتح القدیر، امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رح کی صحیح رائے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فلو تزوجت امرأة من بنات الصالحین فاسقا کان للاولیاء فسخه۔

اگر کسی صالح آدمی کی لڑکی کا نکاح کسی فاسق وفاجر سے کر دیا جائے تو ولی کو اس کو فسخ کرنے کا اختیار ہو گا۔

ان فقہی تصریحات سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جن ائمہ اور فقہاء نے نسب، مال اور پیشے کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک بھی ان کی حیثیت مستقل نہیں بلکہ اضافی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان وغیرہ میں کام اور پیشہ کی وجہ سے برادریوں اور خاندانوں کی مستقل طور پر جو تقسیم ہو گئی ہے اور یہ تقسیم مستقل اور دائمی طور پر عزت و شرف کا سبب بن گئی ہے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے اور اس کی اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے مگر یہ کام حکمت سے اور تدریجی طور پر ہی ہو سکے گا۔ دین کے ساتھ خاندانی مزاج اور طرز معاشرت وغیرہ کو یک لخت نظر انداز کر دینے میں دوسرے مفاسد کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے اور اس سے اچھے اور پاکیزہ معاشرہ کی بنیاد پڑ جانے کے بجائے اس میں کمزوری اور ناخوشگواری آنے کا اندیشہ ہے اس لئے اس بگڑی ہوئی صورت حال کی اصلاح کے لئے جو سعی و کوشش ہو گی اس میں حکمت اور تدریج کا قدم قدم پر لحاظ رکھنا ہو گا جس طرح آج بھی عرب ممالک اور ملیشیا وغیرہ میں نسب خاندان اور برادری کی اس تقسیم کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں کے اثر سے ہمارے اندر یہ چیزیں پیدا ہوئیں جیسے زمینداری اور جاگیرداری کے تفاخر نے مزید ہوا دی۔ چنانچہ جہاں جہاں زمینداری سسٹم رہا ہے ان ہی صوبوں میں یہ چیز زیادہ ہے۔ دوسرے صوبے کے مسلمانوں میں یہ چیز بہت کم ہے یا بالکل نہیں ہے۔

امام مالک رح کا نقطۂ نظر

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام میں اگر کسی انسان کو عزت و شرف کا مستحق قرار دیا گیا تو وہ دین و تقویٰ کے لحاظ سے محض نسب، مال یا حسن و جمال اور پیشے کی وجہ سے کسی کو صاحب عزت و شرف قرار نہیں دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:

یاایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تم کو مختلف قوموں اور خاندانوں میں بانٹ دیا تاکہ

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (حجرات) | اس امتیاز کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان سکو اللہ کے یہاں تم میں سے وہی زیادہ معزز و مکرم ہے جو زیادہ متقی و پرہیز گار ہے۔

یعنی جغرافیائی تقسیم یا اختلاف زبان کی وجہ سے یا تمدن کی ایک بنیادی ضرورت تقسیم عمل اور پیشہ کی وجہ سے جو لوگ مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بٹ گئے ہیں وہ تقسیم محض ایک تعارف کے لئے ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانا اور ان کی خصوصیات کو معلوم کیا جا سکے۔ اس تعارف کی وجہ سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون قریب ہے کون بعید ہے اور اسی علم کی بنا پر اعزہ واقارب کے حقوق کی ادائیگی کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے ورنہ یہ تقسیم شرف وعزت کا ذریعہ نہیں ہے۔ نہ مغربی کو مغربی ہونے کی وجہ سے مشرقی پر شرف و فوقیت ہے، نہ عربی کو عربی ہونے کی وجہ سے مستقلاً عجمی پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ ایشیائی کو یوروپین پر نہ یوروپین کو افریقی پر نہ گورے کو کالے پر۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قرآن کی آیت ان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عام طور پر لوگ ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے سے گریز کرتے تھے جو غریب اور کم رو ہوں، ان کے بجائے مال وجمال والی یتیم لڑکی کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ مال وجمال دونوں حاصل ہوگا۔ اس طرز عمل پر تنبیہ کی گئی اور اسی لئے قرآن پاک میں بار بار کہا گیا ہے:

المؤمنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض۔ | مومن اور مومنہ ایک دوسرے کے قریبی ہیں۔

خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

الناس سواسیة کاسنان المشط لافضل لعربي علی عجمی وانما الفضل بالتقوٰے۔ | تمام لوگ انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں جس طرح کنگھی کے دندانے برابر ہوتے ہیں، کسی عربی کو عربی ہونے کی حیثیت سے کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے شرف وفضیلت صرف تقویٰ کی وجہ سے ہے۔

آپ نے نسب کی حیثیت واضح کرتے ہوئے فرمایا:

انسابکم هذه لیست بمسبة علی احد کلکم بنوادم طف الصاع بالصاع لم تملؤه لیس لاحد علی احد فضل الابدین وتقویٰ۔ (مشکوٰۃ باب المفاخرۃ والعصبیة) | یہ تمہارے انساب کسی کے لئے عار یا عیب کا سبب نہیں ہیں تم میں سے ہر شخص آدم کی اولاد ہے جس میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے مگر اس کے باوجود سب برابر ہیں۔

یہی بات آپ نے اور زیادہ واضح الفاظ میں اپنے آخری حج یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر لاکھوں عربیوں اور عجمیوں کے مجمع میں فرمائی تھی:

یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقویٰ الناس من اٰدم واٰدم من تراب۔

اے لوگو! خبردار تمہارا رب ایک ہے اور تم سب کے باپ بھی ایک ہیں، یاد رکھنا کہ نہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر فوقیت حاصل ہے اور نہ گورے کو کالے پر، مگر تقویٰ کی وجہ سے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔

(ابوداؤد و ترمذی باب تفاخر بالانساب)

یہ تقریر فرما کر آپ نے صحابہؓ سے پوچھا۔ ھل بلغت کیا میں نے تم تک خدا کا پورا پیغام پہنچا دیا۔ صحابہ کرام کے مجمع نے جواب دیا کہ بے شک آپ نے پیغامِ الٰہی ہم تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ غور کیجئے آپ نے کتنی اہمیت کے ساتھ یہ بات فرمائی تھی۔ دوسری حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

ان اٰل ابی فلاں لیسو الی اولیاء ان اولیائی الا المتقون حیث کانوا واین کانوا۔ [1]

فلاں قبیلہ و خاندان کے لوگ میرے محبوب و دوست نہیں ہیں، میرے دوست اور محبوب پرہیزگار لوگ ہیں چاہے وہ جیسے بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی بستے ہوں۔

خود آپ کے حبالۂ عقد میں کئی غیر قریشی ازواج مطہرات تھیں۔ حضرت زینب کی شادی آپ نے حضرت زیدؓ [2] سے کی اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ کی شادی فاطمہ بنت قیس سے کی۔ حالانکہ یہ دونوں خاتون

---

[1] رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر فرمایا تھا مگر حضرت عمرو بن عاص نے فتنہ کے خوف سے ذکر نہیں کیا، ملا علی قاری نے مرقاۃ میں لکھا ہے کہ یہ ارشادِ نبوی عام ہے قریش، بنو ہاشم اور آپ کے چچاؤں کے لئے جیسا کہ دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے۔ [2] فتح القدیر ج ۳ ص ۱۹۲، و تفسیر ابن کثیر، عام طور پر حضرت زید کو غلام کہہ دیا جاتا ہے مگر وہ حقیقتاً غلام نہیں تھے بلکہ عربی النسل تھے لیکن قریشی نہیں تھے۔ ازواج مطہرات میں حضرت صفیہ اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہما دونوں غیر قریشی تھیں بلکہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تو خالص عجمی تھیں۔

قریشی اور یہ دونوں بزرگ غیر قریشی تھے۔ ابو ہند صحابی فصد کھولنے کا پیشہ کرتے تھے یعنی حجام تھے مگر آپ نے ایک معزز عرب قبیلہ بنو بیاضہ سے کہا کہ ان کی شادی اپنی لڑکی سے کر دو۔ اس طرح حضرت بلال حبشی کی شادی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ حضرت حذیفہ نے جو ممتاز عرب خاندان بنو ازد کے ایک فرد تھے، اپنی بھتیجی کی شادی اپنے غلام سے کی تھی۔

واضح طور پر اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز دین و تقویٰ ہے۔ رشتہ نکاح میں دوسری چیزیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں مگر دین و تقویٰ کے ساتھ حسب و نسب اور حسن اور جمال اور مال و دولت بھی جمع ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر دین و تقویٰ کے مقابلے میں دوسری چیزوں کو ترجیح نہیں دی جا سکتی اگر ایک طرف غریب، نادار، کم تعلیم یافتہ مگر صاحب دین و تقویٰ لڑکا یا لڑکی ہو اور دوسری طرف ایک صاحب مال و دولت اور تعلیم یافتہ لڑکا ہو مگر دین و تقویٰ سے عاری ہو تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دولت و وجاہت کے مقابلے میں اس غریب کو ترجیح دے جس کے ساتھ دین و تقویٰ کا اعزاز لگا ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

تنکح المرأۃ لاربع لمالھا ولجمالھا وحسبھا ولدینھا فاظفر بذات الدین تربت یداک۔ (بخاری و مسلم شریف)

عورت سے یا تو اس کے مال و دولت کی بنا پر رشتہ کیا جاتا ہے یا حسب و نسب کی بنا پر یا حسن و جمال کی بنا پر یا دین و تقویٰ کی بنا پر، تو تم لازماً دین و اخلاق والی عورت کو نکاح کے لیے منتخب کرو۔

آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ حسب و نسب اور ظاہری وجاہت کی بنا پر رشتہ کرتے ہیں اور کچھ لوگ دولت و ثروت کو اور کچھ لوگ حسن و جمال کو دیکھتے ہیں مگر آپ نے تاکیداً حکم فرمایا کہ اولین چیز دین و اخلاق ہے اور تمام مسلمانوں کو رشتہ کرنے میں پہلے یہی چیز دیکھنی چاہئے۔ دوسری چیزیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر دین و اخلاق کے بعد ایک دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے جس میں آپ نے حسن و جمال اور مال و دولت کی بنا پر رشتۂ نکاح قائم کرنے سے منع فرمایا۔

آپؐ نے فرمایا کہ:

لاتزوجوا النساء لحسنهن فعسیٰ حسنهن ان یردیهن ولا تزوجوا لاموالهن فعسیٰ اموالهن ان تطغیهن ولکن تزوجوهن علی الدین و لامة سوداء ذات دین افضل۔

عورتوں سے ان کے حسن و جمال کی بنیاد پر نکاح نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا حسن و جمال ان کو خرابی و بربادی کی راہ پر ڈال دے۔ اور نہ ان کے مال و دولت کی وجہ سے شادی کرو ہو سکتا ہے کہ ان کا مال ان کو سرکشی اور فخر و غرور میں مبتلا کر دے۔ بلکہ دین و اخلاق کی بنیاد پر شادی کرو۔ کالی کلوٹی لونڈی جو دین و اخلاق سے آراستہ ہو وہ بہت بہتر ہے (اس بلند خاندان اور مالدار حسینہ سے جو بد اخلاق ہو)

آپ نے اس حدیث میں صراحتہً حسن و جمال اور مال و دولت کو معیار بنانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے پہلی حدیث کے ابتدائی تین فقروں کو بھی اجازت نہیں سمجھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ائمہ میں کسی نے حسن و جمال کو کفارت کے شرائط میں شمار نہیں کیا ہے۔ علامہ ابن رشد لکھتے ہیں کہ اجماعاً حسن و جمال کفارت میں داخل نہیں ہے۔ فقہ مالکی کے عالم ابن جزئی لکھتے ہیں، حسن و جمال کی شرط کسی نے نہیں لگائی۔[1] ان احادیث کی روشنی میں علامہ ابن رشد نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہاں نقل کر دیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کفارت کے بارے میں اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ دین کا ہر حال میں اعتبار کیا جائے گا اور اس مسئلہ میں کسی مسلک فقہی کا اختلاف نہیں ہے کہ اگر کنواری لڑکی کا نکاح اس کا باپ کسی شرابی یا مجموعی حیثیت سے جسے فسق و فجور کی عادت ہو اس سے کر دے تو لڑکی کو اس نکاح سے علیحدگی کرانے کا حق ہوگا۔ اور اگر مقدمہ دائر کرے گی تو حاکم اس صورت کو اپنی نظر میں رکھ دونوں میں تفریق کرا دے گا۔ اسی طرح اس شخص کا بھی حکم ہے جس کا سارا مال حرام ہو یا وہ بہت زیادہ طلاق کی قسم کھاتا ہو۔

باقی آئندہ

---

[1] القوانین الفقھیہ لابن جزئی ص۱۵۰

وفیات

حضرت سیّد صاحب کی اہلیہ محترمہ کا سانحۂ ارتحال

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ہی کسی کے ذریعہ یہ جانکاہ خبر مل گئی تھی کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی اہلیہ محترمہ کا کراچی میں انتقال ہوگیا۔ زبان سے بے ساختہ کلمۂ استرجاع نکلا اور اسی وقت ان کے لئے ایصال ثواب کرکے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فرشتہ صفت شوہر کے پہلو میں جنّت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ آمین۔

حضرت سید صاحب متانت و سنجیدگی کے پیکر اور سراپا حلم و وقار تھے۔ ان کی ہر ادا سے نظافت و پاکیزگی ظاہر ہوتی تھی۔ بحمد اللہ ان کو اہلیہ بھی بڑی سنجیدہ، مہذب، سلیقہ مند اور عبادت گزار ملی تھیں۔ سیّد صاحب اپنے علمی انہماک کی وجہ سے خانگی معاملات ہی نہیں اپنی ذاتی ضروریات سے بھی بے خبر رہا کرتے تھے۔ ان کاموں کا سارا بوجھ اہلیہ محترمہ کے سپرد تھا۔ سید صاحب کو دارالمصنفین کے آخری زمانہ یعنی ۱۹۴۶ء میں صرف ڈھائی سو روپئے ماہوار دارالمصنفین سے ملتے تھے مگر ان کی سلیقہ مندی تھی کہ سید صاحب کی ظاہری نظافت و صفائی سے کوئی یہ محسوس نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اتنا کم معاوضہ پاتے ہیں۔ یہ سب اہلیہ محترمہ کی سلیقہ مندی کا نتیجہ تھا۔ سید صاحب عموماً موٹی گزی کا کُرتا، پاجامہ دوپلی ٹوپی پہنتے تھے مگر وہ اسے اس سلیقہ سے دُھلواتی اور رکھتی تھیں کہ ان کے بدن پر وہ ادھی و تنزیب سے زیادہ حسین معلوم ہوتا تھا۔

بچّوں کی تربیت اس طرح کرتی تھیں کہ چھ سات برس کی عمر میں ان کی بچّیوں پر عام لوگوں کی نظر نہیں پڑسکتی تھی۔

حضرت سید صاحب کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا دو بچیاں اور چھوٹے صاحبزادے سلمان سلمہٗ کم عمر تھے۔ ان سب کی پرورش اور شادی بیاہ اسی مرحومہ نے کیا۔ غرض یہ کہ وہ سید صاحب کے لئے اس حدیث کی مصداق تھیں:

مااستفادالمؤمن بعد تقوی اللہ خیراً لہ من زوجۃٍ صالحۃ ان امرھا اطاعتہ وان نظر الیھا سرتہ وان اقسم علیھا ابرتہ وان غاب عنھا نصحتہ فی نفسھا ومالہ۔

اللہ کے تقویٰ کے بعد مومن کے لئے سب سے بڑی سعادت کی چیز وہ صالحہ بیوی ہے جو شوہر کی فرمانبردار ہو۔ اس کی طرف نظر اٹھے تو مسرت سے اس کے دامن کو بھر دے اگر اسکے اعتماد پر کوئی قسم کھائے تو وہ پورا کر دے اور اسکی غیر موجودگی میں اپنی عصمت اور اس کے مال کی محافظ ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی بچیوں اور صاحبزادہ سلمان سلمہٗ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور والدین کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

محترم محمد شفیع صاحب وکیل مرحوم

شہر کے ممتاز اور صاحب حیثیت وکیل محترم محمد شفیع صاحب کا ۱۳ستمبر ۱۹۸۷ء کو انتقال ہو گیا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ان کی غلطیوں سے درگزر کرے اور ان کی بے شمار نیکیوں کے بدلہ انھیں جنت نعیم میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین۔

انتقال کے وقت ان کی عمر نوّے برس کے لگ بھگ تھی اور آخر وقت تک قویٰ مضبوط رہے، اس سے پہلے ارشاد کے صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں جب مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت سے آخر وقت تک وہ مدرسہ کی امداد کرتے رہے۔ یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ مدرسہ کی زمین کی خریداری میں سب سے زیادہ انہی کے خاندان کے لوگوں نے مدد کی۔ مدرسہ کے بعض مقدمات کی پیروی بغیر کسی معاوضہ کے انھوں نے پوری محنت و توجہ سے کی۔

۱۹۶۹ء میں حج کے پہلے سفر میں کئی مہینے ان کا ساتھ رہا جس میں ان کی عبادت گزاری، ذکر و اذکار اور شرافت نفس اور تواضع کا پورا اندازہ ہوا۔ میں بہت خورد تھا مگر بعض معاملات میں میں جو فیصلہ کر دیتا تھا وہ بے چون و چرا مان لیتے تھے۔ نہ صرف فرض نمازوں کے پابند تھے بلکہ نوافل اور ذکر و اذکار کے بھی پابند تھے۔ دس بجے دن میں وضو کر کے گھر سے کچہری کے لئے نکلتے تھے تو اسی وضو سے ظہر اور عصر کی نماز پڑھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ذات سے شاید کسی کو کوئی اذیت پہنچی ہو، جوڑ توڑ اور سیاسی

باقی ص۵۰ پر

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی اے میں اور فضیلت پاس کرنیکے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے، کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں:

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت و جلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دو درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درس گاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ ر لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہئیے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ ر جون سے شروع ہوجاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ ر شوال سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے اور ۳۰ ر شوال تک ختم ہو جاتا ہے۔

Regd. No. Azm./N.P. 42/84
Regd. No. R.N. 34937/81
MONTHLY JAMEATUR RASHAD
AZAMGARH 276001 (U.P.) INDIA

ماہنامہ
جامعۃ
جنوری
۱۹۸۸
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ یوپی

اسلامی فقہ (اوّل و دوم)

مرتبہ :- حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب !

دو برس سے اصلی اسلامی فقہ بازار سے غائب تھی۔ بحمد اللہ اب اسلامی فقہ کا پانچواں شاندار اڈیشن تاج کمپنی نئی دہلی سے شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے۔

مصنف موصوف نے اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس سے اب یہ بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ شروع میں اسلامی عقائد کے باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح معاشرتی و معاملاتی مسائل والے حصہ میں سیکڑوں جدید مسائل مثلاً جمن چڑھانا، پوسٹ مارٹم، نسبندی اور نلکی زادہ، مصنوعی اعضا وغیرہ کے احکام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں دیوانی اور فوجداری کے بقیہ ابواب مثلاً دعوی، قضا و شہادت، حدود و قصاص، احکام سلطانیہ اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے، گویا شریعت اسلامی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ پڑ گئی ہو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں اس سے زیادہ مفصل کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ تمام اہم مسائل میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بھی متن یا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ شریعت اسلامی کی وسعت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو گئی ہے، اسلئے دو حصے میں کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف عام پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مفید ہے بلکہ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بھی ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ کتاب ہر گھر اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے پہلے اسلامی فقہ کے چار اڈیشن مکتبۃ الحسنات سے شائع ہو چکے ہیں، مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مکتبۃ الحسنات کے موجودہ مالک کی بد معاملگی کی وجہ سے ان سے دو برس پہلے اسلامی فقہ کا معاملہ ختم کر لیا گیا تھا، اس پر انہوں نے عبارت کا تھوڑا ردو بدل کر کے قانون و اخلاق کے سارے حدود توڑ کر مولانا موصوف کی اسلامی فقہ کو اسی نام سے ایک غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کر لیا، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ بالکل نمایاں ہے۔ پرانی مثل "نقل را چہ عقل" کے تحت مسائل میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر بیٹھے ہیں۔

بہرحال جس اصلی اسلامی فقہ کا لوگوں کو انتظار تھا اب وہ چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔

ملنے کے پتے
- تاج کمپنی، ۳۱۵۱، ترکمان گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱، یوپی
- منیجر دار التالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد،

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان	سالانہ چندہ
غیر ممالک سے	ماہنامہ	ہندوستان سے 30/-
پندرہ ڈالر امریکی	جامعۃ	خصوصی معاون 100/-
$ 15/-	الرشاد	قیمت فی پرچہ 3/-

جلد نمبر ۱۵	جنوری ۱۹۸۸ء بمطابق جمادی الاول ۱۴۰۸ھ	شمارہ نمبر ۷۸

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

کاتب
رفیق احمد۔ شاہ پور۔ کندھرا پور۔ اعظم گڑھ

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس، مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رشحات

دینی تعلیم کے وسیع نظام کی ضرورت

اکتوبر، نومبر کے مشترکہ شمارہ میں راقم الحروف نے رشحات میں لکھا تھا کہ "ہندوستان کے مسلمان بے شمار مسائل اور مشکلات سے دوچار ہیں مگر ان کا سب سے بڑا مسئلہ جہالت ہے، اور حج میں ان کی جہالت کا منظر دیکھنے کے بعد یہ یقین اور بڑھ گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ دینی تعلیم ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کی آئندہ نسل کے دین و ایمان کو خطرہ سب سے زیادہ اسی راستہ سے ہے۔ اس وقت پورے ملک میں ایک منصوبہ بند طریقہ سے گاؤں گاؤں گورنمنٹ کے پرائمری اسکولوں کے ساتھ آر۔ ایس۔ ایس کی طرف سے نرسری اسکول شیشو مندر بالک سدن اور نہرو نکیتن وغیرہ ناموں سے قائم کئے جا رہے ہیں۔ ان میں ہندو مذہب و تہذیب کے زہر کو بچوں کے ذہن نشین کرانے کی بھرپور کوشش جاری ہے۔ افسوس ہے کہ ان میں بڑی تعداد میں مسلمان بھی اپنے بچوں کو داخل کرتے نظر آرہے ہیں۔ فسادات کے ذریعہ ان کی جو نسل کشی کی جا رہی ہے اس سے بڑے پیمانہ پر تعلیم کے راستہ سے ان کی ذہنی و معنوی نسل کشی کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس گزارش کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمان سیاسی برتری اور مقابلہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش یا اقتصادی خوشحالی کی دوڑ دھوپ کو ترک کر دیں یا مسلم پرسنل لا یا بابری مسجد اور دوسرے مسائل سے اپنی نگاہ پھیر لیں یا ان کو اہم نہ سمجھیں، بلکہ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان مثبت اور منفی کاموں کے ساتھ اس وقت اپنی عملی قوت و صلاحیت اور مالی وسائل کا ایک بڑا حصہ ان کو اس محاذ پر بھی لگانے کی ضرورت ہے۔ ہم مسلم پرسنل لا اور بابری مسجد وغیرہ کے سلسلے میں جس جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں

وہ ایک خوش آئند بات ہے مگر ہمیں اس خشک اور ٹھنڈے کام میں بھی یہی عملی جوش و خروش دکھانے کی ضرورت ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان کے ہر شہر اور قصبہ میں بڑی اور چھوٹی دینی درس گاہیں موجود ہیں اور گاؤں گاؤں مکاتب کا سلسلہ بھی جاری ہے مگر اب بھی اس سے کئی گنا بڑے پیمانے پر کوشش کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اُن بستیوں میں جہاں مسلمان کم تعداد میں بستے ہیں۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ہر بڑا مدرسہ اگر اپنے گرد کے قائم شدہ مکاتب کی بے غرض نگرانی اپنے ذمہ لے لے اور ہر مدرسہ پانچ پانچ ایسے گاؤں کے بچوں اور بچیوں کے لئے دینی تعلیم کا انتظام مدرسہ کے بجٹ سے کر دے جو ہندو اکثریت کے گاؤں میں دس بیس پچیس کی تعداد میں آباد ہیں، تو بڑی حد تک یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ان کی تعلیم کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ مدارس اپنی اعانت سے ہر گاؤں میں ایک مکتب قائم کر دیں اور سال دو سال اپنے بجٹ سے ان کا خرچ پورا کریں۔ انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد ان کے اندر خود ایسے جذبات پیدا ہو جائیں گے کہ وہ اس کا بوجھ اٹھا لیں۔ بہت سے بڑے مدارس بہت سی جگہوں پر اپنی شاخیں قائم کرتے ہیں مگر وہاں پر قائم کرتے ہیں جہاں پر اُن کو چندہ اور آمدنی کا یا طلبہ کے آنے کا فائدہ نظر آتا ہے، لیکن ضرورت ایسی جگہ شاخیں قائم کرنے اور مدرسہ کھولنے کی ہے جہاں آمدنی ہونے کے بجائے خرچ کرنا پڑے۔ کاش بڑی بڑی بڑی درس گاہوں کے ذمہ دار اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرتے اور عملاً اس تجویز کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے تو ہمارا یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جاتا۔ یہ بڑی بڑی درس گاہوں کے چلانے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔ ذرائع کی کمی کے باوجود بحمداللہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے تین غریب مسلمانوں کے گاؤں کے مکاتب کو مدد دی جا رہی ہے بہت سے مکاتب کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔

اس سلسلہ میں متعدد خطوط اہلِ علم نے لکھے ہیں مگر ایک دار العلوم کنتھاریہ بھروچ (گجرات) کے ذمہ دار کا خط ہم نقل کرتے ہیں جس میں مثبت ردِ عمل اور اقدامات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے خط میں درج ہے:

"آپکے مدد مند آدارہ کی مناسبت سے اصل بات یہ عرض کرنی ہے کہ اس دینی ادارہ کے ماتحت غریب و پس ماندہ دیہات میں جہاں دینی ابتدائی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے ایک سو دس مکاتب چل رہے ہیں۔ ایک مستقل شعبہ "شعبۂ مکاتب" کی

زیر نگرانی منظم طور پر دار العلوم ان مکاتب و مدارس کو چلا رہا ہے۔ تعلیمی جانچ پڑتال کے لئے چار وزیٹرس رکھے گئے ہیں اور ان وزیٹروں کے اوپر بھی دو وزیٹرس ہیں جو اچانک پیشگی کوئی اطلاع دیئے بغیر اسکوٹر کے ذریعہ معائنہ کے لئے پہونچ جاتے ہیں دار العلوم نے موجودہ زمانے کے (گجرات کے ماحول کو مدنظر رکھ کر) بچوں کی ذہنی سطح کے پیش نظر ایک تعلیمی کورس بھی شائع کیا ہے جو ارسالِ خدمت ہے۔ اس شعبہ کا سالانہ بجٹ پانچ لاکھ روپے ہیں۔ ویسے ادارے کی دینی وملی خدمات بہت وسیع وعریض ہیں، صرف ایک شعبہ کا ذکر آنجناب کا فاضلانہ اداریہ پڑھ کر کر دیا ہے۔

باقی حالات بخیر ہیں۔ دعاءمیں یاد رکھیں۔

والسلام

حسن عبداللہ بھڑکودروی۔ خادم شعبۂ نشرواشاعت

اس سلسلہ میں یہ بات بھی عرض کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہماری دینی درس گاہوں اور مکاتب میں مشکل سے دو چار دس فی صد بچوں کی تعداد آتی ہے، بقیہ پچاسی نوے فی صد میں سے چالیس فیصد تو پڑھتے ہی نہیں اور بقیہ ساٹھ فی صد بچے نرسری اسکولوں یا جدید درس گاہوں میں چلے جاتے ہیں جہاں انھیں نہ صرف اسلامی تہذیب اور دین کی بنیادی باتیں بھی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ اس کے خلاف باتیں ان کے ذہن میں ڈالی جاتی ہیں۔ اس لئے ضرورت اس کی بھی ہے کہ مکاتب کے وسیع نظام کے ساتھ ہم خود اسلامی ماحول کے مطابق انگلش میڈیم نرسری اسکول قائم کریں اور جہاں اس کا موقع نہ ہو وہاں صباحی اور شبینہ مدرسے صبح شام چلانے کی کوشش کریں، ممکن ہے کہ گجرات جیسے صوبہ میں جہاں مسلمانوں میں دین داری اور دینی احساس عام ہے اور مالی پوزیشن بھی مضبوط ہے جیسا کہ خط سے اندازہ ہوتا ہے اور دینی مکاتب کا بھی وسیع نظام ہے وہاں اس کی ضرورت محسوس نہ کی جائے لیکن پورے ہندوستان میں اس کی شدید ضرورت ہے۔ بمبئی میں بہت سی مسجدوں میں صباحی اور شبینہ مدرسوں کا رواج ہے۔ خاص طور پر مدرسہ رحمانیہ عمر رجب روڈ تو اس سلسلہ میں مثالی مدرسہ ہے۔ ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے ذمہ دار اور دینی حس رکھنے والے افراد مکاتب کے ساتھ اس کی طرف بھی اپنی پوری توجہ مبذول رکھیں۔

اسکے ساتھ یہ تاریخی حقیقت بھی ہمیں پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اگر ہم بچّوں کیلئے چاہے جتنا اچھا دینی تعلیم کا نظام قائم کردیں لیکن ہمارے گھر کا ماحول درست نہیں ہے تو بچّے کی پانچ چھ گھنٹے مدرسے کی تعلیم اسے درست نہ رکھ سکے گی۔ ہندو قوم ایک ہزار برس تک مسلمانوں کی محکوم رہی انھوں نے فارسی بھی پڑھی اور عہدے بھی لئے، تہذیبی اور دنیاوی ترقی بھی کی اور اپنا دین بھی بدلا، اسکے باوجود مجموعی حیثیت سے ان کی عورتوں نے گھر کے اندر اپنی قدیم تہذیب کو باقی رکھا اور اس میں اسلامی تہذیب کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا مگر ہماری صورت حال یہ ہے کہ چالیس برس کے اندر مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے گھروں سے اسلامی تہذیب کو بڑی حد تک خیر باد کہہ دیا ہے یا اس کا احساس کمزور پڑ گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدید تہذیب اور لڑکیوں کی جدید تعلیم نے اور سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے معاشرہ کی اسلامی خصوصیات کو یکسر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس لئے اگر ہمیں واقعی اسلامی معاشرہ عزیز ہے تو بچّوں کے ساتھ اپنی بچیوں کیلئے بھی دینی ماحول کے ساتھ اعلیٰ دینی و دنیاوی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ بحمداللہ یہ احساس عام ہو رہا ہے مگر اس کے لئے ایک مہم چلانے کی ضرورت ہے۔

بحمداللہ جامعۃ الرشاد نے نرسری اسکول کی تو ابتدا کر دی گئی ہے۔ اس کے تحت کئی نرسری اسکول اعظم گڑھ اور غازی پور میں چل رہے ہیں۔

انشاءاللہ جولائی سے بچیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی علیحدہ انتظام کرنے کی کوشش کیجارہی ہے مگر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے تحت جو ایڈیڈ نسواں یا گرلس اسکول چل رہے ہیں ان سے ہماری ضرورت پوری نہیں ہوتی بلکہ ہم کو آزادانہ انتظام کرنا ہوگا۔ جدید درس گاہوں کے نظام سے فائدہ ضرور اٹھایا جائے اور لڑکیوں کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جائے مگر بہرحال اپنی دینی قدروں اور ملی اور تہذیبی امتیازات کو کسی طرح مجروح نہ ہونے دیا جائے۔

بحمداللہ "الرشاد" اب ڈیڑھ ہزار سے زیادہ شائع ہونے لگا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ میں پڑھا جانے لگا ہے۔ دوسرے ملکوں میں چالیس پچاس پرچے جانے لگے ہیں مگر گرانی کی وجہ سے اب بھی اسکے بجٹ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اسکے دفتری کاموں کیلئے کوئی مستقل آدمی رکھا جاسکے اب تک سارا کام رضا کارانہ ہو رہا ہے اگر ناظرین اسکو مفید پاتے ہیں تو اُن سے گزارش ہیکہ وہ اپنی کوشش سے ایک ایک خریدار فراہم کردیں اور جن حضرات کے چندے باقی ہیں وہ سب ادا کردیں تو انشاءاللہ پرچہ پورے طور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ ایک دینی کام میں تعاون کا آپکو اجر عطا کریگا اور ہم آپکے تہ دل سے شکر گزار ہونگے۔ ● ●

تفسیر اور اس کے مآخذ

پروفیسر وحید الدین۔ گومل یونیورسٹی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان

قرآن حکیم کی تفسیر میں احتیاط قرآن کریم کی تفسیر درحقیقت حق تعالیٰ شانہ کے ارشادات کی ترجمانی کا نام ہے۔ قرآن کریم کے کسی لفظ یا آیت کی تفسیر کا مقصد بتانے والا گویا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔ اس طرح اپنے بیان کئے ہوئے مفہوم کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا افترا علی اللہ کا موجب بن سکتا ہے جو نہایت سنگین جرم ہے۔

ومن اظلم ممن افتریٰ علی اللہ کذبا اوکذب بآیاتہ انہ لایفلح الظٰلمون۔ [1]	اور اس سے زیادہ اور کون بے انصاف ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتلاوے ایسے بے انصافوں کو راست گاری نہ ہوگی۔ [2]

ابو منصور ماتریدی کہتے ہیں کہ تفسیر میں ایک معنی پر یقین کر لینا ہوتا ہے کہ اللہ کی مراد یہی ہے۔ عموماً قرآن کریم کی تفسیر کو سہل خیال کیا جاتا ہے اور

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر۔ [3]	اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔ سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔ [4]

اس آیت کا مطلب ایسے محل وقوع پر استعمال کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں جہاں تک نصیحت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک کے الفاظ یہی ہیں اس میں کسی عالم یا غیر عالم کی تخصیص نہیں۔ لیکن جس جگہ علم کا ذکر ہے تو یہ ہر ایک آدمی کے لئے نہیں بلکہ صرف ان کے لئے ہے جو استنباط احکام کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں۔

---

[1] القرآن سورۂ انعام (۶) : ۲۱ [2] قرآن مجید مترجم ومحشی تفسیر وتسہیل بیان القرآن، ص ۱۹۵

[3] القرآن سورۃ القمر (۵۴) : ۱۷ [4] تفسیر وتسہیل بیان القرآن ص ۹۴۷

لعلمه الذین یستنبطونہٗ منھم۔ [1] اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کر سکتے ہیں۔

اعلم الصحابہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اعلم التابعین حضرت سعیدؒ بن مسیب جیسی مقتدر ہستیوں کو استنباط احکام میں پوری صلاحیت تھی مگر اس کے باوجود قرآن کریم کے کسی لفظ کا معنی یا کسی آیت کی تفسیر کرنے میں ازحد محتاط رہتے۔ سید الصحابہ حضرت ابوبکرؓ سے قرآن پاک کے لفظ کا معنی دریافت کیا گیا تو فرمایا:

ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی — مجھ کو کون سی زمین اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پہ

اذا قلت فی کتاب مالا اعلم۔ [2] — سایہ گستر ہوگا جبکہ میں قرآن میں وہ بات کہوں جو میں نہیں جانتا۔

سید التابعین حضرت سعید بن مسیب سے کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے:

انا لانقول فی القرآن شیئًا۔ [3] — ہم قرآن کی تفسیر میں کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔

حد درجہ اس احتیاط کی وجہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ان کے سامنے تھا:

من تکلم فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ [4] — جو شخص علم کے بغیر قرآن کے بارے میں کچھ کہتا ہے وہ دوزخ کو اپنا ٹھکانہ بنالے۔

قرآن حکیم کی تفسیر نہایت مشکل کام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان وجوہ اور اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے قرآن حکیم کے فہم میں دشواری یا غلطی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اسباب مندرجہ ذیل ہیں: [5]

۱۔ کسی نادر الاستعمال لفظ کا استعمال ۔۔۔ اس کا علاج یہ ہے کہ صحابہؓ اور تابعین اور دوسرے ارباب معنی سے رجوع کر کے اس لفظ کے معنی معلوم کئے جائیں۔

۲۔ منسوخ اور ناسخ میں امتیاز نہ کرنا۔

۳۔ اسباب نزول کا یاد نہ رکھنا۔

۴۔ مضاف یا موصوف کے محذوف ہونے کے باعث۔

۵۔ ایک چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ یا ایک حرف کے ساتھ ایک اسم کا کسی دوسرے اسم کے ساتھ، ایک

---

[1] سورۃ آل عمران [2] تفسیر القرآن العظیم ابن کثیر ج ۱ ص ۵۔ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۶
[4] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲ طبع ۲ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۷۹

فعل کا کسی دوسرے فعل کے ساتھ بدل جانا، یا جمع کی جگہ مفرد، مفرد کی جگہ جمع کا رکھا جانا، غائب کی جگہ مخاطب یا اس کے برعکس ہونا۔ کبھی تقدیم ماحقہ التاخیر اور تاخیر ماحقہ التقدیم۔ ایک لفظ سے متعدد معانی مراد لیا جا سکتا۔

۶۔ کبھی قرآن کے فہم میں دشواری کا باعث تکرار مضمون۔ اطناب یا اختصار و ایجاز ہوتا ہے۔

۷۔ کبھی کنایہ۔ تعریض، متشابہ اور مجاز عقلی اس صعوبت فہم کا باعث ہوتا ہے۔ [1]

تفسیر بالرائے | تفسیر بالرائے سے مراد ایسی تفسیر ہے جو اپنے ذہن میں ٹھہرائی جائے اور کسی طرح قرآن کے مفہوم کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جائے۔ کسی معاملہ میں آدمی کی خود اپنی ایک رائے ہو اور اس کی جانب خواہش نفس کی بنا پر اس کا طبعی میلان بھی ہو اور وہ اپنی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کریم کی اس لئے تفسیر کرے اپنی غرض فاسد کی صحت پر استدلال کرے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قال فی کتاب اللہ برأیہ فاصاب فقد اخطأ ۔ [2]

جو شخص اپنی خواہش کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے تو اگر وہ صحیح بات بھی کہہ جائے تو اس نے صحیح طریقہ تفسیر سے انحراف کیا

من قال فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطأ ۔ [3]

جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھی کرے تو اس نے غلطی کی۔

البتہ جس نے غور و فکر سے کام لیا اور علم و نظر کے اصولوں کے مطابق قرآن کی تفسیر کی وہ اس حدیث میں داخل نہیں۔ اس کی تفسیر بالرائے نہیں ہو گی اور نہ خطاء کی طرف منسوب ہو گی۔ [4]

قال العلماء النهی عن القول فی القرآن بالرأی انما ورد فی حق من یتاول القرآن علی مراد نفسہ وھو تابع لھواہ ۔ [5]

علماء نے کہا کہ تفسیر بالرائے سے ممانعت اس شخص کے بارے میں وارد ہوئی جو اپنی خواہش نفس کے مطابق تفسیر کرے اور وہ اپنی خواہش کا متبع ہو۔

---

[1] الفوز الکبیر۔ ص ۱۷۔ [2] ابوداؤد، ج ۲، ص ۵۱۴۔ [3] مشکوۃ، جامع ترمذی۔ [4] ابو حیان اندلسی کا قول جواہر القرآن ص ۲۲ مطبوعہ لاہور۔ [5] تفسیر خازن ص ۶، ج ۱ مطبوعہ مصر

البتہ قرآن پاک کے ایسے معارف کا بیان جس میں اس کی اپنی رائے نہ ہو اور آیت کے الفاظ میں اس مطلب کی گنجائش ہو تو ایسی تفسیر بالرائے نہ ہو گی چاہے وہ بات پہلے سے منقول نہ بھی ہو۔

قرآن پاک کی تفسیر کے لئے جو اصول اجماعی طور پر مسلم ہیں ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی وہ ناجائز ہو گی۔

ان التفسير اذا لم يوجب تغيير المسألة او تبديلا فی عقيدة السلف فليس تفسيرا بالرأی فاذا وجب تغيير المسئلة۔ متواترة او تبديلا لعقيدة مجتمع عليها فذلك هو التفسير بالرأی وهذا يستوجب صاحبه النار۔ [1]

تفسیر جب کسی مسئلہ کو نہ بدلے اور نہ عقیدۂ سلف میں کوئی تبدیلی کرے تو وہ تفسیر بالرائے نہیں۔ ہاں جب کسی متواتر مسئلہ کو بدلے یا کسی اجتماعی عقیدہ کو تبدیل کرے تو وہ ضرور تفسیر بالرائے ہے اور ایسا کرنے والا بے شک دوزخ کی آگ کا مستوجب ہے۔

ومن قال فی القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار۔ [2]

جو شخص قرآن کریم کے معاملہ میں علم کے بغیر کوئی بات کہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

وان کان القول فی القرآن بغير علم لكن عن جهل وذلك بان تكون الاية محتملة لوجوه فيفسرها بغير ما تحتمله من المعانی والوجوه۔ [3]

تفسیر بالرائے علم کے بغیر یہ ہے کہ ایک آیت میں مختلف مطالب کا احتمال ہے لیکن کوئی شخص اس کی ایسی تفسیر کرتا ہے جس کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں۔

تفسیر کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

تفسیر کا لفظ دراصل فسر سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا کھولنا، ظاہر کرنا، بیان کرنا۔ فَسْرٌ مصدر، فعل ضرب اور نصر دونوں کے وزن پر آیا ہے [4] اور اس لئے قرآن مجید کے مفہوم کو

---

[1] فیض الباری ج ۴ ص ۱۰۵ علامہ انور شاہ کشمیریؒ۔ [2] الاتقان ص ۱۷۹۔ [3] علامہ علاؤ الدین علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی: مقدمہ تفسیر، مکتبہ تجاریہ مصر، ص ۶۔ [4] قاموس ج ۲: ص ۱۱

کھول کر بیان کرنے کو علم تفسیر کہتے ہیں۔

صاحبِ لسان العرب" کہتے ہیں۔ فَسَر" کے معنی میں اظہار و بیان اس کا فعل ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے۔ تفسیر کا مفہوم بھی یہی ہے۔ فَسَر" بے حجاب کرنے کو کہتے ہیں۔ تفسیر کرتے وقت بھی مشکل لفظ کے معنی مفہوم کو گویا بے حجاب کر دیا جاتا ہے۔[۱]

قرآن حکیم کی اصل عبارت متن کہلاتی ہے اور اس کے کھولنے اور بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔

۱: علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن حکیم کے معنی بیان کئے جائیں اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے۔[۲]

۲: تفسیر ایک ایسا علم ہے جس کی مدد سے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن کے معنی سمجھے جاتے ہیں اور اس کے احکام و مسائل اور اسرار و حکم سے بحث کی جاتی ہے۔[۳]

ابو حیان اندلسی تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں:

علم یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق بالفاظ و مدلولاتہا واحکامہا الافرادیۃ والترکیبیۃ ومعانیہا التی تحمل علیہا حالۃ الترکیب و تتمات لذلک۔[۴]

یہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی کیفیت، نطق، الفاظ کے معانی، ان کے افرادی اور ترکیبی حالات اور ان کے تتمات کا بیان کیا جائے۔

تتمات سے وہ علوم مراد ہیں جو اس کی تفہیم کو مکمل کریں۔ اس میں اسباب نزول کی معرفت، ناسخ و منسوخ کا بیان، درجات نصوص کی تعیین، ظاہر و خفی کی تشریح، متشابہات کی توضیح، مبہمات کی تفصیل اور احکامات کی تنقیح وغیرہ سب امور داخل ہیں۔

۴: تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآنی آیات کے نزول، ان کے واقعات متعلقہ و اسبابِ نزول نیز مکی و مدنی، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، خاص و عام، مطلق و مقید، مجمل و مفسر، حلال و حرام وعد و وعید،

---

[۱] لسان العرب ۲ : ۳۶۱ [۲] مفتی محمد شفیع، معارف القرآن ج ۱ ص ۴۹۔

[۳] علم یفھم بہ کتاب اللہ المنزل علی نبیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وبیان معانیہ واستخراج احکامہ وحکمہ۔

[۴] علامہ شہاب الدین السید محمود آلوسی: روح المعانی مج ۱، مکتبہ امدادیہ، ملتان ص ۴۔

امر و نہی اور عبرت و امثال وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔[1]

تاویل کا لغوی معنی اور اصطلاحی مفہوم

تاویل کا سہ حرفی مادّہ اول (رجوع کرنا) ہے۔ یعنی الفاظ جتنے معانی کے محتمل ہو سکیں ان میں سے بذریعۂ قرائن کسی ایک معنی کی طرف رجوع کرنا تاویل کہلاتا ہے۔

"آل الیہ اولاً" یعنی رجوع کرنا اور منحرف ہونا "تاویل الکلام سے مراد اس کی توضیح و تشریح ہے۔

تاویل خواب کی تعبیر کو بھی کہتے ہیں۔[2] لسان العرب میں ہے:

أول کے معنی ہیں رجوع کرنا اور منحرف ہونا۔

حدیث میں ارشاد ہے:

من صام الدھر فلا صام ولا آل۔ — جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، نہ اس کا روزہ ہوا اور نہ اس نے نیکی کی طرف رجوع کیا۔

تاویل الکلام کے معنی اظہار و بیان کے ہیں۔[3] قدیم زمانے میں تفسیر کے لئے لفظ تاویل بھی استعمال ہوتا تھا۔ قرآن حکیم میں بھی یہی لفظ تفسیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وما یعلم تاویلہ الا اللہ۔ — اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس مفہوم کو تائید حاصل ہے۔

اللّٰھمّ فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔[4] — اے اللہ (ابن عباسؓ) کو دین کی سمجھ اور تاویل (تفسیر) کا فہم عطا کر۔

علامہ بغویؒ لکھتے ہیں:

التاویل صرف الآیۃ الی معنی موافق لما قبلھا وما بعدھا تحتمہ الآیۃ غیر مخالف الکتاب والسنۃ من طریق الاستنباط۔[5] — تاویل آیت کا لوٹا دینا ایک ایسے معنی کی طرف جو ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور معنی قرآن و سنّت کے مخالف نہ ہوں اور ایسے معانی پیدا کرنا از راہ استنباط ہوگا۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۲، ص ۱۷۳۔ [2] قاموس: ج ۳، ص ۳۳۱۔ [3] لسان العرب: ج ۳، ص ۳۳۔

[4] فتح الباری: ج ۱، ص ۸۸۔ [5] الاتقان فی علوم القرآن: ج ۲، ص ۱۷۳۔

باقی صـ پر
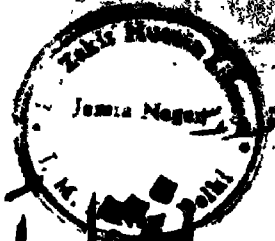
افتاء اور اس کی ذمہ داری

مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب، نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

فقیہ کیلئے علم حدیث بالخصوص اور ہر علم کا اہم حصہ بالعموم حاصل کرنا ضروری ہے

شیخ امام ابو الفرج ابن جوزیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

علم الحدیث ھو الشریعۃ، لانہ مبین للقرآن و موضح للحلال والحرام وکاشف عن سیر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم وسیر اصحابہ وقد مزجوہ بالکذب وأدخلوا فی المنقولات کل قبیح۔

علم حدیث ہی شریعت اور ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن کی تفسیر اور حلال وحرام کی وضاحت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی سیرت وحالات کو بالتفصیل بتلاتا ہے لیکن لوگوں نے اس میں بھی جھوٹ کی آمیزش کر دی ہے اور منقولات اور آثار میں ہر قسم کی قبیح بات داخل کر دی ہے۔

وکذالک الوعاظ یحدثون الناس بما لا یصح عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ولا اصحابہ۔ فقد صار المحال عندھم شریعۃ فسبحان من حفظ ھذہ الشریعۃ باحبار اخیار ینفون عنا تحریف الغالین وانتحال المبطلین۔ لہ

دوسرے طبقات کی طرح واعظین لوگوں کو ایسی حدیثیں بتاتے ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کی نسبت صحیح ثابت نہیں ہیں۔ ان کے ہاں محال بات ہی شریعت کہلاتی ہے اس کی ذات کیا ہی عجیب ہے جس نے احبار اخیار یعنی افضل ترین متبحر علماء کے ذریعہ اس شریعت کی حفاظت کی جو غالیوں کی شریعت میں داخل کردہ تحریف اور باطل پرستوں کی کذب بیانیوں کی نفی کر کے اس سے دور کرتے ہیں۔

(صید الخاطر، ص ۲۲۴ ـ ۲۲۵)

وما زالت الاحادیث المنقولۃ عن الرسول

عرصہ دراز سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

صلى الله عليه وسلم واصحابه رضى الله
عنهم يقل الاسعاد بها والنظر فيها،
الى ان اعرض عنها بالكلية فى
زماننا هذا وجهلت الا النادر، واتخذت
طرائق تضاد الشريعة، وصارت عادات،
وكانت اسهل عند الخلق من
اتباع الشريعة اذا كانت عامة من
ينسب الى العلم قد اعرض عن
علوم الشريعة فكيف العوام. ولما
اعرض كثير من العلماء عن المنقولات
استبدعوا فى الاصول والفروع، فالاصوليون
تشاغلوا بالكلام واخذوه من الفلاسفة
وعلماء المنطق، ودخلت ايدى الفروعيين
فى ذلك، فتشاغلوا بالجدل، وتركوا
الحديث الذى يدور عليه الحكم.

اما الامراء فجروا مع العادات،
وسموا ما يعقلونه من القتل والقطع
سياسات لم يعمموا فيها بمقتضى
الشريعة [illegible] فى ذالك
المتقدم فاين الشريعة المحمديه
ومن اين تعرف مع الاعراض عن
المنقولات، نسأل الله عزوجل التوفيق
للقيام بالشريعة، والاعانة على
رد البدع، انه قادر۔ [1]

اصحاب رضی اللہ عنہم سے منقول احادیث کا اہتمام کم ہو گیا
اور ان میں نظر و فکر کالعدم، یہاں تک کہ ہمارے دور
میں اس سے کلیۃً اعراض کیا گیا۔ اس علم سے اِلّا ماشاء اللہ
جہالت برتنے لگے وہ طور طریقے اپنائے گئے جو شریعت
سے ٹکرانے لگے اور یہ روزمرّہ کا معمول بن گئیں۔
اتباع شریعت کی بجائے یہ عادات ان کو سہل نظر آنے
لگیں۔ جب علم سے منسوب عامۃ الناس، علوم شرعیہ
سے اعراض کرنے لگے تو عوام کا کیا کہنا جب علماء کی
اکثریت نے منقولات سے اعراض کیا تو نتیجۃً اصول اور
فروع میں اختراع اور ابتداع شروع کر دیا۔ اصولیوں
نے علم کلام کا شغل اختیار کیا اور فلاسفہ اور علماء
منطق سے مستعار لیا، فروعین آئے تو جدل وجدال کا
آغاز کیا اور مدارِ حکم حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم کو چھوڑ دیا۔

امراء اپنی عادات پر قائم رہے، اپنی کرتوت خونریزی
اور قطع رحمی کا نام سیاسیات رکھا۔ بعد کو آنے والے
نے پچھلے کا اتباع کیا، شریعت محمدیہ کہاں رہی۔ اے
شخص منقولات سے اعراض کر کے تجھے عرفان کہاں
نصیب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ عزوجل سے ہم شریعت
پر قیام کی اور بدعات پر رد کرنے کی توفیق
کے سائل ہیں۔ وہ قادر ہے۔

---

[1] صید الخاطر. صفحہ ۲۶۳ - ۲۶۴

للفقيه ان يطالع من كل فن طرفا من تاريخ وحديث ولغة وغير ذالك۔ فان الفقيه يحتاج الى جميع العلوم فليأخذ من كل شئ منها مهمّا۔

فقیہ کو تاریخ، حدیث، لغت ہر فن کا ایک حصّہ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ فقیہ تمام علوم کا محتاج ہے۔ اسے ہر علم کا ایک معتدبہ حصّہ حاصل کرنا چاہیئے۔

ولقد رأيت بعض الفقهاء يقول اجتمع شبلي وشريك القاضي فاستعجبت له كيف لايدري بعد مابينهما۔

بعض فقہار کو میں نے دیکھا وہ کہہ رہے تھے شبلیؒ اور قاضی شریکؒ ایک دفعہ جمع ہوئے تو مجھے تعجب ہوا کہ اس کو ان کے مابین بعد زمانی کا بھی پتہ نہیں ہے۔

وقال آخر في مناظرة كانت الزوجيّة بين فاطمة وعلي رضي الله عنهما غير منقطعة الحكم، فلهذا اغسلها فقلت له: ويحك فقد تزوج امامة بنت زينب وهي بنت اختها فانقطع۔[1]

ایک دوسرے فقیہ نے مناظرے میں کہا فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہما کی زوجیت کا تعلق حضرت فاطمہؓ کی موت پر بھی منقطع نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو غسل دیا۔ میں نے کہا افسوس۔ آپؓ نے امامہ بنت زینب سے نکاح کیا جو حضرت فاطمہؓ کی بھانجی ہیں تو دنیوی حکم کے اعتبار سے نکاح منقطع ہوگیا۔

فينبغي لكل ذي علم ان يسامى باقي العلوم فيطالع منها طرفا اذ لكل علم بعلم تعلق۔

ہر ذی علم کے یہ شایان شان ہے کہ وہ دیگر علوم کے اعتبار سے بھی بلند ہو جبکہ ہر علم کا دوسرے علم کے ساتھ ربط اور تعلق ہے۔

کیا ہی قبیح بات ہے کہ محدث مسئلہ نہ بتا سکے اور فقیہ کو حدیث کے معنی اور اسکی صحت کا پتہ نہ ہو

وما اقبح بمحدث يسأل عن حادثة فلا يدري۔ وقد شغله منها جمع طرق الاحاديث۔ وقبيح بالفقيه أن

ایک محدث کے لئے یہ کیا ہی قبیح بات ہے کہ کسی حادثہ کے بارے میں اس سے حکم پوچھا جائے اور وہ نہ بتا سکے۔ احادیث کے مختلف طرق جمع کرنے میں وہ اپنی زندگی

[1] صید الخاطر ص۱۶۵

يقال له ما معنى قول رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا يدري صحة الحديث ولا معناه، نسأل الله عزوجل همة عالية، لا ترضى بالنقائص بمنه ولطفه۔ [1]

لگا دے اور ایسے ہی ایک فقیہ کے لئے یہ کیا ہی بُری بات ہے کہ اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول کے معنی دریافت کئے جائیں تو اسے اس کی صحت کا علم ہو اور نہ وہ حدیث کے معنی جانتا ہو۔ اللہ عزوجل سے ہم ایسی ہمت عالیہ کے سائل ہیں جو اسکے فضل وکرم سے نقائص پہ راضی نہ ہو۔

امام شمس الائمہ السرخسیؒ نے اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں ذرا تفصیل سے یوں بیان کیا ہے۔

ولا ينبغي ان يستعمل على القضاء الا الموثوق به في عفافه وصلاحه وعقله وفهمه وعلمه بالسنة والآثار ووجوه الفقه الذي يأخذ منها الاحكام، فانه لا يستقيم ان يكون صاحب رأي ليس له علم بالسنه والاحاديث، فمثله يضل الناس ولا صاحب حديث ليس له علم بالفقه، فكما لا يختار للقضاء الا من يجتمع فيه هذه الشرائط، فكذلك للفتوىٰ فان القاضي يقضي وقد كان القاضي في الصدر الاول يسمى مفتيا، فلا ينبغي لاحد ان يفتي الا من كان هكذا، الا ان يفتي شيئا قد سمعه فيكون حاكيا ما سمع من غيره بمنزلة الراوي لحديث سمعه يشترط فيه ما يشترط في الراوي من العقل والضبط والعدالة والاسلام۔ [2]

منصب قضاء پر اس شخص کو لگانا چاہئے جس پر ان مندرجہ ذیل صفات کے متعلق اعتماد کیا جاسکے۔ پاک دامنی، خیر، عقل، فہم، سنت اور آثار کے علم اور فقہی اصول جہاں سے وہ احکام اخذ کرتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ شخص اس منصب کے لئے موزوں نہیں ہے جو صاحب رائے ہو لیکن سنت اور احادیث کا علم نہیں رکھتا۔ ایسا شخص لوگوں کو گمراہ کریگا (بحدیث افتوا بغیر علم ضلوا فاضلوا) اور ایسا شخص بھی مناسب حال نہیں جو محدث ہو لیکن فقہ کا علم نہیں رکھتا۔ (حدیث نضر اللہ امرا سمع مقالتی میں روایت وحفاظت اور معاً فقہ کو ذکر کیا گیا ہے) جیسے قضا کیلئے ایسے شخص کا انتخاب عمل میں آتا ہے جو ان شرائط کا جامع ہو ایسے فتویٰ کے لئے یہ ضروری ہیں۔ قاضی بھی افتاء کا کام کرتا ہے۔ صدر اول میں تو قاضی کو مفتی کہا کرتے تھے۔ البتہ اگر سنی ہوئی بات پر فتویٰ دیتا ہے تو وہ راوی کی طرح ناقل ہے۔ اس میں بھی وہ شرائط ملحوظ ہوں گی جو راوی میں ہیں عقل، ضبط، عدالت اور اسلام۔

---

[1] میدان العمل ص ۳۶۶ ۔ [2] المبسوط للسرخسی ج ۔ ص ۱۰۹

اصل دوم تفقہ اور اجتہاد

مفتی صاحب رائے، فقیہ اور مجتہد ہو۔ استنباط و اجتہاد کی قوت رکھتا ہو، اپنی خداداد استعداد کی بدولت پیش آمدہ مسائل میں پختہ ہو اور قوی رائے قائم کر سکے۔ وسیع النظر اور مسئلہ کے ہر پہلو سے باخبر ہو۔ جو مسئلہ کتاب و سنت اور اجماع میں نہ ملے اس کے استخراج کی پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ لہٰذا مصیب الرائے، پختہ ذہن، صحیح فکر رکھنے والا ہو اور تفقہ میں صاحب تصرف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذا جاءهم امر من الامن او الخوف اذا عوابه ولو ردوه الى الرسول والى اولى الامر منهم لعلمه الذين يستنبطونه منهم۔

(سورۃ آل عمران)

جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی واقعہ پہنچتا ہے تو وہ اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسکو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اور اولی الامر کی طرف لوٹا دیتے (تو بہتر ہوتا) تاکہ جو اسکی حقیقت اور تہہ کو پہنچ سکتے ہیں وہ اس کو جان لیتے (پھر جیسا مناسب سمجھتے کرتے)

اس آیت میں "اولی الامر" ایسے حضرات کو کہا گیا ہے جن میں اجتہاد اور استنباط کا مادّہ موجود ہو تاکہ ضرورت کے وقت وہ جزئیات کو اصول کی طرف اور غیر منصوص مسائل کو احکام منصوصہ کی طرف لوٹا کر معاملہ کی نزاکت کو معلوم کر سکیں اور یہ کام حضرات فقہاء کرام اور مجتہدین کا ہے۔ امام ابو بکر الجصاص الرازیؒ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

فقد حوت هذه الاية معانى منها ان فى احكام الحوادث ماليس بمنصوص عليه بل مدلول عليه۔ ومنها على أن العلماء استنباطه وتوصل الى معرفته برده الى نظائره من المنصوص ومنها أن العامى عليه تقليد العلماء فى احكام الحوادث۔

(احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۱۵)

بلا شبہ یہ آیت کریمہ متعدد معانی و مطالب پر مشتمل ہے، ایک یہ کہ پیش آمدہ مسائل کے احکام ایسے بھی ہیں جو صراحۃً ثابت نہیں بلکہ دلیل سے ان کی طرف راہنمائی ہوتی ہے اور دوسرا یہ علماء پر ان کا استنباط اور منصوص نظائر کی طرف لوٹا کر ان کی معرفت تک توصّل لازم ہے اور تیسرا یہ کہ عامی پر پیش آمدہ مسائل کے احکام میں علماء کی تقلید لازم ہے۔

بعض حضرات کا مطمح نظر خصوصی شرائط ہوتی ہیں وہ کتاب و سنت اور اجماع کے علم کی ابتدائی

شرط چھوڑ دیتے ہیں کہ اسکے بغیر تو علمی سطح کا قیام محال ہے، افتاء کی ذمہ داری تو کہیں بڑی بات ہے۔ ابن سمعانی کہتے ہیں:

المفتی من استکمل فیہ ثلث شرائط الاجتہاد ۱ — مفتی وہ ہے جس میں تین شرطیں مکمل طور پر پائی جائیں، اجتہاد

والعدالۃ والکف عن الترخیص والتساھل [1] — عدالت اور رخصت اور سستی سے باز رہنا۔

اجتہاد پر مبنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مشہور و معروف فتویٰ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک عورت کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ نکاح کے وقت جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا۔ رخصتی سے قبل اس کا شوہر گیا، فرمایا: میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں، اگر صحیح ہو تو منجانب اللہ ہے اور اگر غلط ہو تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولؐ اس سے بری ہیں [2]

"اس کا مہر اس جیسی عورتوں کی طرح مہر مثل ہوگا۔ کم و بیش نہیں ہوگا۔ اسے میراث ملے گی اور اس پر عدت بھی لازم ہے"۔

معقل بن سنان اشجعی یہ سن کر کھڑے ہوئے اور کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمارے قبیلہ کی ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں یہی فیصلہ کیا تھا جو آپ نے کیا ہے۔

عن علقمۃ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أنہ سئل عن رجل تزوج امرأۃ ولم یفرض لہا شیئاً ولم یدخل بہا حتی مات فقال ابن مسعودؓ لہا مثل صداق نسائہا لا وکس ولا شطط وعلیہا العدۃ ولہا المیراث، فقام معقل بن سنان الاشجعیؓ فقال قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بروع بنت واشق امرأۃ منا بمثل ما قضیت، ففرح ابن مسعود۔ [3]

(رواہ الترمذی، وابوداؤد، والنسائی، والدارمی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس واقعہ سے اس قدر خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ کبھی خوش نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کی رائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے موافق ثابت ہوئی۔ [4]

---

[1] ارشاد الفحول ص۲۳۸۔ [2] اعلام الموقعین ص۶۷ — ۶۸

[3] مشکوٰۃ باب الصداق ص۲۷۷، ۲/ ترمذی جلد ۱/ ص۲۱۱۔ [4] اعلام الموقعین ص۶۷ — ۶۸

افتاء کے لئے اجتہاد کی شرط

الشیخ کمال الدین محمد بن عبدالواحد المعروف بابن ہمام رح المتوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

مجتہد کے اقوال پر مبنی فتویٰ دینے والا شخص مفتی نہیں۔ جس مجتہد کے قول پر فتویٰ دیا ہے اسے اس کا حوالہ دینا چاہئے۔ یہ فتویٰ نہیں بلکہ مستفتی کے جواب کے لئے مفتی کے کلام کی نقل ہے۔ اس صورت میں ناقل کے پاس اس کی سند ہونی یا وہ منقول عنہ شخص کی مشہور و معروف کتاب سے لے گا۔ مثلاً کتب امام محمد سے جو کہ متواتر یا مشہور کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن زمانہ سابق وحال میں اکثر و بیشتر ناقلین فتویٰ کو مفتی سے یاد کیا جاتا ہے۔

"قد استقر رأى الاصوليين على أن المفتى هو المجتهد فاما غير المجتهد فمن يحفظ اقوال المجتهد فليس بمفتى- والواجب عليه اذا سئل ان يذكر قول المجتهد على وجه الحكاية نعرف ان ما يكون في زماننا من فتوى الموجودين فليس بفتوىٰ بل هو نقل كلام المفتى ليأخذ به المستفتى وطريق نقله لذلك من المجتهد احد الامرين اما ان يكون له فيه سند اليه او يأخذه عن كتاب معروف نحو كتب محمد بن الحسن ونحوها لانه بمنزلة الخبر المتواتر او المشهور۔"[1]

شیخ ابن ہمام رح کے قول پر تنقید

متاخرین کے زمانہ میں بھی مفتی میں اجتہاد کی شرائط کم و بیش مفقود نہیں جیسا کہ علامہ ابن ہمام کے کلام میں مذکور ہو چکا ہے اور آج ہمارے دور میں تو یہ عنقا کا درجہ رکھتی ہیں۔ لہٰذا مفتی کو جس میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق پوری صلاحیتِ فتویٰ موجود ہو۔ ناقل فتویٰ قرار دینا دینی اعتبار سے بہت سی مشکلات کا موجب ہے۔ ہمیشہ عصر حاضر کے بالمقابل نقل کی حدود تو مختصر ہوتی ہیں۔

شیخ ابن ہمام رح پر علامہ ابن دقیق العید رح کا تنقیدی جائزہ

علامہ ابن دقیق العید کا تنقیدی جائزہ بھی نظر انداز کرنے کے

---

[1] فتح القدیر: ج ۵، ص ۵۶ ـــ ۵۷

قابل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

مجتہد پر فتویٰ کا مدار اور انحصار بہت بڑی حرج کا باعث ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ لوگوں کو ان کی ہوا پرستیوں میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا مختار قول یہ ہے کہ جو متقدمین ائمہ کے کلام کو روایت کرے عادل ہو، اور ان کے کلام کو سمجھتا ہو اور مقلد کو امام کے قول پر مطلع کرے وہ مفتی ہے۔ عام آدمی اس سے یہی سمجھتا ہے کہ اس اطلاع سے میرے پاس یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ ہمارے زمانہ میں اسی جواب کے فتوے ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

اور یہ بدیہی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ازواج اپنے مسائل حیض وغیرہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی طرف جو آپ کی اطلاع کی بدولت ان کو حاصل تھی رجوع کیا کرتی تھیں۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل کہ انھوں نے مقداد بن اسودؓ کو مذی کا مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔

حالانکہ اس وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مراجعت ممکن تھی اور ہمارے زمانہ میں ائمہ مجتہدین کا ملنا دشوار ہے تو ہمارا مدعیٰ اس سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اس پر اتفاق رائے ہے کہ قاضیوں کے فیصلے نافذ العمل ہیں۔ گو ان میں آج شرائط اجتہاد نہیں پائی جاتیں:

قال ابن دقيق العيد توقيف الفتيا على حصول المجتهد يفضي الى حرج عظيم او استرسال الخلق في اهويتهم فالمختار ان الراوي عن الائمة المتقدمين اذا كان عدلا متمكنا من فهم كلام الامام ثم حكى للمقلد قوله فانه يكتفي به لان ذلك مما يغلب على ظن العامي أنه حكم الله عنده وقد انعقد الاجماع في زماننا على هذا النوع من الفتيا هذا مع العلم الضروري بأن نساء الصحابة كن يرجعن في احكام الحيض وغيره الى ما يخبر به ازواجهن عن النبي صلى الله عليه وآله وكذلك فعل علي رضي الله عنه حين أرسل المقداد بن الاسود في قصة المذي وفي مسئلتنا اظهر فان مراجعة النبي صلى الله عليه وسلم اذ ذاك ممكنة ومرنجعة المقلد الآن للائمة السابقين متعذرة وقد اطبق الناس على تنفيذ احكام القضاة مع عدم شرائط الاجتهاد اليوم انتهى۔[1]

---

[1] ارشاد الفحول، ص ۲۳۸

تجزیہ اقوال اور ابن دقیق العید کے قول کی ترجیح

یکے بعد دیگرے پیش آمدہ حوادث اور غیر متوقع وقوع پذیر نوازل کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ مرتبہ دواوین احکام اور مدونہ مسائل کی کمند اتنی وسیع وعریض اور چست نہیں کہ ان پر پوری آسکے۔ ایسی صورت میں فتوی کے لئے نقل کے حصار کی قید اور مفتی کے لئے اجتہاد کی شرط مضر ثابت ہوسکتی ہے مثلاً بعض امور زندگی شرع سے خارج ہوں۔ علماء امت کا اکثر طبقہ احکام خداوندی کے متعلق اپنی حتمی رائے کے اظہار سے قاصر ہو اور اس سلسلہ میں لوگوں کی دینی راہنمائی کا اہل نہ ہو اس سے دینی تعطل اور اسلامی دعوت کے ساتھ استخفاف پیدا ہوگا۔ اکمال دین اور اتمام نعمت کا دعوے ایک مزاح بن کر رہ جائیگا۔

شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی (المتوفی ۵۹۳ھ) فرماتے ہیں:

زمانہ کی ترقی کی رفتار کے مطابق اس کی دینی ضروریات ہر دور میں علماء امت کے ذریعے پوری ہوتی رہیں اور یہ سنت اللہ ہے، واُخلف اللہ علماء الی سنن سنتهم داعین یسلكون فيما لم يؤثر عنهم مسلك الاجتهاد مسترشدين منه فى ذلك وهو ولى الارشاد وخص اوائل المستنبطين بالتوفيق حتى وضعوا مسائل من كل جلى ودقيق غير ان الحوادث متعاقبة الوقوع والنوازل ليضيق عنها نطاق الموضوع۔ [1]

امام محمد بن احمد السرخسی الحنفیؒ المتوفی ۴۸۳ھ، فرماتے ہیں:

"کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحلیل یا تحریم ایجاب یا ذمہ کو فارغ کرنے کا کوئی حکم نہ ہو اور یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ہر مسئلہ میں نص نہیں پائی جاتی۔ منصوص مسائل تو معدود اور متناہی ہیں اور قیامت تک جو مسائل پیش آنے والے ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں اور لفظ حادثہ میں اشارہ ہے کہ اس میں کوئی نص نہیں کیونکہ جس میں نص موجود ہو وہ تو معہود اصل ہے اور اسی طرح حضرات صحابہ کرامؓ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں طلباً یا روایۃً نص ہی پر ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہر مسئلہ میں نص موجود نہیں":

انه ما من حادثة الا وفيها حكم الله تعالىٰ من تحليل او تحريم اوايجاب او اسقاط ومعلوم ان كل حادثة لا يوجد فيها نص فالمنصوص معدودة متناهية

---

[1] الهداية: ج ۱، ص ۱۴

ولانهاية لما يقع من الحوادث الى قيام الساعة وفى تسمية حادثة اشارة الى انه لانص فيها فان ما فيه النص يكون اصلا معهودا وكذلك الصحابة ما اشتغلوا باعتماد نص فى كل حادثة طلبا او رواية فعرفنا انه لا يوجد نص فى كل حادثة۔ [1]

محولہ بالا عبارات سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مستفتی کے جواب میں ائمہ کے کلام کو نقل کرنے والا بشرط فہم و عدل مفتی کہلانے کا مستحق ہے۔ اسی نوع جواب کو فتویٰ کہنے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ عامی شخص اس جواب کو اپنے لئے حکم خداوندی سمجھتا ہے اور اس پر مطمئن ہو جاتا ہے جیسا کہ ابن دقیق العیدؒ نے کہا ہے اور صاحب ہدایہ اور امام سرخسیؒ کے کلام سے یہ مستفید ہوتا ہے کہ حسب استعداد و صلاحیت ہر دور میں سلسلہ اجتہاد استنباط جاری رہا ہے اور نقل پر اکتفا اور مسائل ماثورہ کا کافی اور وافی ہونا ناممکن ہے۔ تمام پیش آمدہ مسائل میں نص موجود نہیں ہے۔ غیر منصوص مسائل میں قیاس اور اجتہاد تاقیامت جائز ہے اور اس سے کوئی مخلص اور چارہ نہیں۔

مفتی کے لئے اجتہاد کی شرط فتویٰ میں مسلّم ہے

علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری (المتوفی ۹۹۶ھ) اس قضیہ کی بطور استدراک یوں عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ افتاء اور قضاء میں اجتہاد سے مجتہد مطلق قطعاً مراد نہیں ہے کیونکہ اس پر تو تقلید حرام ہے جیسا کہ اصول میں اسے صراحت سے بیان کیا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ ہے جو مجتہد فی الفتویٰ ہو۔

ليس المراد بالمجتهد فى كلامهم هنا المجتهد المطلق قطعا لأنه يحرم عليه التقليد كما صرحوا به فى الأصول انما المراد به مجتهد الفتوى۔ [2]

علامہ احمد بن حمدان الحرانی الحنبلی اجتہاد فی المذہب اور اجتہاد فی الفتویٰ کی تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وصفة الاجتهاد التى تؤهل المفتى للافتاء   وہ اجتہاد جو مفتی میں افتاء کی اہلیت پیدا کرتا ہے

---

[1] اصول سرخسی ج ۲ ص ۱۳۹ طبع مصر۔ [2] مجموعہ رسائل ابن نجیم ص ۶۰

ليس مقصود ابهاان يكون قد نال مرتبة الاجتهاد المطلق بل المهم ان يكون مجتهدًا فيما يفتی۔ ؎۱	اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مفتی مطلق اجتہاد کے درجہ پر فائز ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ جن مسائل میں وہ فتوے دیتا ہے ان میں مجتہد ہو۔

یعنی جس مذہب میں مفتی نے تفقہ پیدا کیا اس کے مسائل جلی اور خفی کی معرفت حاصل کی اس میں وہ مجتہد ہے کیونکہ وہ ان مسائل میں فتوے دے گا جو مستند ہوں گے، ان کے دلائل کو پرکھے گا اور اچھی طرح ضبط کرے گا۔

المحدث الحافظ الفقیہ الاصولی ابی عمرو بن عثمان المعروف بابن الصلاحؒ (المتوفی ۶۴۳ھ) اجتہادِ مطلق اور اجتہادِ مقید کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

درجة الاجتهاد المطلق تحصل بتمكنه من تعرف الاحكام الشرعيه من ادلتها استدلالا من غير تقليد۔	مطلق اجتہاد کا درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ ادلہ سے احکام شرعیہ کا علم بطور استدلال بغیر تقلید کے حاصل کرنے پر قدرت ہو۔
والاجتهاد المقيد درجة تحصل بالتبحر فی مذهب امام من الائمة بحيث يتمكن من الحاق ما لا ينص عليه ذلك الامام بما نص عليه معتبرا قواعد مذهبه واصوله ؎۲	اجتہاد مقید یہ ہے کہ ائمہ مذاہب میں سے کسی کے مذہب میں تبحر علمی کرنا۔ بایں طور کہ امام کے غیر منصوص مسائل کو منصوصہ سے حاصل کیا جائے اور اس میں امام کے مذہب اور اس کے اصولوں کا خاص خیال رکھا جائے۔

؎۱ ماہنامہ البعث الاسلامی ـــــ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ

؎۲ فتاوے ابن الصلاح: ص ۳۳۳

حج کی حقیقت اور اہمیت

یہ مختصر سا مقالہ تقدس حج کانفرنس لکھنؤ کے لئے لکھا گیا اور راقم الحروف اس میں شرکت کے لئے روانہ بھی ہوا مگر بس اسٹیشن پر اس کا وہ ہینڈ بیگ گم ہو گیا، جس میں یہ مقالہ تھا۔ اس لئے بغیر مقالہ کے جانا اچھا نہیں لگا اور بس پر بیٹھنے کے بعد اتر گیا اور سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا جس کے لئے میں عزیز گرامی محمد یونس نگرامی ندوی سے شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں۔ بعد میں یہ ہینڈ بیگ مع کاغذات اچانک مل گیا مگر افسوس ہے کہ اس وقت طاجب سفر کا وقت نکل چکا تھا۔

(مرتب)

حج، اسلام کا چوتھا رکن ہے اور اپنی حقیقت اور اہمیت کے لحاظ سے اس کی حیثیت بعض اعتبار سے سب سے بلند ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایک پوری سورت اسی نام سے نازل فرمائی ہے۔ اسلام میں دو طرح کی عبادات فرض ہیں ایک جسمانی عبادات، دوسرے مالی عبادات. جسمانی عبادات میں سب سے نمایاں مقام نماز اور روزے کا ہے اور مالی عبادات میں سب سے زیادہ اہمیت زکوٰۃ کی ہے۔ حج ایک ایسا رکن ہے جس میں دونوں طرح کی عبادتیں جمع ہیں، وہ جسمانی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی، اس میں شدید جسمانی مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور اپنا پاک مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔

عبادات کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عبادت کرنے والے کے قلب و دماغ میں توحید کا نقش بیٹھے اور خدا سے والہانہ محبت پیدا ہو، اس کے اندر طہارت و پاکیزگی آجائے اور سب سے بڑھ کر اپنے کو خدا کے سپرد کر دینے کا پرشور جذبہ پیدا ہو۔

آپ اگر حج کے ارکان پر غور کریں گے تو آپ کو اس کے ایک ایک رکن میں یہ باتیں نمایاں طور پر

تطرآئیں گی۔ احرام باندھ کر لبیک کی صدا لگاتے ہی آدمی اپنے قلب و دماغ کے اندر ایک عجیب و غریب ہلچل اور تبدیلی محسوس کرنے لگتا ہے اور جن مقامات پر اس کے ارکان ادا کئے جاتے ہیں اگر آدمی اپنے گوش باطن سے سن سکے تو ان کے ایک ایک چپے سے یہ آواز کانوں میں آئے گی۔

قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ
چو ما بر ذرۂ او ورد منداست

دوسری عبادات ہم اپنے مقام اور وطن میں ادا کرتے ہیں مگر حج مقام و وطن سے آزاد ہے، وہ آدمی کو اپنے وطن سے دور کر کے اس کو خدا کے اس گھر (بیت اللہ) تک لے جاتا ہے جو ازل سے مہبط انوار الٰہی رہا ہے، جو اس دنیا میں سب سے پہلی عبادت گاہ ہے اور جو ہمیشہ برکت و ہدایت کا مرکز رہا ہے اور قیامت تک یہی مرکز عبادت و ہدایت رہے گا۔

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی وعھدنا الی ابراھیم واسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود۔ (البقرۃ)

اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے اس گھر کو ساری دنیا کا مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مقام ابراہیمؑ اپنی عبادت کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسمٰعیل سے یہ عہد لیا کہ وہ اس گھر کو باہر سے آنے والوں اور مقامی لوگوں اور عبادت میں رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک و صاف رکھیں گے

مکہ اور کعبہ اللہ کا یہ گھر جسے ہم کعبۃ اللہ و بیت اللہ اور مسجد حرام کہتے ہیں، جس کے ارد گرد حج کے سارے مراسم ادا ہوتے ہیں اسے سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام نے مکہ میں بنایا۔ جسے قرآن نے زبور کی زبان میں بکہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ۔ مرور زمانہ سے اس کی بنیادیں پست ہوگئیں، پھر طوفانِ نوحؑ کے بعد حضرت نوحؑ نے اس کی تجدید کی، وہ بھی مسمار ہوگئی تو پھر تیسری بار حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ اس کی تجدید ہوئی۔ قرآن پاک نے اس گھر کی تعمیر کا بڑی عظمت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ ہمارے رب

انّك انت السّميع العليم ۔ (بقرہ) ہماری اس تعمیر کو ہم سے قبول فرما۔

دوسری جگہ قرآن پاک نے جہاں اس گھر کے طواف کا ذکر کیا ہے وہاں اسے اَلْبَیْتُ الْعَتِیْقُ (پرانا گھر) کے نام سے یاد کیا ہے جو اس کی قدامت کو ظاہر کرتا ہے ولیطّوفوا بالبیت العتیق ۔(الحج)

یہی بیتِ عتیق سارے انبیائے کرام کی دعوت و ہدایت کا مرکز رہا ہے اور حج کے سارے ارکان اسی کے اردگرد انجام پاتے ہیں۔ اور قرآن پاک کے اعلان اور حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق قیامت تک یہی مرکزِ توحید اور قبلۂ عبادت رہے گا۔

حج کا فریضہ بھی اسی طرح قدیم ہے جس طرح کعبہ کا قبلۂ عبادت و ہدایت ہونا قدیم ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ملّتِ ابراہیمی کی یادگار اور اس کی سب سے بڑی علامت ہے۔

ملّت ابراہیمی کی سب سے بڑی دو خصوصیتیں ہیں ایک ایثار و قربانی دوسرا تسلیم و رضا یعنی خدا کے سامنے کامل سپردگی۔ حضرت ابراہیمؑ کی کتابِ زندگی کے ایک ایک ورق سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ دین کے لئے ان کا عراق سے ہجرت کرنا۔ توحید کی روشنی کو پھیلانے کے لئے اپنے بھتیجے حضرت لوط کو بحر مردار کے قریب اردن میں بسانا، حضرت اسحٰق کو کنعان (شام) میں آباد کرنا اور اپنے ایک بیٹے مدین کو بحر احمر کے ساحل پر مدین میں چھوڑنا اور اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو اور ان کی والدہ کو ایک سنسان وادی غیر ذی زرع میں یہ دعا کرتے ہوئے چھوڑ جانا :

ربّنا انّی اسکنت من ذرّیّتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرّم ربّنا لیقیموا الصّلوٰۃ فاجعل افئدۃً من النّاس تھوی الیھم وارزقھم من الثّمرات لعلّھم یشکرون۔ (ابراہیم)	ہم نے اپنی بعض اولاد کو اس بن کھیتی کی وادی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے پروردگار، یہ اس لئے تاکہ یہ تیری نماز قائم کریں۔ تو لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ یہ تیرے شکر گزار رہیں۔

یہ سب ان کی ایثار و قربانی اور تسلیم و رضا کے وہ نقوش ہیں جو آج بھی جریدۂ عالم پہ ثبت ہیں۔ حضرت اسمٰعیل بڑی تمناؤں اور دعاؤں کے نتیجہ میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انتہائی بے چارگی میں دعا کی تھی رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْن۔ خلیل اللہ کے قلب سلیم کی یہ دعا بارگاہِ ربّ العزت میں قبولیت تامہ حاصل کرتی ہے اور بارگاہ قدوس سے اس کی قبولیت کا مژدہ ان الفاظ میں سنایا جاتا ہے فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلٰمٍ

فبشرنٰہ بغلٰم حلیم (صافات) "ہم نے ایک بردبار بچے کی بشارت دی"۔

حضرت ابراہیم کی زندگی کا ہر ہر واقعہ ان کے ایثار و قربانی اور تسلیم و رضا کا ثبوت ہے مگر تسلیم و رضا کی انھوں نے وہ گھاٹی بھی طے کر لی جس کے تصور سے بڑے بڑے جگر داروں کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے وہ ایک اشارۂ غیبی پر حضرت اسمٰعیل کی قربانی کا عزم مصمم کر لیتے ہیں اور حضرت اسمٰعیل سراپا اطاعت بن کر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ قرآن پاک نے اس روح پرور واقعہ کی بڑے بلیغ انداز میں تصویر کشی کی ہے:

فلمّا بلغ معہ السعی قال یٰبنیّ انّی اریٰ فی المنام انّی اذبحك فانظر ماذا تریٰ قال یٰابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصّٰبرین۔
(صافات)

سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا کہ برخوردار! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامرِ الٰہی) ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ کہ تمہاری کیا رائے ہے، وہ بولے کہ ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ بلا تامل پورا کیجئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

گویا آپ جب حج کو جائیں گے اور ان مقامات سے گزریں گے جہاں جہاں حج کے ارکان ادا کئے جاتے ہیں تو وہاں کے ایک ایک چپے اور ایک ایک ذرّے میں حضرت ابراہیم کے خونِ دل کی آمیزش، حضرت ذبیح اللہ کے سوزِ جگر کی گرمی اور حضرت ہاجرہ کی آہ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی اور مضطربانہ دوڑ دھوپ کی آہٹ محسوس ہوگی اور اگر چشمِ بصیرت وا ہو تو "زخائش بے صور روید معانی" کا منظر آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ حج کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے کے لئے حضرت ابراہیم اور آلِ ابراہیم کے ایثار و قربانی اور تسلیم و رضا کے پُر اثرات واقعات ہی کافی ہیں مگر ہمیں ایک نظر ان آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویؐ پر بھی ڈال لینی ضروری ہے جن سے اس کے ظاہری اور باطنی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

الحجّ اشھر معلومات فمن فرض فیھنّ الحجّ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحجّ وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ و تزوّدوا فانّ خیر الزّاد التقویٰ۔ (البقرۃ)

حج کچھ معلوم مہینوں میں فرض کیا گیا ہے۔ اب جس پر حج فرض ہو جائے وہ حج کو اس طرح چلائے کہ اس میں نہ تو شہوانی باتیں ہوں اور نہ گناہ اور لڑائی جھگڑے کی بات ہو اور تم جو کچھ نیکی اس فریضہ کے سلسلہ میں کروگے اس کا علم اللہ کو ہے اور سامانِ سفر بھی اپنے ساتھ رکھو اور بہترین زادِ سفر تقویٰ ہے۔

حج کو ملتِ ابراہیمی کی یادگار قرار دیتے ہوئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

قل صدق اللہ فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفًا وّما کان من المشرکین ان اوّل بیتٍ وضع للنّاس للّذی ببکّۃ مبارکا وّھدی للنّاس فیہ اٰیٰت بیّنات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنا۔ (آلِ عمران)

اوپر جو کچھ ملت ابراہیمی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے وہ سب سچ کہا ہے، تو آپ ہر طرف سے یکسو ہو کر ملّت ابراہیمی کی پیروی کریں، شرک سے حضرت ابراہیمؑ کا دامن پاک تھا خدا کا سب سے پہلا گھر انسانوں کے لئے اسکی عبادت کیلئے مکہ میں بنایا گیا، وہ گھر بابرکت ہے اور لوگوں کیلئے مرکز ہدایت ہے اسمیں اللہ کی بہت سی نشانیاں ہیں اور مقام ابراہیم بھی ہے جو اس مبارک شہر میں داخل ہو جائے وہ مامون ہو گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ سب مرضیٔ الٰہی کے مطابق ہوا ہے:

واذ بوّأنا لابراھیم مکان البیت ان لاّ تشرك بی شیئا وّ طھّر بیتیَ للطّائفین والقائمین والرّکّع السّجود۔ وأذّن فی النّاس بالحجّ یأتوك رجالا وّ علیٰ کلّ ضامر یأتین من کلّ فجّ عمیق۔ (الحج)

یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کی جگہ پر ٹھکانہ دیا اور حکم دیا کہ میرے ساتھ ذرّہ بھر بھی شرک نہ کرنا اور حکم دیا کہ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے اور اسمیں سے ٹھہر جانے والوں کے لئے اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کیلئے ظاہری و باطنی گندگی سے پاک وصاف رکھو اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو کہ لوگ پیدل اور ہلکی پھلکی سواریوں سے دور دراز جگہوں سے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے آئیں۔

ان آیات سے یہ باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱. حج ہوتا تو ذوالحجہ میں ہے مگر اس کی عظمت کی وجہ سے اس کے آگے پیچھے کے کئی مہینوں کو محترم قرار دیا گیا ہے۔

۲. حج، جسم و روح کی طہارت و صفائی کے لئے فرض کیا گیا ہے۔ اس میں گناہ اور شہوت، اور لڑائی جھگڑے کی بات نہ ہونی چاہئے۔ اس پاکیزہ سفر میں جو عمل بھی ہم سے صادر ہو گا وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔

۳. حج کرنے والوں کو بے سہارا ہو کر سفر نہ کرنا چاہئے بلکہ اہل و عیال کی ذمہ داریوں کے ساتھ زادِ سفر بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہئے مگر ایک مومن کے لئے سب سے بڑا زادِ سفر تقویٰ ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ جس کام کے جائز یا صحیح ہونے میں شبہ بھی ہو جائے اسے وہ ترک کر دے۔

۴۔ کعبۃ اللہ، جس کے ارد گرد حج کے فرائض ادا ہوتے ہیں، سارے عالم کے لئے قیامت تک برکت وہدایت کا سرچشمہ ہے اور رہے گا۔

۵۔ حج، جو ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی یادگار ہے، اس میں بے شمار کھلی نشانیاں ہیں اور انہی میں سے ایک مقام ابراہیم ہے۔ تو اس مقام ابراہیم کو اپنی عبادت کی جگہ بناؤ۔

۶۔ حضرت ابراہیمؑ اس کو بلدِ امین بنانے کی دعا کی تھی تو اللہ تعالےٰ نے اس دعا کے جواب میں فرمایا:

وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ جو بھی اس بلد امین داخل ہو جائیگا وہ ہر تکلیف اور اذیت کے محفوظ رہیگا۔

۷۔ شہری ہوں یا دیہاتی، مکّے کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے، مسجد حرام پہنچ کر سارے لوگوں کی حیثیت برابر ہو جاتی ہے سواءً ن العاکف والباد[1]۔ احرام باندھنے سے لے کر طواف زیارت تک دیہاتی ہوں یا شہری، غریب اور فاقہ مست ہوں یا بادشاہ وقت، سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

۸۔ حضرت ابراہیم نے یہ دعا کی تھی کہ ساری دنیا سے لوگ سمٹ کر حج کے لئے آئیں۔ چنانچہ اس پاکیزہ بین الاقوامی اجتماع کے موقع پر دعائے خلیل کی قبولیت کا منظر ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

۹۔ سارے ارکانِ حج اور وہ مقامات جہاں یہ ادا کئے جاتے ہیں ان کی حیثیت شعائر اللہ کی ہے اور وہ ہر طرح قابل احترام ہیں۔ اگر کوئی شعائر اللہ کی حرمت کو پامال کرتا ہے یا بلدِ امین میں پہنچ کر اس دار الامن کو فتنہ وفساد کی آماجگاہ بنانا چاہتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کسی طرح معاف نہ کرے گا۔ دنیا میں بھی اسے رسوا کرے گا اور آخرت میں بھی۔

وَمَنۡ یُّرِدۡ فِیۡهِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ ۔ اور اس میں جو کوئی ظلم سے گناہ کا کام کرے گا نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ۔ (حج) اسے سخت سزا کا مزہ چکھائیں گے۔

ان شرائط کے ساتھ جو حج کرے گا اس کے بارے میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

---

[1] اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ مکہ کی سرزمین پر کسی ملکیت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ کرایہ پر دی جا سکتی ہے۔ مگر جمہور امت نے اس رائے کو صحیح نہیں سمجھا ہے اس کا تعلق ارکانِ حج کی ادائیگی سے ہے۔

رجع کیوم ولدتہ امہ اس طرح پاک وصاف ہوکر لوٹے گا جس طرح بچہ پیدائش کے وقت ہر طرح کے گناہوں سے پاک وصاف ہوتا ہے۔

محترم حضرات!

اس تھوڑی سی تفصیل سے امید ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی یادگار فریضۂ حج کی اہمیت اور حقیقت کا کچھ اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا مگر اس کی بے شمار نازک دستیوں کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا:

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

مسجد نبوی اور روضۂ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت، حج کا جز نہیں ہے مگر یہ کہنے میں ذرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا کہ سفر حج میں جانے کے بعد اگر کوئی اس سعادت سے محروم چلا آیا تو گویا وہ چشمۂ حیواں کے قریب پہونچ کر آبِ حیواں سے محروم چلا آیا۔ یہ قرآن پاک روشنی اور دین کی ساری دولت آپ ہی کے دامنِ فیض کی برکت سے ہمیں ملی ہے۔ یہ کتنی بڑی ناشکری ہوگی کہ آپ کی اس باطنی جلوہ گاہ کی ہم ظاہری طور پر بھی زیارت نہ کریں یا اس کے لئے دل میں کوئی تڑپ پیدا نہ ہو۔

حج بین الاقوامی فریضہ ہے

آخر میں ایک دو باتیں اور عرض کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہیں کہ حرمین شریفین کی حفاظت، اس کا احترام دنیا کے ہر مومن کے ایمان کا تقاضا اور اس کے ایمان کی ضمانت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حرمین شریفین ایک بین الاقوامی عبادت گاہ اور حج ایک بین الاقوامی فریضہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے لیکن جو لوگ اس کا یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ اس کے نظم و انتظام پر بھی سارے عالم کے مسلمانوں کے نمائندوں یا حکومتوں کا کنٹرول ہو، یہ بات نہ تو شرعی حیثیت سے درست ہے اور نہ ہماری تاریخ اس کا ساتھ دیتی ہے، اس چودہ سو برس کے اندر حجاز میں نہ جانے کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں وہ غلط تھیں یا صحیح، ایک مدت تک فاطمی حکومت بھی وہاں رہی لیکن اس نے وہاں چار مصلے کے علاوہ اپنا پانچواں مصلی قائم نہ کیا۔ غرض یہ کہ دوسری مسلم حکومتوں کی طرف سے یہ مطالبہ کبھی نہیں ہوا کہ اسے بین الاقوامی کنٹرول میں ہونا چاہئے بلکہ جو حکومت وہاں رہی وہی اس کا انتظام کرتی رہی۔ اس وقت ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے، اس لئے کہ اس کا موقع نہیں ہے ورنہ ۱۴ سو برس کے واقعات سے اس کو اچھی طرح ثابت کیا جاسکتا ہے پھر شرعی حیثیت سے دیکھا جائے تو فتح مکہ کے موقع پر جب کعبۃ اللہ کو آپؐ نے سارے بتوں سے

صاف کر دیا اور پھر سے اسے توحید کا مرکز قرار دیا تو جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کی تولیت تھی وہ چند دن پہلے اسلام کے سب سے بڑے دشمن رہ چکے تھے، مگر آپؐ نے پھر کعبہ کی کنجی انہی کے حوالہ کی، اسے نہ مہاجرین کے ہاتھوں میں دی اور نہ انصار کے ہاتھوں میں۔ گو یہ لوگ ان سے کہیں برتر اور افضل تھے۔ اس لئے اس طرح کا مطالبہ نہ شرعی حیثیت سے صحیح ہے اور نہ تاریخی حیثیت سے۔

اس لئے براہِ کرم حرمین شریفین اور فریضۂ حج کے زمانہ کو موجودہ شیطانی بین الاقوامیت کی آماجگاہ نہ بنایا جائے اور نہ متضاد فکر و نظر رکھنے والوں کا اسے اکھاڑہ بنایا جائے۔ جہاں تک حرمین شریفین کے انتظام یا حجاج کرام کے آرام و آسائش کا تعلق ہے اسے سعودی حکومت آہستہ آہستہ مثالی بنا رہی ہے لیکن آپ کو اگر اس میں خامی نظر آتی ہے تو اس کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے اور اس میں سخت لہجہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے مگر ایران و عراق جنگ کے نتیجہ میں انتقامی جذبہ سے ایران جو مظاہرہ وغیرہ کے اقدامات کرتا ہے اس کی کسی طرح تائید نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ بات بھی عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت ساری دنیا کے اور خصوصیت سے ہندوستان کے مسلمان دو دھڑوں میں بٹ گئے ہیں ایک دھڑ سعودی حکومت کا حامی ہے دوسرا ایران کا۔ ہمیں اس میں احتیاط کرنی چاہئے ایسا نہ ہو کہ ہمارے وہ مشترکہ مسائل جن پر ہماری ملی زندگی کی بقا و فنا کا دار و مدار ہے اس بے فائدہ اختلاف سے متاثر ہو جائیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ۷۰-۷۵ برس سے یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ اپنے مسائل سے زیادہ عالم اسلام کے مسائل سے دلچسپی لیتے رہے ہیں، لیکن یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ اپنی گٹھری گنوا کر ہم دوسروں کی گٹھری بچانے کی فکر میں گھلتے رہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اردو زبان کا مسئلہ ہے، دینی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ مسلم پرسنل لا اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کا مسئلہ، مساجد و مقابر اور خاص طور پر بابری مسجد کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے راقم الحروف کی دردمندانہ اپیل ہے کہ اگر آپ سعودی حکومت کی حمایت کر رہے ہیں تو ضرور کریں اور اگر آپ ایران کے حامی ہیں تو اس کی حمایت کریں مگر خدارا اس خلیج کو اتنا نہ بڑھائیں کہ ہمارے مشترکہ مسائل پس پشت پڑ جائیں اور ہم آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اور فرقہ پرور دشمن طاقتیں اس سے فائدہ اٹھائیں۔

• •

دوسری اور آخری قسط

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب لاہور

محمد بن عبدالوہاب نجد کے ایک قصبے عینیہ میں پیدا ہوئے۔ وہ عربوں کے مشہور قبیلے تمیم کے فرد تھے۔ جس کی بہادری کے تذکرے شاندار قصائد میں بازار عکاظ میں بیان کئے جاتے تھے۔ انھوں نے اوائل عمر میں پڑھنا لکھنا سیکھا اور دس برس کی عمر میں قرآن حکیم حفظ کر لیا۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی بغداد، بصرہ، ایران اور دمشق کے متعدد سفر کئے اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اعمال وعقائد کا مطالعہ جو عالم اسلام کی سیادت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس کے بعد موصوف عام پیغمبروں کی طرح صحرا کی آغوش میں عبادت وریاضت کے لئے گوشہ نشین ہوگئے۔ اسی گوشۂ تنہائی میں انھوں نے اسلام کے مستقبل پر غور کیا اور ان بدعات کا جائزہ لیا جن میں اسلام ڈوب چکا تھا۔ عثمانی خلفاء اور فقہاء کی غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں میں بت پرستوں جیسی رسوم اور کافروں جیسے رواج عام ہو چکے تھے۔ اسلام کے صحیح عقائد بے شمار غلط اور من مانی تاویلوں تلے دب چکے تھے۔ عیاشی اور نمود ونمائش نے اولین دورِ اسلام کی سادگی اور بے تکلفی کی جگہ لے لی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے بجائے محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم اور اولیائے کرام کی پرستش ہونے لگی تھی اور دن میں کئی بار قرآن کی مقرر کردہ حدیں توڑی جاتی تھیں۔

سیاسی میدان میں حالات اور بھی زیادہ خراب تھے۔ وہ عرب جو جزیرہ نما عرب سے باہر آباد تھے ترکوں کے ماتحت زندگی گزار رہے تھے۔ جو عرب وسطی عرب میں ترکوں کے تسلط سے آزاد تھے وہ اپنی آزادی کو اپنے غلام بھائیوں کو ترکوں کی غلامی سے نجات دلانے کے بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے میں استعمال کرتے تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ فداہ روحی کی طرح محمد بن عبدالوہاب نے بھی یہی سوچا کہ سب سے اہم کام یہ ہے کہ

ان خانہ بدوش قبائل کو متحد کر کے ایک مذہبی عقیدے پر جمع کیا جائے۔ لیکن اس عقیدے کی بنیاد کس پر ہوگی؟ ایک الہام یا تازہ وحی پر؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو ہمیشہ کے لئے سچائی دے دی تھی اور اس قانون کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ اصل دین کی طرف لوٹا جائے اور پرانے قوانین ہر قیمت پر نافذ کئے جائیں، لیکن معاملات اس حد تک نازک صورت اختیار کر چکے تھے کہ عرب خود بھی اپنے عقائد اور اصولوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکتے تھے۔

اسلام کے لفظی معنی کیا ہیں؟ "مطلق طور پر خدا کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا" پیغمبر علیہ السلام نے یہ نام کیوں پسند کیا تھا؟ صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دنوں پہلے یہ دنیا پیدا کی تھی اور اسی وقت بندوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ عربی زبان میں یہی چیز پائی جاتی ہے۔ اس میں صرف ماضی و حال کے صیغے ہیں مستقبل کا صیغہ موجود نہیں۔ خدا خود انسان کی تقدیر کا مالک ہے وہی اسے "ہدیٰ" پر لگا دیتا ہے۔ اسی کے معنی صراط مستقیم ہیں اور یہی عرب کھو چکے تھے۔

ان حالات میں نہ ہی تو کسی سائنسدان کی قیاس آرائیاں اور نہ ہی کسی شاعر کی تلقین یا فقہار کے تنازعات انھیں صراط مستقیم دکھا سکتے تھے صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ وحی کے ماخذ یعنی قرآن کی طرف رجوع کریں۔ یہ ماخذ بڑے سادہ سے تھے مثلاً ایک بار ایک اعرابی نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ اسلام کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننا جس کا میں نبی ہوں، وقت پر نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرنا۔ یہ احکام زندگی ہیں جن پر بہر حال عمل کرنا ہوگا، اس میں کوئی عذر یا کمزوری قابلِ سماعت نہیں، صرف نماز روزہ اور زکوٰۃ ہی ایک مومن کو خدا تک پہنچا سکتے ہیں۔

اس عقیدے کو رواج دینے میں محمد بن عبدالوہاب کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ ایک نیا فرقہ بنائیں یا اپنے ساتھیوں کو قرآن پاک کی تفسیر اپنی مرضی سے سمجھائیں۔ وہ صحیح اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے جس کی تجدید نو کی گئی تھی۔ وہ عربوں کی تاریخ کے ہزار سال کے بعد کو ختم کر کے اسی مقام پر کھڑے ہو گئے جہاں سے سرورِ کائنات نے اپنا کام شروع کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے گمان تھا ان کی تعلیمات کا مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے علماء کے نظریات کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اس طرح کے ان انقلابی نظریات کو برداشت نہ کر سکتے تھے جو اُن کے مذہبی اختیارات کے لئے دھمکی کا حکم

رکھتے ہوں اور ان سے ان کے طرز زندگی کی بھی اہانت ہوتی ہو۔ انھوں نے بڑے ظالمانہ طریقے پر محمد بن عبدالوہاب کو ایذا پہنچانی شروع کردی یہاں تک کہ ان پر پتھراؤ بھی کیا گیا۔ ان حالات میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نے جان لیا کہ وہ اسی طرح کامیاب ہو سکتے ہیں کہ جس طریقے سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کامیاب ہوئے تھے اور ان کی تعلیمات اسی طرح برقرار رہ سکتی ہیں کہ وہ بھی طاقت کو بروئے کار لائیں۔ چنانچہ موصوف نجد کے دارالحکومت درعیہ چلے گئے اور وہاں انھوں نے نجد کے خانہ بدوشوں کے سربراہ محمد بن سعود کے ہاں پناہ لی۔

محمد بن عبدالوہاب کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ محمد بن سعود میں سپاہیانہ جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اسی طرح محمد بن سعود بھی ان کی شعلہ بیانی کا مدّاح ہوگیا۔ اس طرح ایک سپاہی کو ایک عقیدہ اور ایک داعی کو تلوار مل گئی۔ وہ دونوں اس بات پر متفق ہوگئے کہ اپنی اجتماعی قوت خدا تعالیٰ کا منشا پورا کرنے اور بکھرے ہوئے عربوں کو متحد کرنے میں صرف کریں گے۔ اس عہد پر مُہر ثبت کرنے کی خاطر محمد بن عبدالوہاب نے اپنی بیٹی کا عقد محمد بن سعود سے کردیا اور اپنے منصوبہ کے تمام فوجی اور انتظامی معاملات بھی اسی کے سپرد کردیئے۔ داعی اور سپاہی کے درمیان یہ طے پایا کہ اس کام کے دو مرحلے ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ وسط عرب کے قبائل تحریک کا گرویدہ بنا کر نجد کو فتح کیا جائے اور جب محمد بن سعود پورے نجد کا مالک بن جائے تو وہ اصلاحات کا دائرہ پورے عرب میں پھیلا دے۔

اس باہمی اشتراک کے جلد بعد نجد کے چیدہ چیدہ لوگ داعی اور مصلح محمد بن عبدالوہاب کے وعظ سے متأثر ہوکر محمد سعود کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب بصرہ اور دمشق کی ترک حکومت یہ خبر سن کر حیران رہ گئی کہ نجد کے منتشر قبائل ایک جھنڈے تلے جمع ہوگئے ہیں اور انھوں نے عام سُنّی مسلمانوں کے طریقے سے بھی زیادہ سخت مذہب قبول کرلیا ہے۔ نیز عرب میں ایک قانون ساز نیا قانون بنا رہا ہے اور ایک نڈر سپاہی اسے اپنی قوتِ بازو سے اپنے دائرۂ اختیار میں نافذ کر رہا ہے۔

نجد کے ایک حصے نے تو نیا عقیدہ قبول کر ہی لیا تھا، الحسا کا شیخ جو اصلاحات کا مخالف تھا، کچل دیا گیا بعد ازاں یہ وہابی شہسوار حجاز اور شام کی سرحدات پر حملے کرکے خانہ بدوش قبائل میں اپنی بیداری کا اعلان کرنے لگے۔ وہابیوں کی فوری کامیابی سے متنبہ ہوکر ترکی کے سلطان محمود اوّل نے بصرہ، بغداد، جدہ، شام اور مصر کے گورنروں کو حکم دیا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ان "ملحدوں" کو ختم کردیں اور ان کو مقدس مقامات میں داخل ہونے اور ان پر قبضہ جمانے سے روکیں۔ ورنہ خلیفہ کی عزت پر بدنما دھبّہ لگ جائے گا۔

ترک گورنروں کی کوششوں کے باوجود یہ تحریک نہ دب سکی اور عربوں کی یہ دوسری موج قرنِ اوّل کی پہلی موج کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی۔ ترکی حکومت کی مخالفت کے باوجود نجد کے اہم شہر محمد بن سعود کے قبضے میں تھے اور جب وہ ۱۷۶۵ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوا تو اپنے پیچھے ایک عظیم قوت چھوڑ گیا۔ اس کے جانشین اور فرزند عبدالعزیز نے اس قوت کو مزید بڑھایا اور نجد فتح کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا: اس طرح اس عظیم منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا۔

محمد بن سعود کی وفات کے بعد محمد بن عبدالوہاب بھی رحلت کر گئے لیکن اس وقت تک نیا عقیدہ سختی کے ساتھ وسطی عرب میں جم چکا تھا عبدالعزیز کے بعد محمد بن سعود کا پوتا اور محمد بن عبدالوہاب کا نواسہ سعود، جس نے بعد میں سعود اعظم کے نام سے شہرت پائی، نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام بنا۔ وہ بیک وقت سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا تھا۔ اس اتصال سے اس نے ایک عظیم قوت پیدا کر لی اور ایک روز اپنی تمام تر سپاہ کو درعیہ کی سطح مرتفع پر جمع کر کے وہابی علماء کی موجودگی میں اس نے ایک پرجوش تقریر کی اور اس منصوبے کے دوسرے مرحلے کی تکمیل یعنی پورے عرب کی تسخیر کے لئے چل پڑا۔

سعود اعظم طوفان بن کر حجاز مقدس میں داخل ہوا اور جلد ہی پورے صوبے پر قابض ہو گیا۔ سلطانِ ترکی نے جیسا کہ پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا مقدس مقامات پر وہابیوں کا قبضہ ہوتے ہی اس کی عزت اپنے ہم وطنوں کی نظر میں کم ہو گئی۔ سعود اعظم نے حرم شریف میں داخل ہو کر اولیاء اللہ کے تمام مقابر گرا دیئے اور ناجائز آرائش کے لئے "بت پرست" ترک سلاطین کی تعمیر کردہ عمارات بھی زمین کے برابر کر دیں۔ وہ بیت اللہ کو اپنی پہلی سی سادہ حالت پر لے آیا۔

حرم شریف سے فارغ ہو کر وہ اسیر میں داخل ہوا اور کسی مقابلے کے بغیر ہی اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کی باری آئی اور ایک ہی جھڑپ میں یمن کے صدر مقام صنعاء پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس فتح نے اسکے سپاہیوں کے کمال پر مُہرِ تحسین ثبت کر دی اور پھر ان کے مقابلے میں کوئی بھی نہ ٹھہر سکا۔ یوں ۱۸۰۸ء میں سعود اعظم نے اپنے جدِّ امجد کے منصوبے کے دوسرے مرحلے کی بھی تکمیل کر دی۔ اب نجد کے علاوہ اس کی مملکت میں حجاز، اسیر، یمن، حضرموت، الحسار، بحرین اور بصرہ بھی شامل تھے۔ ایک بار عرب دوبارہ بیدار ہو چکا تھا۔ اور پورے ملک کی عنان ایک شخص کے ہاتھ میں تھی اور ملک کا ملک پھر سے "ہدیٰ" یعنی صراطِ مستقیم پر گامزن تھا۔

" سعودی عربیا" کے مصنف جان فلبی کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ سعودی عرب میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی رفاقت میں گزرا۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد بن عبدالوہاب کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ نجد کے لوگ شعائر اسلام کی بجا آوری میں سستی برتتے ہیں اور جنسی معاملات میں حدودِ شریعت سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ عوام کی اکثریت توہم پرست ہے اور وہ تعویذ، دھاگوں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ قبروں پر نذریں چڑھاتے اور وہاں جانور ذبح کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ بعض درخت، چٹانیں اور خاص خاص قبریں لوگوں کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں۔ شیخ الاسلام کو ایسا محسوس ہوا کہ لوگ زمانۂ قبل از اسلام میں بستے ہیں۔

جُبَیلہ میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت زید بن الخطاب کا مزار تھا جسے قبر پرست بدعتی بڑی عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ محمد بن عبدالوہاب اس مزار کو گرانے پر مُصر تھے۔ ان کے کہنے پر جبیلہ کے حاکم عثمان نے مزار گرانے کی اجازت دے دی لیکن جب شیخ الاسلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مزار کو منہدم کرنے گئے تو جبیلہ کے توہم پرست عوام مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اس موقع پر عثمان نے فوجی طاقت کا مظاہرہ کر کے مظاہرین کو دور بھگا دیا۔ جب عثمان مزار کے قریب پہنچا تو وہ بھی توہم پرستی کا شکار ہو گیا۔ اس نے شیخ الاسلام سے معذرت چاہی اور اپنے فوجیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا۔ عثمان کے پیچھے ہٹتے ہی شیخ الاسلام نے کُدال سنبھالی اور مزار کو زمین کے برابر کر دیا۔

جُبَیلہ کے قبر پرست بدعتیوں کا یہ خیال تھا کہ حضرت زیدؓ کے مزار کی بے حرمتی کے باعث محمد بن عبدالوہاب پر ضرور کوئی آفت نازل ہو گی۔ اور وہ رات بھر قہرِ خداوندی کے نزول کا انتظار کرتے رہے۔ اگلی صبح انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ شیخ الاسلام بالکل صحیح و سلامت ہیں اور وہ کسی اور مزار کو گرانے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جب محمد بن عبدالوہاب نے ایک زانیہ کو شریعت کے حکم کے مطابق رجم کرنے کا حکم دیا تو ان کے مخالفین نے وسطی عرب میں ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ نجد کے بدکردار حکام اور عوام کو اپنا انجام نظر آنے لگا۔ الحساء کے حاکم سلیمان نے جبیلہ کے حاکم عثمان سے اس واقعہ پر شدید احتجاج کیا اور اسے لکھا کہ وہ محمد بن عبدالوہاب کو قتل کر دے ورنہ وہ عثمان کی مالی امداد بند کر دے گا۔ عثمان نے شیخ الاسلام کو بلا کر اپنی مشکلات سے آگاہ کیا تو انھوں نے عثمان سے کہا کہ وہ اگر خدا سے ڈرتا ہے تو پھر اس کے دل میں دشمنوں کا خوف نہیں ہونا چاہئے۔ عثمان کو چونکہ اپنا سالانہ وظیفہ اور اپنی جان عزیز تھی اس لئے اس نے شیخ الاسلام سے استدعا کی کہ وہ کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔

مشہور تاریخ داں اور سیاح جارج انٹونیس اپنی تصنیف "دی عرب اویکننگ" میں رقم طراز ہے کہ اٹھارہویں صدی کی تحریک "احیائے دین" جو عام طور پر وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے، کی بنیاد محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات پر رکھی گئی۔ موصوف نجد کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مسلم ممالک کی خوب سیاحت کی تھی۔ علوم اسلامیہ کے مطالعہ کے بعد ان میں اصلاحی تحریک چلانے کا جذبہ پیدا ہوا ان کے خیال میں اسلام "غلاظتوں" تلے دب چکا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام میں بہت سی نئی باتیں شامل ہو گئی تھیں جن کا جواز پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں نہیں ملتا۔ ملک میں توہم پرستی کا دور دورہ تھا اور بدعات عام ہو چکی تھیں۔ محمد بن عبدالوہاب کے نزدیک بت پرستی اور ان خرافات میں کوئی فرق نہ تھا۔ انھوں نے اسلام کو غیر اسلامی رسوم سے پاک کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ ایک مصلح تھے لیکن دوسرے مصلحین سے بالکل مختلف۔ وہ اسلام کی تعلیمات میں نہ ہی کوئی تبدیلی چاہتے تھے، اور نہ ہی اس کے اصولوں کی نئی تاویل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کا مشن صرف اتنا تھا کہ وہ بدعات اور غیر اسلامی رسوم کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور قرن اول کے اسلام کی سادہ تعلیمات کو فروغ دیں۔

"سعودی عریبیا ان دی نائن ٹینتھ سنچری" کے مصنف بیلی ونڈر نے محمد بن عبدالوہاب کی تحریک احیائے دین کا جتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اتنا کسی مستشرق نے نہیں کیا۔ اس کی تحقیق کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی بیلی ونڈر رقمطراز ہے کہ آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹیوں کے پروفیسر سر ہملٹن گب کے خیال میں وہابیت سے مراد اسلام کے متصوفانہ باطنی نظام کے مقابلے پر اسلام کے بہترین شرعی نظام کا احیاء ہے۔ وہابیوں کے ظہور سے قبل اسلام کے متصوفانہ باطنی نظام کو صوفیوں کے ہراول دستے صدیوں سے چلا رہے تھے اور آہستہ آہستہ ان کے نظریات لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہو چکے تھے، تاریخی اعتبار سے وہابی، امام احمد بن حنبلؒ کے فقہی مسلک پر کاربند ہیں۔ حنبلی مسلک چاروں مذاہب فقہ میں سب سے زیادہ روایت پرست ہے اور حنابلہ حدیث کے الفاظ پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے حنبلی مذہب کا مطالعہ شام کے مشہور حنبلی عالم تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ کی تحریروں کے ذریعے کیا ہے۔ ابن تیمیہ قرآن، حدیث اور اجماع کے علاوہ اور کسی قانون کی بالادستی کو نہیں مانتے انھوں نے بدعات، ولی پرستی، نذر و فتوح اور قبروں کی زیارت کو جانے کے خلاف آواز بلند کی تھی۔

تحریک وہابیت کا اصلی جوہر پاکیزگی، دینی جذبہ اور سادگی ہیں۔ اس کی تعلیم بڑی سیدھی سادی ہے

اور وہابی عوام قرنِ اوّل کے اسلام کی طرف لوٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ہر لحاظ سے بے مثل ہے ان کے ہاں خدا کی سب سے اہم صفت اس کی وحدانیت ہے۔ وہ کسی طرح بھی مجبور نہیں ہے، وہ مطلق العنان ہے۔ قرآن مجید اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے ایک انسان اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو خدا کی توحید کا بڑی سختی کے ساتھ اقرار کرنا چاہئے، جو شخص ایسا عقیدہ نہیں رکھتا وہ غیر مسلم اور مشرک ہے اور قرآن کے حکم کے مطابق قابلِ گردن زدنی ہے۔

محمد بن عبدالوہاب سے قبل عربی اور عجمی مسلمان زمانۂ قبل از اسلام کے عربوں جیسی جاہلانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ حیات بعد ممات کے بارے میں وہابیوں کے عقائد کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے۔ وہ نبی علیہ السلام کو عام انسانوں اور مسلمانوں سے افضل اور معصوم عن الخطا سمجھتے ہیں۔ وہابی اصولی طور پر محمد مصطفیٰؐ کی شفاعت کا انکار نہیں کرتے، البتہ یہ شفاعت ایک صحیح العقیدہ مسلمان صرف اللہ کے بتلائے ہوئے طریقے سے حاصل کر سکے گا۔ دوسری جانب وہابی وسیلے، قرب اور روحانی طاقت کو، جو خود کو مسلمان کہلانے والے مشرکین خود ساختہ ولیوں سے حاصل کرتے ہیں، شرک اور حرام گردانتے ہیں۔ وہابیوں کے ہاں نبی اکرمؐ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے اصحاب کا درجہ ہے اور وہ انھیں بہترین خلائق مانتے ہیں۔ وہابیوں کے ہاں قرآن کی بڑی اہمیت ہے اور وہ اسے خدا کا کلام مانتے ہیں، قرآن کے بعد ان کے ہاں حدیث یا سنّت کا درجہ ہے۔ جہاں تک اجماع کا تعلق ہے وہ صرف پہلی تین صدیوں کے اجماع کو ہی قابلِ قبول سمجھتے ہیں اور یوں وہ مذہبی مسائل میں آزاد خیالی پر پابندی عائد کر دیتے ہیں۔ وہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے کے قائل نہیں ہیں، وہابیوں اور عرب ممالک کے دوسرے مصلحین خصوصاً مفتی محمد عبدہٗ میں، اسی بنیادی اصول کا فرق ہے۔

وہابی کہتے ہیں کہ انسانوں کو دنیا میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں جماعت کی صورت میں رہنا چاہئے ورنہ ان کے دنیا میں آنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، یہ جماعت ابتدائی دور اسلام کی جماعت کی طرح دنیا میں خدا کے احکام نافذ کرے۔

کنیڈا کے پروفیسر ولفرڈ کینٹویل اسمتھ۔ جو علوم اسلامیہ کے بڑے فاضل سمجھے جاتے ہیں، لکھتے ہیں کہ وہابیوں کے نزدیک مستند قانون، جو دین کی روح اور اسلام کا خلاصہ ہے، وہ غیر لچک دار اور سخت حنبلی فقہ ہے اور یہ ان تمام بدعات سے مبرا ہے جو سیکڑوں سالوں سے اسلام میں داخل ہو رہی ہیں وہابی اسی

قدیم قانون کو مانتے، اس پر پوری طرح اور سختی سے عمل کرتے اور ایسے معاشرے کے قیام کے داعی ہیں جہاں یہ قانون نافذ ہو۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ یہی اصلی اسلام ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے وہ غیر ضروری اور غلط ہے۔

مسلمانوں کے مثالی معاشرے میں کسی رنگ، نسل، طبقے اور حیثیت میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا لیکن وہابیوں کے ہاں سب سے بڑا مسئلہ ایک سچے مسلمان اور مشرک میں تمیز کرنے کا ہے۔ جو لوگ وسیلہ تلاش کرتے ہیں ان کے نام وہابیوں کے ہاں خارج از اسلام لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر نظر آتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے کسی حکم یا سنتِ رسولؐ سے روگردانی کرنے والا ان کے ہاں مردود یا اس سے بھی گیا گزرا سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ توسل کے قائل ہیں یا ولیوں اور پیغمبروں کی قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں خواہ وہ محمد رسول اللہ صلے علیہ وسلم کے مزار ہی کی زیارت کے لئے سفر اختیار کریں یا ولیوں اور نبیوں کی سفارش پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں، ان کا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں ہے۔ وہ اپنے انہی عقائد کی بنا پر قبروں پر تعمیر کئے جانے والے قبوں یا مزاروں پر کی جانے والی آرائش سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ وہابی قبروں پر جانے سے منع نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قبروں پر جانے سے موت کے قریب تر آنے کا احساس پیدا ہو تو پھر وہاں جانے میں کوئی قباحت نہیں۔ زائر قبر پہ جا کر مردے کی مغفرت کے لئے دعا کر سکتا ہے لیکن مُردے سے یہ کہنا کہ وہ اس کے لئے خدا سے سفارش کرے، گناہ ہے۔

وہابی وسیلے کو نہیں مانتے، اس لئے وہ صوفیوں، پیروں، نام نہاد ولیوں اور شیعوں کے اماموں کا انکار کرتے ہیں، کیوں کہ وہ خدا کے ساتھ خاص قسم کا رابطہ رکھنے کا دعویٰ کرتے اور بدین وجہ اکثر اوقات مذہبی فرائض کی ادائیگی میں غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تردید و تنقیص کے ساتھ ہی وہ ان کے طریقوں، خصوصاً ذکر وسماع، رقص، عشقیہ کلام اور وجد و حال جیسی چیزوں کی بھی مذمت کرتے ہیں۔ جو لوگ مقدس پتھروں اور اہم جگہوں پر مختلف اقسام کی عبادت میں مگن رہتے ہیں، وہ ان کے ہاں یقیناً بت پرست اور مشرک ہیں۔ حصولِ جنت کا ذریعہ صرف احکام شریعت کی بجا آوری ہے اور اس لحاظ سے تمام مسلمان اللہ کے ولی ہیں۔

ہم بدعت کے بارے میں وہابیوں کے نظریات بیان کر چکے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ تمام باتیں

جو قرنِ اول کے بعد اسلام میں داخل ہوئی ہیں بدعت ہیں۔ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حد سے زیادہ تعظیم و توقیر کو بھی بدعت گردانتے ہیں کیوں کہ اس سے بھی توحید پر زد پڑتی ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت منانا بھی ان کی حد سے زیادہ تعظیم کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لئے وہ اس کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے اس خیال سے بعض مبتدیوں نے شروع شروع میں یہ تاثر لیا کہ وہابی چونکہ پیغمبر اسلامؐ کی واجبی تعظیم نہیں کرتے اس لئے وہ شاید ان کی نبوت کے منکر ہیں۔ وہابی تسبیح گھمانے، تمباکو پینے، موسیقی سننے، جواہرات اور ریشمی کپڑے پہننے، قیمتی دھاتوں کو آرائش کے لئے استعمال کرنے، خوب صورت منارے بنانے اور قبریں سجانے کو بھی بدعت سمجھتے اور ان چیزوں کا سختی کے ساتھ نوٹس لیتے ہیں۔ اس سے ان کے پاکیزہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔

وہابی جماعت کا مقصدِ حیات ہی خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ اپنے امام کی مکمل اطاعت کو عین فرض سمجھتے ہیں۔ جب تک ان کا امام انھیں اجازت نہ دے وہ اس کے حکم سے روگردانی نہیں کرتے۔ ان کے امام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کے مطابق حکومت کرے اور اپنی قوم کی نفری بڑھانے میں کوشاں رہے تاوقتیکہ خدا کے فضل وکرم سے تمام بنی نوع انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائے۔ اس مقصد کی خاطر وہ اپنے مذہبی مشیروں کی رضامندی کے بعد، کسی بھی فرد کو کسی خاص کام پر لگا سکتا ہے اور اس شخص پر اس کام کی انجام دہی واجب ہو جاتی ہے۔ ایک وہابی عہدہ دار کسی کاہل نمازی یا تارک الصلوٰۃ کو بزور نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی یا ماہِ رمضان کے روزے اختیاری امور نہیں ہیں وہابی علماء کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص باوجود استطاعت، حج بیت اللہ کے لئے نہیں جاتا تو یہ حاکم کی ذمہ داری ہے کہ اسے جبراً حج پر روانہ کرے۔

وہابیوں کی تعداد میں اضافے اور وہابیت کے استحکام کے لئے انھیں جہاد پر ابھارا جاتا ہے۔ جب کسی شخص پر جہاد فرض ہو جائے تو پھر وہ اس کے لئے ہر ممکن سعی بروئے کار لائے۔ وہابیوں کی نظر میں جہاد کا تصور صرف "مقدس جنگ" تک محدود نہیں ہے امام ملک کے داخلی مسائل کو سلجھانے، قوانین نافذ کرنے اور خدا کے بندوں کو خدا کے قریب تر لانے کے لئے بھی جہاد کر سکتا ہے۔ جب وہ مشرکوں کے خلاف کوئی قدم اٹھائے گا تو اسے بھی جہاد ہی کا نام دیا جائے گا۔ اسی اصول کے تحت وہابی اپنی مختلف مہمات کا جواز نکالتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومت، حکومت کا محکمہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بھی اسی اصول کے

مطابق کام کرتا ہے۔

جہاں تک افراد کی حیات و ممات کا تعلق ہے، وہابیت میں ایک مثبت اصول ہے جس کی بنیاد خدا کی اطاعت پر ہے۔ اس اصول کے تحت ہر دیندار مسلمان کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ اخلاص کا مظاہرہ کرے ایک فرد کے لئے یہی چیز خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت پر گواہ بنتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے مذہبی فرائض کی بجا آوری سب سے اہم چیز ہے، انھیں بڑے خلوص، احتیاط اور پوری ہوش مندی کے ساتھ پورا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایک مسلمان کا یہ بھی ایمان ہونا چاہیئے کہ معمولی سے معمولی کام بھی اللہ ہی کرنے والا ہے۔ آخر میں فاضل مصنف بیلی ونڈر لکھتا ہے کہ ہمارے قاری کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہابیت اسلام کے دَورِ اوّل کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے اور وہ قرنِ اوّل کے بعد کے تمام اعمال و رسوم سے بریت کا اظہار کرتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے یہود و نصاریٰ نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اور تعلیمات کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ راقم الحروف نے من وعن اس مضمون میں نقل کر دیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اپنے بھی تعصب کی عینک اتار کر اس تحریک کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اس تحریک نے گزشتہ اور موجودہ صدی میں عالم اسلام میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی دعوت لے کر اٹھنے والی تحریکوں کو کس طرح متاثر کیا ہے۔

بقیہ: تفسیر اور اس کے مآخذ۔

ابن ابی حاتم حضرت عباس رضؓ سے روایت کرتے ہیں:

فظھرہ التلاوۃ وبطنہ التاویل فجالسوا بہ العلماء وجانبوا بہ السفھآ ۔	قرآن کا ظاہر اس کی تلاوت ہے اور اسکا باطن اسکے مطالب ہیں اسکے لئے علماء کے پاس بیٹھو اور بے وقوفوں سے کنارہ کش رہو۔
امّا التاویل و ھو حرف الآیۃ علی طریق الاستنباط الی معنی یلیق لھما محتمل لماقبلھا وبعدھا وغیر مخالف للکتاب والسنۃ فقد رخص فیہ اھل العلم ۔ لہ	وہ تاویل جس میں قرآن پاک کی آیت کو استنباط اور استدلال کے طریقے سے کسی ایسے معنی کی طرف لوٹایا جائے جسکی وہ آیت اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے متحمل ہے اور گنجائش رکھتی ہے تو اس قسم کی تاویل کی اہل علم نے اجازت دی ہے۔ ہاں جو تاویل ظاہر الفاظ قرآن سے ماخوذ نہ ہو اور الفاظ قرآن اسکے کسی طرح متحمل نہ ہوں یا وہ تاویل اسلام کے مسلّمہ مبادی اصول سے متصادم ہو تو یہ تاویل باطل ہے جس کا نام تحریف ہے۔

---

۱ [illegible]

قسط ۲

مولانا جلیل احسن ندوی

بُرے اخلاق

جھُوٹ

جھُوٹ ۔ نفاق کی علامت

(۲۴۰) انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اربع من کن فیہ کان منافقًا خالصًا ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھن اذا أوتمن خان، واذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا خاصم فجر۔
(بخاری ومسلم ۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چار خصلتیں جس کے اندر ہوں گی وہ پکّا منافق ہوگا اور جسکے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اسکے اندر نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہانتک کہ اسے ترک کردے۔ وہ چار خصلتیں یہ ہیں: (۱) جب اسکے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، (۲) جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے (۳) جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے (۴) جب کسی سے جھگڑا کرے تو گالی پر اتر آئے اور حق وانصاف سے ہٹ جائے۔

آنکھوں کا جھوٹ سب سے بڑا جھوٹ

(۲۴۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم افری الفری ان یری الرّجل عینیہ مالم تریا۔ (بخاری ۔ ابن عمرؓ)

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی دونوں آنکھوں کو وہ خواب دکھلائے جو انھوں نے نہیں دیکھا۔
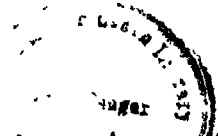
تشریح :۔ یعنی اس نے خواب دیکھا نہیں اور صبح کو اٹھ کر اہل مجلس سے کہتا ہے کہ آج میں نے اتنے عمدہ عمدہ خواب دیکھے ہیں۔ ایسا کرنا گویا آنکھوں سے جھوٹ بلوانا ہے، دوسرے لفظوں میں آنکھوں پر افترا پردازی ہے۔ ان کی طرف وہ بات منسوب کرتا ہے جو انھوں نے نہیں کیا۔

عظیم خیانت

(۲۴۲) عن سفیان بن اسید الحضرمی قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول کبرت خیانۃ ان تحدث اخاک حدیثا وھو لک بہ مصدق وانت بہ کاذب۔ (ابوداؤد)

حضرت سفیان حضرمی رضؓ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اس سے بڑی خیانت اور کیا ہوگی کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو اور وہ تمہاری بات کو سچ جانے حالانکہ تم نے اس سے جھوٹ بولا۔

بچّوں سے جھُوٹ بولنا

(۲۴۳) عن عبد اللہ بن عامر قال۔ وعتنی امی یوما ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاعد فی بیتنا، فقالت تعال اعطیک، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما اردت ان تعطیہ؟ قالت اردت ان اعطیہ تمرا، فقال لھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما انک لولم تعطیہ شیئا کتبت علیک کذبۃ۔ (ابوداؤد)

عبد اللہ بن عامر رضؓ کہتے ہیں کہ ایک دن جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے، میری والدہ نے مجھے پکارا یہاں آ، تجھے ایک چیز دوں گی، آپؐ نے پوچھا تم اسے کیا دینا چاہتی ہو؟ انھوں نے کہا میں اسے کھجور دینا چاہتی تھی، آپؐ نے فرمایا اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ لیا جاتا۔

تشریح :۔ والدین کو یہ حدیث یاد رکھنی چاہئے۔

(۲۴۴) عن عبد اللہ قال لا یصلح الکذب عبد اللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں جھوٹ بولنا کسی حال میں

فی جد ولا ھزل، ولا ان یعد احدکم ولدہٗ شیئاً ثم لا ینجزلہٗ۔

(الادب المفرد للبخاری)

جائز نہیں، نہ سنجیدگی کے ساتھ نہ مذاق کے طور پر اور یہ بات بھی جائز نہیں کہ تم میں سے کوئی اپنے بچے سے وعدہ کرے پھر اسے پورا نہ کرے۔

مذاق میں جھوٹ

(۲۴۵) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویل لمن یحدّث فیکذب لیضحك بہ القوم ویل لہٗ ویل لہٗ۔ (ترمذی۔ بہزبن حکیمؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ نے فرمایا: خرابی ہے اس کے لئے جو جھوٹی باتیں کہے لوگوں کو ہنسانے کے لئے، خرابی ہے اس کے لئے، خرابی ہے اس کے لئے۔

دورُخاپن

(۲۴۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجدون شرّ النّاس یوم القیٰمۃ ذاالوجھین الذی ھٰؤلاء بوجہٍ وھٰؤلاء بوجہٍ۔

(بخاری ومسلم۔ ابوہریرہؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم قیامت کے دن بدترین آدمی اس کو پاؤگے جو دنیا میں دو چہرے رکھتا تھا، کچھ لوگوں سے ایک چہرہ سے ملتا اور دوسروں سے دوسرے چہرے کے ساتھ ملتا۔

تشریح:۔ دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان جب رنجش ہو جاتی ہے تو ہر جگہ کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو دونوں کے پاس پہنچتے ہیں، دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ان کی باہمی رنجش کو اور ہوا دیتے ہیں۔ یہ صلح کرانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ عداوت کی آگ کو زیادہ سے زیادہ بھڑکانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

فحش گوئی اور بدزبانی

(۲۴۷) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ اثقل شیئٍ فی میزان المؤمن یوم القیامۃ خلق حسن، وانّ اللہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے وزنی چیز جو قیامت کے دن مومن کی میزان (ترازو) میں رکھی جائیگی وہ حسن اخلاق (عمدہ سیرت وکردار) ہوگا

يبغض الفاحش البذي۔ (ترمذی۔ ابودرداء)

اور اللہ کو اس شخص سے نفرت ہے جو بے حیائی کی بات زبان سے نکالتا اور بدزبانی کرتا ہے۔

تشریح :۔ حدیث میں خُلُقٌ حَسَنٌ کا لفظ آیا ہے جس کی تفسیر مشہور محدث عبداللہ بن مبارکؒ نے ان الفاظ میں کی ہے هُوَ طَلَاقَةُ الْوَجْهِ وَبَذْلُ الْمَعْرُوْفِ وَكَفُّ الْاَذٰى یعنی حسنِ اخلاق یہ ہے کہ آدمی ہنستے ہوئے چہرے سے ملے، محتاج بندوں پر خرچ کرے اور کسی کو ایذا نہ دے۔

آگ کی دو زبانیں

(۲۴۸) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان ذاوجھین فی الدنیا کان لہ یوم القیامۃ لسانان من نارٍ۔ (ابوداؤد۔ عمارؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دنیا میں دو رُخا پن اختیار کرے گا قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی بنی ہوئی دو زبانیں ہوں گی۔

تشریح :۔ عالمِ آخرت میں اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں اس لئے ہوں گی کہ دنیا میں اس کے منہ سے آگ نکلتی تھی جو دو آدمیوں کے باہمی تعلقات کو جلاتی تھی۔

مُردوں کی غیبت نہ کرو

(۲۴۹) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتسبّوا الاموات فانھم قد افضوا الیٰ ما قدّموا۔ (الادب المفرد۔ عائشہؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مُردوں کو بُرا بھلا نہ کہو، اس لئے کہ وہ اپنے اعمال کے ساتھ اپنے رب کے پاس جاچکے۔

غیبت اور بہتان کا فرق

(۲۵۰) انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتدرون ما الغیبۃ؟ قالوا اللہ ورسولہ اعلم، قال ذکرك اخاك بما یکرہ، قیل افرأیت ان کان

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ واقف ہیں، آپؐ نے فرمایا غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے ڈھنگ سے کرے

فی اخی ما اقول؟ قال ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ماتقول فقد بھتّہٗ۔
(مشکوٰۃ ــــ ابوہریرہؓ)

جیسے وہ ناپسند کرے، لوگوں نے آپؐ سے کہا اگر میرے بھائی میں وہ بات واقعتاً ہو جو میں کہہ رہا ہوں تب بھی غیبت ہو گی؟ آپؐ نے کہا اگر وہ بات اسکے اندر ہو تو یہ غیبت ہوئی اور اگر وہ بات اسکے اندر نہیں پائی جاتی تو یہ بہتان۔

غیبت زنا سے بدتر گناہ ہے

(۲۵۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الغیبۃ اشدّ من الزّنا، قالوا یارسول اللہ وکیف الغیبۃ اشدّ من الزّنا؟ قال انّ الرّجل لیزنی فیتوب اللہ علیہ، وانّ صاحب الغیبۃ لا یغفرلہٗ حتی یغفرھا لہٗ صاحبہٗ۔
(مشکوٰۃ ــــ ابوسعیدؓ وجابرؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت زنا سے زیادہ سخت جرم ہے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ غیبت کس طرح زنا سے زیادہ سخت جرم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک شخص زنا کرنے کے بعد جب استغفار کرتا ہے تو اس کی مغفرت ہو جاتی ہے مگر غیبت کرنے والے کی مغفرت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ وہ شخص اس کو معاف نہ کر دے جس کی اس نے غیبت کی ہے۔

غیبت کا کفّارہ

(۲۵۲) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ من کفّارۃ الغیبۃ ان تستغفر لمن اغتبتہٗ تقول اللّٰھمّ اغفرلنا ولہٗ۔
(مشکوٰۃ ــــ انسؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ تو دعائے مغفرت کرے اس کے لئے جس کی تو نے غیبت کی ہے، تو یوں کہے کہ اے اللہ تو میری اور اس کی مغفرت فرما۔ (یہ اسی صورت میں ہے کہ اس سے معافی مانگنا ممکن نہ رہ گیا ہو مثلاً وہ مرگیا ہو یا دور دراز علاقے میں چلا گیا ہو)

غیر کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت برباد نہ کرو

(۲۵۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من شرالناس منزلۃً یوم القیامۃ عبدٌ اذھب

آخرته بدنیا غیرہ۔ (مشکوٰۃ ۔ ابوامامہؓ)

ترجمہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن بدترین حال میں ہوگا وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت برباد کر ڈالی۔

قومی عصبیت

(۲۵۴) عن ابی فسیلۃ قال سألت فقلت یارسول اللہ أمن العصبیۃ ان یحب الرجل قومہ؟ قال لا. ولکن من العصبیۃ ان ینصر الرجل قومہ علی الظلم۔ (مشکوٰۃ)

ابو فسیلہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اپنے لوگوں سے محبت کرنا عصبیت ہے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، یہ عصبیت نہیں ہے، عصبیت (یعنی تعصب اور فرقہ واریت) یہ ہے کہ آدمی اپنے لوگوں کی مدد کرے ظالمانہ کارروائیوں میں۔

بے جا حمایت ہلاکت ہے

(۲۵۵) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من نصر قومہ علی غیر الحق فھو کالبعیر الذی ردیٰ فھو ینزع بذنبہ (ابوداؤد ۔ ابن مسعودؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص باطل اور ناجائز کاموں میں اپنے قبیلہ (کنبہ، خاندان اور قوم) کا ساتھ دیتا ہے اسکی مثال ایسی ہے کہ کوئی اونٹ کنویں میں گر رہا ہو اور یہ اسکی دُم پکڑ کر لٹک گیا اور اونٹ کے ساتھ یہ بھی کنویں میں جا گرا۔

(۲۵۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منا من دعا الیٰ عصبیۃٍ ولیس منا من قاتل عصبیۃً، ولیس منا من مات علیٰ عصبیۃٍ۔ (ابوداؤد ۔ جبیر بن مطعمؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے، وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کے جذبہ سے جنگ کرے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت پر مرے۔

تشریح:۔ عصبیت کا مطلب ہے "میری اپنی قوم چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر" یہ شیطانی جاہلی عصبیت ہے۔ اس نظریہ کی طرف بلانا، اس جذبہ سے جنگ کرنا اور اسی ذہنیت پر مرنا مسلمان کا کام نہیں ہے۔ ایسے لوگوں سے خدا کے پیغمبر نے بے تعلقی کا اعلان کیا ہے۔

منہ پر بے جا تعریف کی مذمّت

(۲۵۷) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا رأیتم المدّاحین فاحثوا فی وجوھھم التراب۔ (مسلم ۔ مقداد رضؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم تعریف کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ پر خاک ڈالو۔

تشریح:۔ "مدّاحین" سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا پیشہ ہی قصیدہ خوانی ہوتا ہے۔ یہ لوگ آتے ہیں اور "بخشش" کے لالچ میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ جاہلیت میں بھی تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ان کے منہ پر خاک ڈالو یعنی بخشش نہ دو ناکام لوٹا دو۔

فاسق کی تعریف غضبِ خداوندی کا باعث ہے

(۲۵۸) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا مدح الفاسق غضب الرّبّ تعالیٰ واھتزّ لہ العرش۔ (مشکوٰۃ ۔ انسؓ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ غصہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے عرش ہلنے لگتا ہے۔

تشریح:۔ جو شخص خدا کے احکام کا احترام نہیں کرتا بلکہ علانیہ توڑتا ہے تو ایسا شخص ذرا بھی عزّت و احترام کا مستحق نہیں۔ اب اگر مسلم معاشرہ میں ایسے لوگ سر آنکھوں پر بٹھلائے جاتے ہیں، ان کو ایڈریس دیئے جاتے ہیں اور ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرہ کے لوگوں کو خدا کے دین سے محبت نہیں ہے، اگر ہے تو برائے نام ہے اور برائے نام محبت خدا کی اجتماعی رحمت و نصرت کا مستحق نہیں بناتی۔

منہ پر تعریف

(۲۵۹) عن ابی بکرۃ قال اثنیٰ رجل علیٰ رجل عند النّبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم فقال ویلک قطعت عنق اخیک ثلاثاً، من کان منکم مادحاً لا محالۃ، فلیقل

ابو بکرہؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایک شخص کی تعریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں کی (وہ آدمی بھی مجلس میں موجود تھا) آپؐ نے تعریف کرنیوالے آدمی سے کہا تم نے تو اپنے بھائی کی گردن کاٹ دی، یہ جملہ آپؐ نے تین بار دہرایا، تم میں جو کسی کی

احسب فلاناً واللّٰہ حسیبہ ان کان یریٰ انہٗ کذٰلک، ولا یزکّی علی اللّٰہ احداً۔
(بخاری ومسلم)

تعریف کرے اور ایسا کرنا ضروری بھی ہو تو یوں کہے میں فلاں کو ایسا سمجھتا ہوں اور اللہ ہی حقیقتِ حال سے واقف ہے اگر وہ اسکو ویسا سمجھتا ہو اور کوئی کسی کو پاکیزہ نہ قرار دے خدا کے مقابلہ میں۔

تشریح:۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص کے منہ پر اسکی تعریف کی گئی۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ اس کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے آپؐ نے ٹوکا، بتایا کہ اگر کسی کے بارے میں کچھ کہنا ہی ہو تو یوں کہو میں فلاں کو نیک سمجھتا ہوں، فلاں شخص کو میں جنّتی یا ولی اللہ خیال کرتا ہوں۔ یوں نہ کہے فلاں یقیناً جنّتی ہے۔ اسطرح کہنے کا کسی بندے کو حق نہیں ہے، کیا معلوم جسے وہ جنّتی کہہ رہا ہے خدا کی نگاہ میں جنتی ہے یا نہیں۔ آدمی جب تک زندہ ہے ایمان کی آزمائش گاہ میں ہے۔ کیا معلوم کب آدمی کا دل پلٹ جائے اور بھٹک جائے اور مرنے کے بعد بھی قطعیت کے ساتھ جنّتی کہنا صحیح نہیں ہے۔

علماء نے کہا ہے کہ آدمی کے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور موقع آپڑے تو اس کے منہ پر تعریف کی جا سکتی ہے۔

جھوٹی گواہی

(۲۶۰) عن خُرَیمِ بْنِ فاتك قال صلّی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم صلوٰۃ الصّبح فلمّا انصرف قام قائماً، فقال عدلت شھادۃُ الزّور بالاشراك باللّٰہ ثلاث مرّاتٍ، ثمّ قرء فاجتنبوا الرّجس من الاوثان واجتنبوا قول الزّور حنفاء للّٰہِ غیر مشرکین بہ۔
(ابوداؤد)

خُرَیم بن فاتکؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپؐ سیدھے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا دونوں برابر ہیں۔ یہ جملہ آپؐ نے تین بار دُہرایا پھر آپؐ نے فاجتنبوا الخ (یعنی تم گندگی سے یعنی بتوں سے دور رہو اور جھوٹی بات کہنے سے، اور خدا کے لئے یک سو ہو جاؤ شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرو)

تشریح:۔ آپؐ نے سورۂ حج کی جو آیت پڑھی اس میں "قول الزّور" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی جھوٹ کہنے کے ہیں اور جھوٹی بات کہنا ہر جگہ برا ہے چاہے عدالت کے اندر حاکم کے سامنے ہو یا کسی اور جگہ۔

مجیب اللہ ندوی

فضائل و مسائل

اسلامی شریعت مجموعہ ہے فضائل و مسائل دونوں کا یعنی ایک طرف احکام شریعت میں سے ہر حکم پر عمل کرنے کی کچھ فضیلتیں قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہیں اور اسی کے ساتھ ہر حکم پر عمل کرنے کے لئے کچھ مسائل کی تعلیم بھی دی گئی ہے، فضائل کا تعلق عام طور پر آخرت میں اجر و ثواب سے ہوتا ہے اور مسائل کا تعلق اسی دنیا میں شریعت کے حدود کے اندر رہکر ظاہری عمل سے ہوتا ہے۔ مثلاً نماز روزہ کی کچھ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں کہ نفل نماز کی یہ فضیلت ہے اور اس کا یہ ثواب ہے نفل روزہ کا یہ ثواب ہے اور اس کی یہ فضیلت ہے اسی طرح فرض نماز اور فرض روزہ کا یہ ثواب ہے اور اس کی یہ فضیلت ہے، بالکل اسی طرح نماز روزہ خواہ نفل ہو یا فرض ان سب کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کچھ مسائل بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں کیا چیزیں فرض ہیں کونسی چیزیں واجب یا سنت یا مکروہ و حرام ہیں۔

پھر فضائل اور مسائل دونوں کی دو حیثیتیں ہیں ایک انفرادی زندگی کے احکام کی فضیلتیں دوسرے اجتماعی کاموں کی فضیلتیں۔ اسطرح مسائل کی بھی دو حیثیتیں، ایک انفرادی زندگی کے مسائل و فضائل دوسرے معاملاتی اور معاشرتی زندگی کے اجتماعی مسائل و فضائل۔

اسوقت ہمارے معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ کچھ لوگ انفرادی زندگی کے احکام کے فضائل میں اپنی زندگی کھپا رہے ہیں اور اجتماعی زندگی کے فضائل سے انکا کم ہی تعلق ہوتا ہے اور اسکو کل دین سمجھ رہے ہیں، اور کچھ لوگ اجتماعی زندگی کے احکام کے فضائل میں اتنے منہمک ہیں کہ انکی انفرادی زندگی انفرادی احکام کی فضیلتوں سے خالی ہے مگر وہ کل دین اسی کو سمجھ رہے ہیں۔

اسی طرح کچھ لوگ انفرادی زندگی کے جزیات و مسائل کو مقصود زندگی بنائے ہوئے ہیں اور اجتماعی زندگی کے مسائل کی انکے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے، کچھ اجتماعی مسائل کے حل کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگاتے نظر آرہے ہیں مگر انفرادی زندگی کے مسائل کی ابجد سے بھی وہ ناواقف ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ شریعت اسلامی مجموعہ ہے فضائل و مسائل دونوں کا ایک مومن کی

زندگی میں انفرادی زندگی کی فضیلتیں بھی ہونی چاہیئے اور اجتماعی زندگی کی فضیلتیں بھی، اسی طرح اسے اپنی انفرادی زندگی کے احکام و مسائل سے بھی واقف ہونا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے اور اجتماعی زندگی کے مسائل کا احساس رکھنا اور اسمیں اپنی استطاعت کے بقدر حصہ لینا ضروری ہے۔

اس صورت حال میں اگر ہر گروہ اپنے کو دین کامل کا حامل سمجھنے لگے گا تو لامحالہ وہ دوسرے کو ناقص تصور کرے گا اسلئے ضرورت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص فضائل اور مسائل کے جس پہلو کو بھی اہمیت دے رہا ہے اور اس پر کاربند ہے تو اسکو وہ ضرور اہمیت دے اور اس پر کاربند رہے لیکن اپنے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ وہ دین کامل کا علمبردار ہے اور جو دوسرے دینی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اُنکے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ وہ ناقص دین میں علمبردار ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ عہد صحابہ کے علاوہ کسی عہد میں مجموعی طور پر فضائل و مسائل دونوں کی اہمیت معاشرہ کے تمام افراد میں برابر نہیں رہی ہے۔ کچھ شخصیتیں تو ہر دور میں رہی ہیں جو صحابہ کی جامع زندگی کی یاد تازہ کرتی رہی ہیں اور اب بھی ہیں مگر مجموعی طور پر معاشرہ کا رخ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ رہا ہے اور آج بھی ہے اسلئے ضرورت اس بات کی ہے کہ دین کا جو کام جس حیثیت سے کوئی کر رہا ہے اسکے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور ایک دوسرے کیلئے دعا کیجائے اور ایکدوسرے کی تائید کیجائے ایکدوسرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیجائے اور یہ سمجھا جائے کہ دین کامل کی ساری خوبیاں مسلمانوں کے کسی ایک طبقہ ایک حلقہ یا ایک جماعت میں نہیں ہیں بلکہ یہ پوری اُمت کے افراد و جماعتوں اور دینی اداروں میں پھیلی ہوئی ہیں، اس وسیع النظری اور توافق کے ذہن کیساتھ اگر ہم اپنا طرز عمل بنالینگے تو اس سے معاشرہ کے اندر زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہوگی اور اسے دین کامل کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ملیگا اور اگر ہم ایسا نہ کرسکے تو قرآن پاک کی زبان میں امت واحدہ کے توڑنے کی مذمت کے ہم مصداق ہو کر رہ جائیں گے۔ سارے رسولوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔

(المومنون ۵۲ - ۵۳)

یہ ہے تمھارا طریقہ، اور وہ طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں تنہا تمھارا رب ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو، مگر انکی امت کے لوگوں نے اپنا اپنا الگ طریقہ پیدا کر کے اختلاف پیدا کرلیا اور ہر گروہ کے پاس جو دین ہے وہ اسی میں خوش اور مگن ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مسلمانوں کے اندر وسعت نظری کیساتھ دین پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ (آمین)

الرشاد کی ڈاک

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آپ بہ صحت و عافیت ہوں ......

دسمبر ۱۹۸۷ء کا الرشاد موصول ہوا۔ رشحات میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر آپ کے خیالات ہمیشہ بصیرت افروز اور توجہ طلب ہوتے ہیں۔ خدا کرے اسی نہج پر لوگوں کو غور و فکر کرنے اور عمل پیرا ہونے کی توفیق حاصل ہو۔ "زیارتِ حرمین شریفین کے کچھ تاثرات" کے تحت آپکی نگارشات سے معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ "دارالقضاء کے کچھ فیصلے" پڑھ کر آپکی اس اہم و قابلِ قدر مصروفیت سے پہلی دفعہ واقفیت ہوئی۔ الرشاد میں دارالقضاء کی سرگرمیوں کی وقتاً فوقتاً اشاعت یقیناً افادیت کا باعث ہوگی اور اس میں عوام کی دلچسپی میں بھی اس سے اضافہ ہوگا۔ مجلہ علوم القرآن پر آپکے تبصرہ کا شدت سے انتظار تھا لیکن افسوس کہ اس سے محرومی رہی۔ امید کہ آئندہ شمارے میں اس پر ضرور اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ میرے محترم رفیق ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صاحب کی جانب سے سلام قبول فرمائیں۔

والسلام ڈاکٹر ظفر الاسلام

محترم و مکرم عالی مرتبت حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب۔ دامت برکاتہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا — آج کافی مدت کے بعد حضرت والا کو خط روانہ کر رہا ہوں، باقی "الرشاد" کے ذریعہ حضرت والا کے مقالات اور قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتا ہی رہتا ہوں۔ دینی تعلیم کے بارے میں آپکی تحریر واقعی بہت ہی اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ دینی تعلیم کے بارے میں آپکے خیالات کو میں الہامی تصور کرتا ہوں کسی شمارہ میں آپ نے مکاتب قرآنیہ کے بارے میں زور دیا، واقعی میں اس کا سو فیصد حامی ہوں حضرت والا کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آپکا یہ جامعہ، جسکے کام کی ابتداء غریب دیہاتوں میں مکاتب کے شروع کرنے ہی سے ہوئی اور اس شعبہ کو جامعہ نے خوب بڑھایا۔ ابھی جامعہ کے ماتحت ۷۰ مکاتب قرآنیہ جاری ہیں جنمیں مدرسین کو جامعہ طے کرتا ہے اور معقول تنخواہ کا نظم جامعہ ہی کرتا ہے، اسکا پورا نظم ہے۔ سالانہ مصارف شعبۂ مکاتب کے تین لاکھ سے زائد ہیں۔ ابھی ایک علاقہ ہے جو آپ جیسے مورخ کو معلوم ہی ہوگا۔ سات پوڑا کے دامن میں ۵ لاکھ بڑودی پٹھان نامی برادری بستی ہے جو حضرت اورنگزیب رحمہ

کے زمانہ میں ایمان لائے تھے۔ ایمان لانے کے ساتھ ان پر تعلیمی کام نہ ہونے کی بنا پر وہ نام کے مسلمان رہے اور غیروں کے طریقے اپناتے رہے صرف ختنہ، نکاح میں مسلمان تھے۔ اس علاقہ کی طرف تبلیغی احباب کی برابر توجہ تھی اور آج بھی ہے لیکن علم دین کے مکاتب اور مدرس کے بغیر تبلیغ کو قوت نہیں مل سکتی۔

الحمدللہ جامعہ اکل کوا نے اس علاقہ میں ایک بچوں کا گھر "لیمباٹی" مقام پر قائم کیا وہاں اسی قوم کے بچوں کا داخلہ کیا جن کی دینی اور عصری تعلیم کا نظم کیا اور دیہاتوں میں ۱۵ مدرس کا تقرر کیا اور عبادت خانوں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ میں خود اس علاقہ کا سفر کرتا ہوں۔ نیز اسی قوم کے وہ چند نوجوان جو تبلیغی کام سے مانوس تھے، ان کو ہم نے جامعہ اکل کوا میں داخلہ دیا اور ان کو ہم مختصر مگر جامع کورس پڑھاتے ہیں تاکہ ہم انہی کو اس علاقہ میں مدرس، امام بنا سکیں جن کی تنخواہ کا نظم بھی ہم کرینگے اور ابھی ان طالب علموں کے گھر بھی ماہانہ ۵۰ روپئے جامعہ ارسال کرتا ہے۔

اس علاقہ میں ہم خدام جامعہ چار سینٹر بنانا چاہتے ہیں ایک لیمباٹی میں شروع ہو گیا جسکے ماتحت ۲۵ مکاتب ہوں گے، ابھی ۱۵ شروع کئے ہیں۔ دوسرا مرکز مارول میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ والا دعا فرمائیں کہ جامعہ ان ٹڑوی پٹھانوں میں اسطرح کام کرے کہ کوئی دیہات مکتب قرآن کے بغیر باقی نہ رہے۔

حضرت والا سے گزارش ہے کہ اس علاقہ کے دورہ کیلئے وقت فارغ فرمائیں تاکہ ہم اس علاقہ کا سفر کریں اس بہانہ سے جامعہ کو بھی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔

عالی مرتبت! آپکو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس جامعہ کے سرپرست عارف باللہ حضرت مولانا صدیق احمد باندوی صاحب مدظلہ ہیں۔ حضرت کی اس جامعہ کی طرف بہت ہی توجہ ہے اور سال گزشتہ شیخ عبداللہ عمر نصیف جامعہ کی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ جامعہ کا تعارف "دینی مدارس دہلی" میں شائع شدہ ہے۔

والسلام مع الاحترام　　　　　دعوات صالحہ میں یاد فرمائیں

خادم مولانا غلام محمد وستانوی، مہتمم جامعہ اسلامیہ اکل کوا

محترم المقام قبلہ!　　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس دور جاہلیت اور الحاد میں آپ حضرات نے جس تحریک کو برپا کر رکھا ہے اس سے حتی المقدور استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر چند کہ سگ دنیا ہوں اور اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کی بنا پر عدیم الفرصت رہتا ہوں مگر جب بھی ارشاد ڈاک سے موصول ہوتا ہے اسکا بیشتر حصہ پڑھ کر اٹھتا ہوں خدا کرے یہ رسالہ اپنے آب و تاب کے ساتھ ملت اسلامیہ کی خدمت کرتا رہے اور آپ کو اس کا اجر عظیم ملے

اس خط کے لکھنے کی غایت دراصل یہ ہے کہ ادھر حال میں مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اپنے "الرسالہ" کے ذریعہ بار بار مسلمانانِ ہند کو دوسرے درجہ کے شہری قرار دیا ہے اور اب کی بار انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنے جملہ دینی اور قومی و ملی امانتوں (مطالبوں) سے دست کش ہو جائیں، اس سلسلہ میں مشہور انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا نے ان کے اس استدلال کو کافی اہمیت دیتے ہوئے چھاپا ہے۔

نہ صرف ایک مسلمان بلکہ ایک عام ہندوستانی شہری کی حیثیت سے میں اس انداز فکر کو انتہائی تباہ کن اور ناعاقبت اندیشانہ سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات ہمارے نوجوانوں کے جملہ ملی اور اجتماعی احساسات کیلئے سم قاتل ہیں۔

آپ سے درخواست ہے کہ آپ اگلے شمارہ "الرشاد" میں اس موضوع پر اپنی گرانقدر تحریر سے نوازیں تاکہ عام پڑھے لکھے مسلمان ایسے گمراہ کن اور شکست خوردہ انداز فکر سے بچیں۔

کمترین۔ حبیب احمد ایڈوکیٹ، گورکھپور

وحید الدین خاں کی افتاد مزاج اور کردار

از۔ ابو خالد مدنی

وحید الدین خاں صاحب کے بارے میں "الرشاد کی ڈاک" میں اہلِ علم کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں جن میں ان کے خیالات پر لکھنے کا تقاضا ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا خط سے بھی ظاہر ہے۔ اس سے پہلے محترم حکیم عبد القوی صاحب کا خط شائع ہو چکا ہے مگر ان کی افتاد طبع سے واقفیت کی بناء پر اسے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور چوں کہ وہ خود مفکر اسلام بنے ہوتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں وہی طرز عمل اختیار کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا جو برصغیر کے ایک بڑے عالم نے اختیار کیا تھا۔ ایک بار انھوں نے لکھا کہ آپ کی یہ رائیں غلط ہیں۔ تو انھوں نے پہلے تو معقول انداز میں جواب دیا مگر جب اپنی افتاد طبع کی بنا پر اپنی برتری باقی رکھنے کے لئے پھر سخت انداز میں خط لکھا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ:

"آپ جیسے بلند مقام سے بولنے والے لوگوں کے بارے میں میں خاموشی اختیار کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ مگر مذکورہ بالا خط اور دوسرے خطوط سے معلوم ہوتا ہے وہ امت میں ایک نیا فتنہ کھڑا کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فتنہ انگیز خیالات کو انگریزی اور ہندی کے اخبارات خوب اچھال رہے ہیں۔

یہ حضرت بات تو آخرت کی کرتے ہیں مگر ان کی تحریروں کے ایک ایک فقرے میں اپنی عظمت و برتری کا اظہار ہوتا ہے، بظاہر دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں اور سارے لوگ ان کی نظر میں دنیا دار نظر

کرتے ہیں مگر خود سراپا دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ پہلے اپنے کو وحید الدین خاں لکھتے تھے مگر جب سے انھوں نے ضلع کے ایک مدرسہ کی ایک خاص ذریعے سے فرضی سند حاصل کر لی ہے اس وقت سے اپنے کو مولانا لکھنے لگے ہیں۔ رسالہ پر سرپرست وحید الدین خاں لکھا ہوتا ہے حالانکہ سرپرست وہاں لکھا جاتا ہے جہاں مرتب کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ آپ خود ہی مرتب ہیں مگر مرتب ذرا کم تر درجہ کا لفظ ہے اس لئے عظمت کے لئے سرپرست لکھتے ہیں۔

یہ ہے آخرت کی تحریر لکھنے والے کی دنیا پرستی اور اظہار برتری۔ آپ اکثر فرماتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کے صاحبزادے صاحب سے زیادہ سے اچھی نہ کوئی عربی جانتا ہے اور نہ ان کی صاحبزادی سے اچھی انگریزی۔ ان کے نزدیک عہد نبوی اور عہد صحابہ کے بعد سے (خیریت ہے کہ ابھی وہ عہد صحابہ تک نہیں پہنچے ہیں) اب تک ہمارے بزرگوں نے تجدید دین اور احیائے دین یا اسلام کے عملی غلبہ کے لئے جو جدوجہد کی ہے وہ سب وقت کا زیاں ہوا ہے۔ اس راستہ میں شہید ہونے والوں کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ لوگ شہادت کا لیبل لگا کر شاندار قبروں میں لیٹ گئے۔ غرض کہ ایک ہزار بارہ سو برس کی مدت میں دین کا کوئی صحیح رخ سے کام نہیں ہوا۔ سید احمد شہید نے تحریک جہاد چلا کر غلطی کی، جمال الدین افغانی نے غلطی کی سنوسی تحریک غلط تھی، حسن البنا نے غلطی کی اور اس وقت کے سارے علماء و راہنما جذباتی ہیں کسی کو دین کی ہوا نہیں لگی ہے، بس دین کا فہم تنہا ان کو ملا ہے۔

ملی معاملات اور مسائل کے سلسلہ میں آپ لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے تمام مطالبات سے دست بردار ہو جائیں اور اکثریت کی مرضی کے مطابق ہندوستان میں رہیں۔ تو غرض یہ ہے کہ ملت کے افراد کو تو آپ مشورہ یہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے مسائل کے سلسلہ میں کشمکش نہ کریں، وہ مقابلہ آرائی کے بجائے اپنے کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیں، مگر آپ کا ذاتی کردار یہ ہے کہ آپ کو جب "الجمعیۃ" کی ایڈیٹری سے نکالا گیا اور اس کا وہ مکان خالی کرنے کے لئے کہا گیا جو آپ کو بحیثیت ایڈیٹر دیا گیا تھا تو آپ نے مقدمہ دائر کر کے ڈگری لے لی اور ناجائز طور پر اس پر برسوں قابض رہے۔ اس وقت نہ آخرت یاد آئی اور نہ شریعت کا حکم نظر آیا، تو آپ اپنی ذات کے لئے ایک حقیر سے فائدہ کے لئے تو کشمکش کریں اور ملت کے وسیع مفاد کے بارے میں اسے مشورہ یہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے دینی و ملی مطالبات سے دست بردار ہو جائے۔

آپ کو قذافی کے ہفوات کے ترجمہ کے بدلے لیبیا بلایا گیا اور ایک بھاری رقم ملی تو آپ نے ایک بلڈنگ دلی میں خریدی اور دوسری حیدر آباد میں اور دونوں کو اپنے اپنے لڑکے کے نام خریدا اور رسالے میں شو یہ کرتے ہیں کہ یہ اسلامی مرکز کی عمارت ہے اور اس کے لئے چندہ ہی کی نہیں بلکہ اپنے قومی

کے مطابق زکوٰۃ کی بھی اپیل کرتے ہیں، اور اسلامی مرکز نام ہے، باپ بیٹے روح القدس کا۔ افریقہ میں ایک کانفرنس کے موقع پر لیبیا کے نمائندے نے مولوی انعام الحق صاحب، جو افریقہ میں مبعوث ہیں، سے کہا کہ "ہم کو وحید الدین خاں جیسے بے ضرر کچھ آدمیوں کی ضرورت ہے جو ہمارے ملک لیبیا کی طرف سے مبعوث ہیں"

ایک بار دلی میں ملاقات کے وقت ایک ممتاز ذمہ دار عالم نے ان سے کہا کہ آپ آخرت کی بات تو بہت کرتے ہیں مگر ہم کو آپ کی کوٹھی میں تو آخرت نہیں نظر آتی، البتہ بنگلہ والی مسجد میں نظر آتی ہے، تو سخت خفا ہو گئے اور تبلیغی کام پر تنقید کرنے لگے، مگر اب اپنے مفاد کے لئے اس کی تعریف کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس ملاقات کے درمیان عالم صاحب کے ایک ساتھی نے کہہ دیا کہ آپ کو لوگ قذافی کا ایجنٹ کہتے ہیں، تو کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور چیخنے لگے کہ میں قذافی کا ایجنٹ ہوں؟ اور ایک ملازم کو بلا کر کہا کہ بتاؤ میں فلاں کا ایجنٹ ہوں؟ وہ بیچارہ نہ ہاں کہہ سکا اور نہ نہیں۔

بہر حال یہ تو ان کی آخرت طلبی اور افتاد طبع کے بارے میں چند ناگوار باتیں اس لئے قلم پر لانی پڑیں کہ یہ جو وحی والہام کی زبان میں باتیں کرتے ہیں اس کا پس منظر بھی لوگوں کے سامنے آجائے اور لوگ ان کے فتنہ سے محفوظ رہ سکیں۔ اب یہ بات کہ مسلمانوں کا اپنے دینی و ملی مسائل کے سلسلہ میں کشمکش کرنا صحیح ہے کہ نہیں اس پہلو پر ایک سرسری نظر ڈال لینی ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ ایک مدت تک جب تک یہ دولت کے ڈھیر پر نہیں بیٹھے تھے اس وقت تک وہ ہر کشمکش کو صحیح سمجھتے تھے۔ ان کے کئی پمفلٹ اس کے شاہد ہیں جس میں پارلیمنٹ پر قبضہ کرنے کے لئے للکارا ہے مگر جب سے دولت کے ڈھیر پر بیٹھ گئے ہیں تو وہ ہر سرمایہ دار کی طرح اپنی عافیت اس میں سمجھتے ہیں کہ کشمکش سے دور رہا جائے تاکہ اپنا عیش و تنعم خطر میں نہ پڑے اور دنیا سمیٹنے کی جدوجہد میں کوئی خلل نہ پیدا ہو، حالانکہ انسانی زندگی کی ترقی کا راز اسی کشمکش حیات میں ہے عارف ہندی نے صحیح کہا ہے: اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔ خاص طور پر توحید کی ماننے والی قوم کے لئے کشمکش تو لازمہ حیات ہے۔ دوسری بات یہ کہ جہاں تک دین وملت کے مسائل کے سلسلے میں کشمکش کا تعلق ہے اس سے ہماری پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے نہ صرف اہل کفر اور اہل شرک سے کشمکش ہمیشہ جاری رکھی بلکہ جب انھوں نے اپنوں میں بھی کوئی بے راہ روی دیکھی تو ان سے بھی کشمکش سے باز نہیں رہے۔ ان کے سامنے ہمیشہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد رہا کہ:

من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم — تم میں سے جب بھی کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہئے کہ اگر قوت ہو تو اپنی طاقت سے اسے مٹا دے، اگر اسکی استطاعت نہیں ہے تو زبان

يستطيع فبقلبه وذالك اضعف الايمان۔ — سے اسے برا کہے، اگر اسکی ہمت بھی نہیں ہے تو دل کے اندر اسے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کو قید و بند کی سزا کس جرم میں ملی تھی، حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کا بازو کس جرم میں اکھڑ دیا گیا تھا، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو خلق قرآن کے مسئلہ پر کیا کچھ نہیں سہنا پڑا تھا۔ اسی طرح امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی کو کس جرم میں جیل میں ڈال دیا گیا تھا؟ یہی حضرات ہیں جن کی قربانیوں کے واقعات پڑھ کر ہمارے ایمان میں تازگی اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور صحابہ کرام کی پاکیزہ زندگی کا جو بھی شخص ایک سرسری مطالعہ کرے گا اسے نظر آئے گا کہ ان کی پوری زندگی کشمکش میں گزری۔ کبھی وہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں سے کشمکش کرتے رہے اور کبھی وہ اپنوں کو راہ راست پر رکھنے کے لئے ان سے کشمکش کرتے رہے۔ اور اس مستقل کشمکش کو نہ صرف اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا بلکہ قیامت تک ان سے کشمکس کرنے کے لئے اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط رکھے رہنے کی ترغیب دی۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں صحابہ کے بارے میں رضی الله عنهم ورضوا عنه فرمایا ہے ہر جگہ کشمکش یعنی جہاد میں ثابت قدم رہنے کی بنا پر انھیں اس اعزاز سے نوازا گیا ہے اور ہمیشہ اس کشمکش کے لئے تیار رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا گیا:

وَاَعِدّوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم۔ (سورۂ انفال) — جس قدر تم سے ہو سکے قوت یعنی ہتھیار اور پلے ہوئے گھوڑوں وغیرہ سامان درست رکھو تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنا رعب جمائے رکھو۔

اتنا ہی نہیں فرمایا گیا کہ موجود دشمنوں کے مقابلہ میں یہ تیاری رکھو بلکہ ان دشمنوں کے لئے بھی اپنی تیاری رکھو جن کا علم متعین طور پر تم کو نہیں ہے: وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم "ان کے علاوہ دوسرے دشمن بھی ہیں جن کو ابھی تم نہیں جانتے مگر اللہ تعالیٰ جانتا ہے"۔

ہجرت کے بعد مدینہ کی آب وہوا مہاجرین کے لئے زیادہ راس نہیں آئی اور کچھ کمزور ہوگئے۔ جب وہ عمرہ کے لئے گئے تو کفارِ قریش نے ان پر طنز کیا کہ ان سے طواف بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔ حضور کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ طواف میں ذرا اکڑ اکڑ کر چلو یعنی رمل کرو تاکہ لوگ تم کو کمزور نہ سمجھیں۔ یہ رمل کی سنّت قیامت تک کے لئے طواف کا اس لئے جزبنادی گئی کہ

مسلمان کبھی بھی اپنی جسمانی کمزوری کا اظہار نہ ہونے دیں تاکہ دشمنوں کو ان کے دینی وملی امتیاز کو مٹانے کی جرأت نہ ہوسکے۔

مذکورہ بالا واقعات اور اسوۂ نبوی اور اسوۂ صحابہ پر جو ذرا بھی غور کرے گا وہ قطعی طور پر وحیدالدین خاں جیسے لوگوں کی باتوں کو نہ صرف غلط سمجھے گا بلکہ مسلمانوں کو ہر حال میں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کی تعلیم دینے والے کو قرآن کی تحریف اور اسوۂ نبوی کی توہین کا مجرم قرار دے گا۔ یہ کشمکش ہی ہے جس سے دین اور دین کے شعائر محفوظ رہ سکتے ہیں اور دنیا سے فساد مٹ سکتا ہے، اللہ کی ہمیشہ یہی سنت رہی ہے۔

ولولا دفع اللہ النّاس بعضھم ببعض لّھُدّمت صوامع وبیع ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً ولینصرنّ اللہ من یّنصرہ انّ اللہ لقویّ عزیز۔
(سورۃ الفرقان)

اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالےٰ ایک دوسرے کے ذریعہ طاقت کو نہ توڑتا رہتا تو ہر زمانے میں گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے۔ سب منہدم ہو جاتے۔

اس آیت میں اللہ کی سنت بیان کرنے سے پہلے یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ ہمیں کشمکش کرنا کس وقت ضروری ہو جاتا ہے۔

اذن للّذین یقاتلون بانّھم ظلموا وانّ اللہ علی نصرھم لقدیر۔
(الحج)

ان لوگوں کو کشمکش اور مقابلہ کی اجازت دے دی گئی ہے جنکے افراد کو قتل کیا جا رہا ہے، یہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت اسلئے دی گئی ہے کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ مظلومین کی مدد پر قادر ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے مظلوموں کی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ وہ چاہے ان کی طاقت کو دوسری طاقت سے کچل کر دور کرے یا ان کے دماغ کو راہ راست پر لاکر، بے شمار احادیث نبوی میں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب ہی نہیں دی گئی بلکہ اسے فرض قرار دیا گیا۔ جو لوگ ان حالات میں صبر وضبط کی یا عدم تشدد کے موہوم فلسفہ کی تلقین کرتے ہیں وہ دشمنوں کا ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ ان چالیس برس کے اندر کون سا ایسا ظلم ہے جو مسلمانوں پر نہیں توڑا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان اپنے دین، اپنی تہذیب، اپنے پرسنل لا اور اپنی مسجدوں اور شعائر کو مٹتے دیکھتے رہیں یا وہ اس کے تحفظ کے لئے کچھ کریں۔ اگر ہاتھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے تو کیا زبان و تحریر سے اپنے اوپر ہونے والے

ظالموں کے خلاف آواز بھی نہ اٹھائیں؟ وحیدالدین صاحب قرآن کی صریح تعلیم کو پس پشت ڈال کر اکثریت اور برسراقتدار طاقتوں سے کشمکش کو چاہے شجرِ ممنوعہ قرار دیں مگر ہم تو قرآن وحدیث کے مذکورہ بالا احکام کی بنا پر ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور سارے مسلمانوں کو فرض سمجھنا چاہیئے۔

وحیدالدین صاحب کے گھر پر اگر کوئی ناجائز قبضہ کرنے آجائے یا ڈاکہ پڑ جائے تو کیا وہ صبر وضبط سے کام لے کر خاموش بیٹھے رہینگے یا حتی الامکان اپنے گھر کی حفاظت کرینگے۔ حیدرآباد کے ان کے اسلامی مرکز پر جن لوگوں نے بے دخل کرنے کی کوشش کی تھی اور اکاؤنٹ پر قبضہ کر لیا تھا ان سے وہ مقدمہ کیوں لڑے اور غلط صحیح ثبوت فراہم کرکے ان کو بے دخل کرنے کی کوشش کیوں کی؟ شخصی طور پر اس صبر وضبط پر عمل نہ کریں لیکن ملت کو اگر اسکے سارے حقوق سے محروم کر دیا جائے اور زبردستی ان کے امتیازات کو مٹانے کی کوشش کی جائے تو اسے صبر وضبط کا وعظ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جا و بے جا ہر جگہ اور ہر موقع پر ہم کشمکش ہی کریں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ معقول انداز میں کوئی بات نہیں سنتے ہیں تو قانونی حدود کے اندر ان سے ذرا سخت انداز میں بات کرنا اور اسکے لئے عملی اقدامات کرنا ہمارے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ وحیدالدین خاں اور بعض دوسرے حضرات صلح حدیبیہ کی مثال پیش کرتے ہیں ان سے عرض ہے کہ صلح حدیبیہ کو انھوں نے سمجھا ہی نہیں۔

صلح حدیبیہ کا سب سے زیادہ قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ کفارِ قریش نے پہلی بار مسلمانوں کو برابر کی طاقت تسلیم کیا اور صلح کی پیشکش کی جو اُن کی سب سے بڑی شکست تھی۔ آپ نے بظاہر جو دب کر صلح کی۔ اس کا دوسرا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مدینہ منورہ سے یہود جب نکلے تو انھوں نے خیبر کو اپنا مرکز بنایا جو پہلے سے اُن کا بہت مضبوط قلعہ تھا اور زرخیز علاقہ ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے سامانِ جنگ سے وہاں کے باشندے لیس تھے گویا اسلام کے خلاف وہاں ایک نیا مضبوط محاذ بن رہا تھا اور وہ کفارِ قریش سے ملکر بہت بڑی مصیبت بن سکتے تھے اسلئے ضروری تھا کہ پہلے سب سے بڑے دشمن کو خاموش کر دیا جائے اور پھر نئی طاقت کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی ان پر حملہ کرکے ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے توڑ دیا گیا۔ صلح حدیبیہ سے دوسرے بیشمار فوائد ہوئے جن کی بنا پر اسے فتح مبین قرار دیا گیا۔ ان اسباب کو سامنے رکھکر اگر صلح حدیبیہ پر آپ غور کرینگے تو پھر یہ کہنے کی جرأت نہ ہوگی کہ مسلمان اپنے آپ کو دوسروں کے حوالے کر دیں۔ اگر آج ہندوستان کی حکومت ہم کو حقوق میں برابر کا شہری مان لے اور ہمیں اپنے دینی وملی امتیازات کے باقی رکھنے کا پورا اطمینان ہو جائے تو ہم اسمبلی اور پارلیمنٹ کی چند سیٹوں یا ملازمتوں میں تناسب کے اضافہ کیلئے کوئی تحریک نہیں چلائینگے ہم نے اب تک اپنی جان ومال کے تحفظ کیلئے تحریک چلائی ہے، مسلم پرسنل لا کیلئے تحریک چلائی ہے، زبان وتہذیب کے تحفظ کیلئے تحریک چلائی ہے، اپنی مساجد ومقابر کیلئے تحریک چلائی ہے اور چلائیں گے۔ وحیدالدین خاں اپنے گوشۂ سلامتی وعافیت میں مسلمانوں کو کوستے رہیں مگر انشاء اللہ ان کے سرمایہ کا قلعہ زمیں بوس ہو جائیگا اور مسلمان اپنی

نئی کتابیں

مجلہ علوم القرآن (ششماہی) ادارہ علوم القرآن، نیوسرسید نگر، علی گڑھ

ضخامت سو صفحات ، قیمت ۵ر فی پرچہ

اس مجلہ کے اتبک تین شمارے شائع ہو چکے ہیں ان میں سے ہر شمارہ میں جتنے مضامین ہیں وہ قریب قریب سب معیاری اور محنت و تحقیق کا بہترین نمونہ ہیں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اصلاً اس کا موضوع قرآن پاک، اس کی تفسیر اور اس سے متعلق علوم پر تحقیقی مضامین پیش کرنا ہے لیکن دوسرے دینی علوم پر بھی اس میں تحقیقی مضامین شامل ہو سکتے ہیں۔

عام طور پر اردو پرچوں میں بہت کم پرچے ایسے ہوتے ہیں جن کا ہر مضمون شروع سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مگر علوم القرآن کے مضامین الف سے ی تک پڑھنے کے قابل ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کے مطالعہ سے اپنے علم میں اضافہ ہوتا ہے اس کا پہلا پرچہ ملنے کے بعد ہی اس پر کچھ لکھنے کا جی چاہا مگر افسوس ہے کہ اس کا موقع اب آرہا ہے۔

اس کی مجلس ادارت میں زیادہ تر مدرستہ الاصلاح سرائمیر کے فضلاء شامل ہیں، ان فضلا نے اس میں قرآن پاک سے اپنے شغف کا پورا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صدی میں قرآن پاک پر غور و فکر کے بہت سے نئے گوشوں کی طرف راہنمائی کی ہے اور انھوں نے اس سلسلہ میں بہت سی قیمتی کتابیں، تحریریں اور اشارے چھوڑے ہیں افسوس ہے کہ کچھ ہماری تنگ نظری اور مدارس میں عقلی علوم کی ضرورت سے زیادہ کار فرمائی نے قرآن پاک پر غور و فکر اور مولانا کے زاویہ فکر سے فائدہ اٹھانے کا ہم کو بہت موقع دیا جس سے قرآن پاک کی خوبیوں کے بہت سے پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس کی بعض سورتوں اور آیتوں کے بارے میں اتبک ہم جو کچھ سمجھتے رہے ہیں اس سے قرآن کی معجزانہ عظمت کو دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ مولانا فراہی کے بہت سے تفردات بھی ہیں جن سے اتفاق ضروری نہیں ہے لیکن مجموعی حیثیت سے انھوں نے

قرآن پاک پر غور و فکر کے جو نئے زاویے دیئے ہیں ان سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ مجلہ علوم القرآن میں مدرسۃ الاصلاح کے فضلا نے مولانا فراہی کے افکار کی بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔

سورہ لہب کے بارے میں عام تفسیروں میں جو بات کہی گئی ہے اس کی روشنی میں جب اس سورہ کو پڑھتا تو دل میں کوئی خاص ذوق و شوق کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تھی مگر جب سے مولانا کی تفسیر پر نظر پڑی جس میں انھوں نے اسے خبر اور ایک پیشین گوئی قرار دیا ہے جو پوری ہوئی تو قلب میں ایک عجیب انشراح کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اسی طرح نظم قرآن کے سلسلہ میں جو ان کی بہت سی قیمتی اور حکیمانہ رائیں ہیں وہ انتہائی قابل قدر ہیں۔

ہم مدرسۃ الاصلاح کے فضلا اور اس سے متعلق افراد اور اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی اور سکریٹری ڈاکٹر ظفر الاسلام کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے ام الکتاب کی خدمت کا جو عزم کیا ہے انشاء اللہ اس سے اہل مدارس اور اہل علم کو قرآن پاک کے سلسلہ میں ایک نئی بصیرت حاصل ہوگی البتہ یہ مشورہ ضرور ہے کہ قدیم مفسرین کے سلسلہ میں کوئی استخفاف کا پہلو نہ آنے پائے اور روافعاتی آیات کی جو تفسیریں متواتراً ثابت ہیں ان کو اپنی تحقیق کا ہدف نہ بنایا جائے ورنہ اہل علم کے ایک بڑے حلقہ کو اس سے اشمئزاز پیدا ہوگا اور بہت سی مفید چیزوں سے بھی فائدہ اٹھانے سے گریز کریں گے۔ ضرورت تھی کہ اس پرچہ کے ہر مضمون کے سلسلہ میں تفصیلی روشنی ڈالی جاتی، لیکن اسکا موقع نہیں مل سکا البتہ ڈاکٹر ظفر الاسلام، ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر اجمل اصلاحی، سلطان اصلاحی وغیرہ کے مضامین کی تحسین کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی ان حضرات کے ذریعہ خدمات کو قبول فرمائے۔

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی اے میں اور فضیلت پاس کرنیکے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے، کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں:

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ وقرآت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت وجلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر واشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دو درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درس گاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط وکتابت کرنا چاہیئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہوجاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ شوال سے داخلہ شروع ہوجاتا ہے اور ۲۰ شوال تک ختم ہوجاتا ہے۔

Regd. No. Azm./N.P. 42/84
Regd. No. R.N. 34937/81
MONTHLY JAMEATUR RASHAD
AZAMGARH 276001 (U.P.) INDIA

ماہنامہ
جامعۃ
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ یوپی

جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ، کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۔/۳۰
خصوصی معاون ۔/۱۰۰
قیمت فی پرچہ ۔/۳

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بذریعہ ڈاک ہوائی
15/-

جلد نمبر ۱۵ | فروری ۱۹۸۸ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ | شمارہ نمبر

فہرست مضامین

مجلس ادارت

منیجر توسیع و اشاعت
مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

کاتب
رفیق احمد۔ شاہ پور۔ کندھرا پور۔ اعظم گڈھ

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا

اقلیتی کمیشن کے چیرمین محمد حمید اللہ بیگ صاحب نے اخبار نویسوں کو بیان دیتے ہوئے بہت سی باتیں اقلیتوں سے متعلق کہی ہیں، یہ بھی یاد رہے کہ اس سال ان کو پدم بھوشن کا اعزاز ملا ہے، اور اس وجہ سے ملا ہے کہ وہ چھاگلا ٹائپ کے مسلمان ہیں، مگر ان کی زبان سے کچھ حقیقت پسندانہ باتیں بھی نکل آئی ہیں اگرچہ ان کے اس بیان میں بعض باتیں انتہائی غلط بھی ہیں، مگر جو باتیں ہمارے لیے قابل غور ہیں انھیں ہم نقل کر رہے ہیں

"نئی دلی۔ یہاں آج ۵ رفروری کو اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے جسٹس بیگ نے کہا کہ پندرہ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے معاملہ میں اتر پردیش کی پوزیشن بدترین ہے، انھوں نے مزید کہا کہ بہار کی حالت یوپی سے بہتر ہے۔

انھوں نے کہا کہ کمیشن نے پانچویں، چھٹی، ساتویں رپورٹیں پیش کر دی ہیں، انھوں نے الزام لگایا کہ افسروں نے یہ رپورٹیں دبائی ہیں اور حد یہ ہے کہ انھیں پارلیمنٹ تک میں پیش نہیں ہونے دیا، انھوں نے کہا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کمیشن کے قیام کا مقصد اقلیتوں کو رعایتیں دینا ہے، انھوں نے کہا کہ لیکن انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اقلیتوں کو انصاف دلانے کے لیے کمیشن قائم کیا گیا ہے، انھوں نے مطالبہ کیا کہ کمیشن کی رپورٹوں کو شائع کیا جائے۔

انھوں نے اس تجویز کی حمایت کی کہ اقلیتی مسائل کے ماہرین کو کمیشن کا ممبر نامزد کیا جائے خواہ وہ اقلیتی فرقہ کے ہوں یا اکثریتی فرقہ کے، انھوں نے کہا کہ کمیشن نے اس سلسلہ میں حکومت سے سفارش کی ہے۔

انھوں نے مذہبی آزادی کے ضابطہ بندی کیے جانے کی وکالت کی اور سیاستدانوں سے اپیل کی کہ ملک کے وسیع تر مفادات میں عوام کے مذہبی جذبات سے نہ کھیلیں۔"

(نیشنل ہیرالڈ، ۶ رفروری ۱۹۸۱ء)

اس بیان کو ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ اندازہ لگایا جائے کہ حکومت کے انتہائی وفادار لوگ بھی حکومت کی نااہلی اور افسرشاہی کے نہ صرف شاکی ہیں بلکہ اس پر ان کو سخت جھلاہٹ ہے،

ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) اقلیتوں کے مسائل کے سلسلہ میں حکومت یوپی کا کردار بہت ہی خراب ہے۔

(۲) وہ اب تک حکومت کو سات رپورٹیں پیش کر چکے ہیں، مگر وہ ساری رپورٹیں افسروں نے دبا رکھی ہیں۔

(۳) انھوں نے تجویز رکھی ہے کہ اقلیتی کمیشن میں اقلیتوں کے مسائل کے ماہرین کو اس کا ممبر بنایا جائے، مگر ایسا نہیں ہوا۔

(۴) انھوں نے کہا ہے کہ کمیشن کے مقرر کرنے کا مقصد اقلیتوں کو رعایت دلانا نہیں ہے، بلکہ انصاف دلانا ہے۔

(۵) انھوں نے حکومت کو آگاہ کیا کہ عوام کے مذہبی جذبات سے وہ نہ کھیلے۔

ان کے بیان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرکزی یا صوبائی حکومتیں کسی مسئلہ کے سلسلہ میں جب کوئی کمیشن مقرر کرتی ہیں تو اس کا مقصد مسئلہ کو حل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کو ٹالنا اور اس کی طرف سے توجہ ہٹانا مقصود ہوتا ہے، چنانچہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقلیتی کمیشن اب تک سات رپورٹیں حکومت کو بھیج چکا ہے، مگر اس مسئلہ پر غور و فکر کی بات تو دور رہی، وہ رپورٹیں افسروں کی درازسے نکل کر وزارت کی میز تک بھی نہیں پہونچ سکی ہیں۔

پھر اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ رعایت کی بات تو دور کی ہے، ان کو موجودہ حکومت سے انصاف بھی نہیں مل پا رہا ہے، انصاف دلانے ہی کے لیے یہ کمیشن قائم کیا گیا تھا، مگر وہ کوئی انصاف نہ دلا سکا۔

جو حضرات یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے مسائل کو حکومت کی سطح سے طے کر لینا چاہیے، ان سے میں پوچھتا ہوں کہ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ ہو یا مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ ہو، نصاب تعلیم میں فرقہ وارانہ ذہنیت کا مسئلہ ہو یا اردو زبان کے سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے میمورنڈم پر ۲۰ لاکھ آدمیوں کے دستخط ہوں، ان میں سے کوئی مسئلہ اب تک حکومت کی سطح سے طے ہو سکا ہے؟ اگر کوئی مسئلہ طے ہوا ہے تو عوام کے احتجاج سے گرفتاری سے اور جان و مال کی قربانی سے۔

آئی۔ کے۔ گجرال کمیشن نے ۱۹۷۵ء میں اردو زبان کے بارے میں ایک ضخیم رپورٹ پیش کی،

مگر افسوس ہے کہ بارہ برس گذر جانے کے بعد بھی اردو کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ یہی حال دوسرے کمیشنوں کی رپورٹوں کا ہے۔

انہی وجوہ سے راقم الحروف برابر لکھتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی ایک مضبوط سیاسی جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ حکومت ہو یا حکمراں پارٹی یا ملک کی دوسری پارٹیاں، ان میں سے کوئی بھی اخلاق و محبت اور انصاف و مروت کی زبان نہیں سنتا۔ وہ اگر سنتے ہیں تو سیاسی دباؤ کی زبان، ووٹوں کے وزن کی بات۔ ڈاکٹر فریدی کا مسلمان عوام نے بھرپور ساتھ نہیں دیا، مگر حکمراں اور مخالف پارٹیاں یہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کی جھولی میں بھی ان کو دینے کے لیے کچھ ہے، اس لیے اندرا گاندھی جیسی مضبوط وزیر اعظم بھی ان کی چوکھٹ پر حاضر ہونے پر مجبور ہوئیں، اور مخالف پارٹیوں کے لوگ بھی مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں ان کے ساتھ جیل گئے۔ اور بھرپور تعاون کیا۔ مسلمانوں کو اس وقت سب سے پہلے اپنی ایک مضبوط تنظیم بنانی ضروری ہے، اور پھر پچھڑے ہوئے طبقہ کو ملا کر اپنا کوئی سیاسی وزن پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگر ہم نے اپنی مضبوط تنظیم قائم کر لی اور پچھڑے ہوئے طبقہ کو ملا کر اپنا سیاسی وزن ڈال سکے تو یقین ہے کہ ہمیں اپنے مسائل کے حل میں ان سے بڑی مدد ملے گی، اور چالیس برس کے اندر ہم نے جو کچھ کھویا ہے اس سے زیادہ پانے کی پوزیشن میں ہم ہو جائیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی ایک مضبوط اجتماعی قوت پیدا کرنے کے بعد پھر کسی بھی سیاسی جماعت سے ہاتھ ملائیں، ورنہ اگر کمزور اجتماعی قوت کے ساتھ ہم نے چند سیٹوں کیلئے کوئی معاملہ کیا تو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ جو کچھ ہمارا وزن باقی ہے وہ بھی جاتا رہے گا

اس لیے اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اپنا جماعتی اور مسلکی تشخص باقی رکھتے ہوئے ملت کے اجتماعی مفاد کی خاطر ایک متحدہ سیاسی محاذ بنا لیں، اگر کوئی انفرادی قیادت قابل قبول نہیں ہے یا وہ نہیں بن پا رہی ہے تو ایک اجتماعی قیادت کو وجود میں لانے کی کوشش کریں، گو پوری افادیت تو اپنے انفرادی اور اجتماعی تشخص سے صرف نظر کر کے آپس میں ضم ہو جانے میں ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا تو کم سے کم مذکورہ بالا صورت تو اختیار کرنی ہی چاہیے، اگر خدانخواستہ مستقبل قریب میں ہم ایسا نہ کر سکے تو ہمیں اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس وقت ساری سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو سیاسی سطح پر صفر مان کر اپنی صفیں درست کر رہی ہیں۔ ہمارے راہنماؤں کو اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

اس وقت ملک کی صورت حال یہ ہے کہ علاقائی ذہنیت رکھنے والی سیاسی پارٹیوں کے اثرات تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اور طبقہ واریت کو ہر طرف سے شہ مل رہی ہے، ایسی صورت میں مسلمان جن کو تمام خرابیوں اور اختلافات کے باوجود دین کا رشتہ بڑی حد تک آپس میں جوڑے ہوئے ہے۔ وہ اگر آگے بڑھ کر اچھی اور مضبوط اجتماعیت کا مظاہرہ کر سکے تو یہ نہ صرف ملت کے لیے خوش آیند بات ہوگی بلکہ اس سے ملک کو بھی سیاسی و سماجی دونوں طرح بے فائدہ پہونچے گا۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اجتماعی قوت اور اجتماعی قیادت منفی اور نفرت کی بنیاد پر یہ چند سطحی مفادات کی خاطر نہ بنے، جیساکہ فرقہ پرست طاقتیں کر رہی ہیں، بلکہ دین کے تقاضے اور ملت کے وسیع مفاد کے پیش نظر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں ہمارے راہنما اور خواص عام طور پر عوام کے سلسلہ میں مایوسی کی بات کرتے ہیں لیکن ہم ان حضرات سے کہیں گے کہ ؎

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ ۔۔ کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

ادھر مسلم پرسنل لا اور بابری مسجد کے سلسلہ میں ہمارے عوام نے جس اتحاد اور یک جہتی کا ثبوت دیا ہے، اس کی روشنی میں ہم اپنے راہنماؤں سے کہیں گے کہ اس خزاں رسیدہ چمن کے پیچھے بہار کی نازک وستیاں بھی چھپی ہوئی ہیں ؎

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے ۔۔ کاروان بہار دیکھا ہے

الرشاد کی ضرورت اور کام

اس ہوش ربا گرانی کے زمانہ میں کسی نئے پرچہ کا نکالنا اور جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے، مگر کسی ادارہ کے مقاصد، عزائم اور ان کے کاموں کی پوری نوعیت کو دوسروں کو سمجھانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ خود ادارہ کا ایک آرگن ہو، اس وقت مسلمانوں کے اندر جماعتی، مسلکی، طبقاتی اور سیاسی عصبیتیں اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں کہ کسی کو اپنے حلقہ کے باہر کوئی خوبی نظر نہیں آتی، اور ان کے رسالے پرچے، اخبارات سب اس کا شکار ہیں، اب اگر کوئی شخص یا ادارہ ان کے ذہنی سانچے اور بنائے ہوئے طریقۂ کار سے ہٹ کر کوئی دینی، شرعی یا ملی بات خواہ کتنی ہی حقیقت پسندانہ ہو کہنا چاہے تو مشکل ہی سے اس کی کوئی بات وہ لوگ سن سکتے ہیں اور ان کے پرچے اسے چھاپ سکتے ہیں، اسی صورت حال سے مجبور ہو کر باوجود خسارہ کے پرچہ نکالا جا رہا ہے کہ اگر دین و اخلاق یا ملک و ملت کے سلسلہ میں اعتدال

دتوازن اور اتفاق و اتحاد کی کوئی بات کہنی ہو تو اس کے لیے کوئی دائرۂ اثر خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، ہونا ضروری ہے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چھوٹے سے دائرہ کے ذریعہ امت کے اندر اعتدال و توازن اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا کوئی معمولی سے معمولی کام لینے کی توفیق عطا فرمادے۔

ناظرین الرشاد اس بات کی ضرور شہادت دیں گے کہ بحمد اللہ الرشاد اب تک دینی اسی روش پر قائم ہے، اصلاً یہ پرچہ دینی موضوعات اور مسائل پر تحقیقی مضامین شائع کرنے کیلئے نکالا گیا ہے لیکن ملک و ملت کے مسائل پر بے لاگ اپنی رائے کا اظہار کرنا اور ظلم و نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانا بھی ہم دینی احساس اور ملی حمیت و غیرت کا تقاضا سمجھتے ہیں، اس لیے ہم برابر اپنی حقیر رائے "رشحات" کے ذریعہ پیش کرتے رہتے ہیں اس سلسلہ میں بسا اوقات ہم کو تنقید کا ناگوار کام بھی انجام دینا پڑتا ہے جس میں شر ور نفس کا دخل بھی ممکن ہے اس لیے ہم اللہ تعالیٰ سے شر ور نفس سے پناہ مانگتے ہیں ساتھ ہی یہ دعاء بھی کرتے رہتے ہیں کہ ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا

دینی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ اور باتیں

اس سے پہلے ہم مسلسل ابتدائی دینی تعلیم کے لیے ایک زبردست مہم چلانے کی طرف اہل مدارس اور ملت کے ذمہ داروں کی توجہ مبذول کراتے رہے ہیں، اور بحمد اللہ بے شمار لوگوں نے اس کی عملی طور پر ہمت افزائی کی ہے، اس سلسلہ میں چند اور باتیں عرض کی جارہی ہیں۔

بہت سے لوگ مکتب کی تعلیم کو وقت کا زیاں سمجھتے ہیں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے نرسری اسکولوں یا دوسرے اسکولوں میں اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے بھیجنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ مکتب کی تعلیم کو وقت کا زیاں صرف اس لیے سمجھتے ہیں کہ وہاں معیاری تعلیم نہیں ہوتی یا وہاں کا ماحول زیادہ صاف ستھرا نہیں ہوتا؟ تو آپ بتائیں کہ کیا اس کی ذمہ داری آپ کے اوپر نہیں ہے؟ اگر ایک محلہ میں دو چار آدمی اس قابل ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو بیس پچیس روپے ماہوار فیس دے کر پرائمری اور نرسری اسکولوں میں پڑھا سکیں تو آپ کے پڑوس میں ہزاروں غریب بچوں کا بھی آپ کو کبھی خیال آتا ہے یا نہیں کہ اگر یہ جاہل رہ گئے تو ان کی وجہ سے پورا ماحول خراب ہوگا اور پھر اس سے آپ کا بچہ بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ پھر اس حیثیت سے بھی آپ کو غور کرنا چاہیے کہ اگر آپ نے اپنے بچے کو دینی تعلیم سے بالکل بے بہرہ رکھ کر اونچی تعلیم دلوادی اور وہ کسی اونچے عہدے اور مرتبے پر پہونچ گیا تو آپ کو اس سے دنیا و آخرت میں کیا فائدہ

پہونچے گا۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ دنیا میں اس سے راحت ملے گی تو مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ شاید ہزار میں ایک دو بچوں سے والدین کو راحت ملتی ہے، ورنہ وہ نافرمان بن کر والدین کے لیے دنیا میں عذاب ہی بنتے ہیں، اور آخرت کی راحت کا معاملہ یہ ہے کہ ایسے بچے اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ والدین کی نماز جنازہ پڑھ سکیں اور ان کو قبر میں اتار سکیں اور قرآن پڑھ کر ان کو بخش سکیں اور ان کے لیے دو ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کر سکیں

اس لیے میری گذارش ہے کہ آپ اپنے بچوں اور بچیوں کو ابتدائی دینی تعلیم سے محروم کرکے اعلیٰ تعلیم میں نہ ڈالیں۔ اس سے آپ کا ذاتی خسارہ بھی ہے اور ملی خسارہ بھی، بحمد اللہ اد ھر خود مسلمانوں میں اپنے ماحول کے ساتھ نرسری اسکول قائم کرنے کی کچھ تحریک شروع ہوئی ہے جو ہمارے لیے نیک فال ہے، مگر ضروری ہے کہ اس میں بھی ہم اپنے غریب بھائیوں کے بچوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں

پھر تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ تعلیم محض مدرسہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ یہ مدرسہ اور گھر کی مشترکہ ذمہ داری ہے، آپ اپنے بچے کو کتنے ہی اچھے مدرسہ میں داخل کر دیں اور کتنی ہی معیاری تعلیم اسے دے ڈالیں اگر آپ کے گھر اور محلہ اور پاس پڑوس اور مدرسہ کے ماحول میں توافق و مناسبت نہیں ہے تو بچے پر تعلیم کا پورا اثر مرتب نہیں ہو سکتا، مدرسہ میں بچہ ۵۔۶ گھنٹے رہتا ہے، بقیہ اٹھارہ گھنٹے وہ گھر کے اور محلہ پڑوس کے ماحول میں رہتا ہے، اگر گھر اور پڑوس کا ماحول ٹھیک نہیں ہے تو پھر تعلیم کا پورا فائدہ آپ کے بچے کو مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے، قرآن پاک میں قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ (بچاؤ اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے) کا جو حکم ہے وہ اسی مشترکہ ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتا ہے، مدرسہ سے پہلے ان کو دوزخ میں لے جانے والی باتوں سے بچانے کی ذمہ داری آپ کی ہے، مدرسہ کا کام تو ایک خاص عمر کو پہونچ کر شروع ہوتا ہے، مگر گھر کے ماحول میں تو بچہ شروع ہی سے رہتا ہے، اگر ماہرین تعلیم کی یہ رائے صحیح ہے کہ بچے کی پوری تربیت پانچ برس کی عمر تک مکمل ہو جاتی ہے تو آپ غور کریں کہ اس حیثیت سے آپ کی ذمہ داری کتنی بڑھ جاتی ہے، اس لیے آپ سے گذارش ہے کہ آپ اس مشترکہ ذمہ داری کو محسوس کریں، اسی مشترکہ ذمہ داری کی طرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ ہماری توجہ مبذول فرمائی ہے:

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ۔ ہر بچہ فطرت سلیم پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی اور مشرک بنا دیتے ہیں۔

قسط ۲

تفسیر اور اس کے مآخذ

پروفیسر وحید الدین۔ گومل یونیورسٹی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان

تفسیر قرآن کے ماخذ قرآن پاک کی تفسیر کے کل پانچ ماخذ ہیں۔ ۱: خود قرآن حکیم، ۲: احادیث نبویہؐ، ۳: صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ کے اقوال، ۴: لغت عرب، ۵: عقل سلیم و ذوق سلیم۔ ذیل میں ان مباحث پر تھوڑی سی تفصیل پیش خدمت ہے۔

قرآن کریم کی تفسیر کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے۔ اس کی آیات کبھی ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتی ہیں۔ القرآن یفسر بعضہ بعضھا۔

ایک بات آیت میں مبہم ہوتی ہے تو دوسری آیت اس ابہام کو واضح کر دیتی ہے۔ مثال کے لئے ایک آیت درج ذیل ہے:

فتلقیٰ آدم من ربہ کلمٰت فتاب علیہ۔[1]	بعد ازاں حاصل کر لئے آدمؑ نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی۔[2]

اس آیت میں یہ واضح نہیں کہ کلمات کیا تھے۔ ان کلمات کی وضاحت درج ذیل دوسری آیت میں ہے:

قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین۔[3]	وہ دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔[4]

قرآن کریم کا بخوبی مطالعہ کرنے پر ایک قاری اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے کہ اس میں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی، اجمال بھی ہے اور تبیین بھی۔ ایک اعتبار سے مطلق ہے اور دوسری جگہ مقید۔ ایک آیت میں حکم عام ہے

---

[1] القرآن، سورۃ البقرہ (۲) ۳۷۔ [2] تفسیر و تسہیل بیان القرآن، ص م۔ [3] القرآن، سورۃ اعراف (۷) ۲۳۔ [4] تفسیر و تسہیل بیان القرآن، ص ۲۲۹

اور دوسری میں خاص، اس لئے مفسر کے لئے ضروری ہے کہ ایک موضوع کی تمام مکرر آیات کا اچھی طرح مطالعہ کر کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرے کیونکہ قرآن مجید میں ایک ہی مضمون کو مختلف انداز و عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے تفسیر کرتے وقت آیات کے سیاق و سباق کے ساتھ اس مضمون کی دوسری آیات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔ قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولیٰ۔[1]

اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم زمانۂ جاہلیت کے دستور کے موافق مت پھرو۔[2]

بعض افراد کا یہ دعوئے ہے کہ اس آیت میں پردہ کا حکم صرف ازواج مطہرات رضؓ کے لئے ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے سیاق و سباق پر ان کی نظر نہیں ہوئی کیونکہ ازواج مطہرات کو اس خطاب میں پردہ کے علاوہ اس سے پہلے یہ احکام دیئے گئے۔ بولنے میں نزاکت سے کام نہ لو۔ نیک بات کہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اور یہ احکام صرف ازواج مطہرات رضؓ کے لئے نہیں بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے بھی ہیں۔ البتہ ازواج مطہرات رضؓ کو اس خطاب میں خصوصیت صرف اس وجہ سے ہے کہ احکام شرعیہ کی ذمہ داری ان پر زیادہ ہے۔ ان احکام میں سے صرف پردہ کے حکم کو ازواج مطہرات رضؓ کے لئے خاص کرنے کی اب کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہتی۔

اسی طرح ایک بات دوسری قرأت میں واضح ہوجاتی ہے جبکہ پہلی قرأت میں وہ مبہم ہو۔ اس کی مثال قرآن کریم کی آیت فاغسلوا وجوهکم وارجلکم کے متعلق ہے۔ وارجلکم کی قرأت میں سر کی طرح پاؤں کا بھی مسح کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے، اور یہ بات مبہم ہے، مگر دوسری قرأت وارجلکم سے یہ ابہام رفع ہو جاتا ہے اور ہاتھ اور منہ کی طرح پاؤں کا دھونا بھی فرض ہو جاتا ہے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کی پوری تفسیر علامہ ابن جوزیؒ نے لکھی ہے اور علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں اس کا ذکر کیا ہے۔[3] ایک ایسی تفسیر مدینہ طیبہ کے ایک شیخ محمد امین بن محمد مختار شنقیطی نے لکھی ہے جو اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن کے نام سے دارالاصفہانی ۱۳۷۸ھ جدہ میں شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] القرآن سورۂ احزاب ۳۳۔ [2] تفسیر و تسہیل بیان القرآن۔ ص ۶۳۳

[3] الاتقان، ج ۲، نوع ۷۸، ص ۱۷۵

قرآن پاک کی تفسیر کا دوسرا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو

معلم بنا کر بھیجا ہے:

ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ۔[1] اور پیغمبر ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اور حکمت سے مراد سنت رسولؐ ہے۔ قرآن حکیم آپؐ پر ہی نازل ہوا اور آپؐ کو ہی تفسیر کا حق حاصل ہے۔ خود قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم ۔[2] تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان سے ظاہر کردیں اور تاکہ وہ (ان میں) فکر کیا کریں۔[3]

لتبین میں لام غایت کا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر جو قرآن حکیم نازل کیا ہے اس کی غرض و غایت یہی ہے کہ آپؐ اس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ یعنی آپ ہی اس کے شارح، مفسر اور معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن پاک کے الفاظ ہی آپ پر نازل نہیں فرمائے بلکہ اس کے معانی و مطالب کا الہام بھی اپنی ذمہ داری میں لیا۔

ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قرأنٰہ فاتبع قرانہ ثم ان علینا بیانہ [4] اس کا جمع کردینا اور (آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اسکے تابع ہوجایا کیجئے پھر اسکا بیان کروادینا بھی ہمارا ذمہ ہے۔[5]

ہر چیز میں ظاہر کے ساتھ ایک حقیقت ہوا کرتی ہے۔ قرآن حکیم کا بھی ایک ظاہر اور ایک حقیقت ہے۔ حافظ ابن حیانؒ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں:

ان للقرآن ظاھرا وباطنا۔[6] قرآن کے ظاہر معانی بھی ہیں اور علمی نقطے بھی۔

قرآن حکیم کا ظاہر تو الفاظ ہیں اور اس طرح اس کی ایک حقیقت بھی ہے اور وہ ہے الفاظ قرآن سے

---

[1] القرآن۔ سورۃ البقرہ، ۲ : ۱۲۹، [2] القرآن۔ سورۃ النحل، ۱۶ : ۴۴
[3] تفسیر وتسہیل بیان القرآن۔ ص ۴۰۸، [4] القرآن۔ سورۃ القیٰمۃ : ۷۵ : ۱۷
[5] تفسیر وتسہیل بیان القرآن، ۱۸۷، [6] الاتقان۔ ج ۱، ص ۱۴۱

مراد ربانی یعنی آیات ربانی کا منشا ہی قرآن پاک کی حقیقت ہے۔ حضرت مقداد بن سعد یکربؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا انی اوتیت القران ومثلہ معہ یعنی السنۃ۔ [1] — مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس مثل ایک اور چیز بھی یعنی سنّت

آپؐ کا ارشاد کہ مجھے کتاب جیسی ایک اور چیز دی گئی ہے، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مراد ربانی کی ترجمانی کا حق صرف اور صرف آپؐ کو حاصل ہے اور اللہ جل جلالہ نے خود اپنے ارشاد

وماینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحی۔ [2] — اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بنانے والے ہیں ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے[3]

سے اس ترجمانی کا حق صرف نطق محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا ہے۔ حبیبۂ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے:

کان خلقہ القرآن۔ — آپؐ کا اخلاق قرآن تھا۔

اس کا واضح مطلب یہی نکلتا ہے کہ قرآن علم ہے اور صاحب قرآن عمل، قرآن حکم ہے اور صاحب قرآن تعمیل، قرآن اجمال ہے اور صاحب قرآن تفصیل۔

اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قرآن کو صاحب قرآن کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے۔ الغرض جو کچھ تیئیس سال آپؐ پر نازل ہوا وہی آپؐ نے اپنی عملی زندگی میں پیش فرما دیا۔

علمِ حدیث کا جاننا مفسر کے لئے ضروری ہے، غیر محدّث ہرگز مفسر نہیں ہو سکتا اور حدیثِ رسولؐ کو قرآن کی تفسیر کا پورا حق حاصل ہے۔ اس کے بغیر قرآن پاک کی تشریح اور توضیح میں بہت سے شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئینگے جو قرآن مجید کے شبہات کے ساتھ تم سے مجادلہ کرینگے، تم ان پر سنن کے ذریعہ گرفت کرنا کیونکہ اصحاب سنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں۔" [4]

---

[1] الاتقان، ص ۱۷۶، [2] القرآن سورۃ النجم ۵۳: ۴؛ [3] تفسیر و تسہیل بیان القرآن، ص ۷۸۹
[4] (i) موافقات امام شاطبی، ج ۴، ص ۱۷ (ii) علامہ ابن سعد طبقات ابن سعد

علامہ ابن سعد نے طبقات میں بطریق عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا: تم ان کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو مگر دیکھو قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ سنّت سے احتجاج کرنا (حجت لینا) ابن عباسؓ نے فرمایا میں تو ان کے نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں کیونکہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے۔ حضرت علیؓ بولے ہاں تم سچ کہتے ہو لیکن القرآن احمال ذو وجوہٍ "قرآن میں اجمال کی وجہ سے مختلف معنیٰ کی گنجائش نکل سکتی ہے" تم بھی کہتے رہو گے اور وہ بھی کہتے رہیں گے۔ فیصلہ کچھ نہ ہو گا اس لئے سنن سے استدلال کرنا، وہ اس سے بچ کر کہیں نہ جا سکیں گے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے خوارج سے سنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہو گئے ۔ قرآن پاک کی تفسیر میں حدیث پاک کا کس قدر حصہ ہے سیّد محمد یوسف بنوریؒ کے حوالہ سے یہاں اپنے استاذ خاتم المحدثین علامہ سیّد محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا ایک قول نقل کر رہے ہیں:

اگر نورِ بصیرت کے ساتھ احادیث شریفہ پر غور کیا جائے تو نظر آئے گا کہ بہت سی احادیث قرآن کریم کے چشمۂ صافی سے نکلی ہیں یہاں تک کہ بہت سی احادیث شریفہ میں قرآن کریم کی تعبیرات کی طرف لطیف اشارے پائے جاتے ہیں۔ [1]

حضرت مکحول دمشقیؒ فرماتے ہیں:

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن ۔ [2]	قرآن کو جس قدر سنّت کی ضرورت ہے سنّت کو اس حد تک قرآن کی حاجت نہیں۔

حافظ ابو عمر بن عبد البر فرماتے ہیں کہ مکحول کا مقصد ان الفاظ سے یہ ہے کہ کتاب اللہ کے لئے سنت رسولؐ مبین ہے، یعنی اس کی مراد واضح کرتی ہے۔

انما تقتفی علیہ وتبیّن المراد منہ۔ [3]

یعنی قرآن حکیم اپنی تشریحات کے لئے جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کو اپنے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں۔ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطورِ نص مذکور نہیں ہیں۔

---

[1] تتمۃ البیان، ص ۲۸ بحوالہ علامہ بنوری، ٹاؤن: بینات کراچی، ربیع الثانی، فروری ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء

[2] تفسیر القرطبی۔ ج ۱۔ ص ۳۸-۳۹ ۔ [3] جامع البیان العلم، ج ۲، ص ۱۹۱

صحابہ کرام مدرسہ نبوت | قرآن حکیم کی تفسیر کا تیسرا ماخذ صحابہ کرام و تابعین عظام کے اقوال ہیں

کے بلاواسطہ شاگرد ہیں جس کی شہادت قرآن پاک میں ہے ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ "آپؐ ان (صحابہؓ) کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں" بھلا کتاب و حکمت کی اس براہ راست تعلیم میں صحابہؓ کا کوئی ہمسر ہو سکتا ہے اور وہ صحابہ کرامؓ نزول وحی کے عینی شاہد بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ آپؐ کے ہم نشیں اور صحبت یافتہ تھے اور وہ شان نزول اور قرآنی تعلیمات سے بخوبی واقف بھی تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

واللہ ما نزلت اٰیۃ الا وقد علمت فیما انزلت و این انزلت ان ربی وھب لی قلباً عقولاً ولساناً سئولاً ۔[1]	اللہ کی قسم جو بھی آیت نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ میرے رب نے مجھے بہت سمجھنے والا دل اور بہت پوچھنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے۔ آپؓ نے منبر پر فرمایا:

سلونی فواللہ لا تسئلون عن شیئ الا اخبرتکم وسلونی عن کتاب اللہ فواللہ ما من اٰیہ الا وانا اعلم أبلیل نزلت ام بنھار ام فی سھل ام فی جبل۔[2]	مجھ سے سوال کرو، اللہ کی قسم مجھ سے جو سوال کرو گے اس کا جواب دوں گا، اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو پس اللہ کی قسم قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے یہ علم نہ ہو کہ وہ رات کے وقت اتری تھی یا دن کے وقت، میدان میں اتری تھی یا پہاڑ پر۔

اسی طرح فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

والذی لا الٰہ غیرہ ما نزلت اٰیۃ من کتاب اللہ الا انا اعلم فیمن نزلت و این نزلت ولو اعلم مکان احدٍ اعلم بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا لأتیتہ۔[3]	اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی جو بھی آیت نازل ہوئی اور اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی شخص کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس تک پہنچنا ممکن ہو تو میں ضرور اسکی خدمت میں حاضر ہوتا۔

---

[1] الاتقان نوع ۸۰، ص ۱۸۷، [2] ایضاً، ص ۱۸۸، [3] ایضاً، ص ۱۸۷، مزید تائید کی حوالہ ابن کثیر، ج ۱، ص ۳

الغرض تفسیر نبویؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کی تفسیر سب سے مقدم ہے اور حقیقت میں وہ بھی آنحضرتؐ کی تعلیم کا نتیجہ ہے اس لئے ایسی کوئی تفسیر قابل قبول نہ ہوگی جو اقوالِ صحابہؓ سے ہٹ کر ہو۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما	اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ
تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر	اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر
سبیل المؤمنین نولہ ماتولیٰ	دوسرے راستہ پر ہو لیا، تو ہم اسکو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دینگے
ونصلہ جھنم وساءت مصیرا[۱]	اور اس کو جہنم میں داخل کرینگے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی[۲]

ومن یشاقق الرسول کے ذکر کے بعد ویتبع غیر سبیل المومنین آیا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ اتباع رسولؐ کے علاوہ مومنین کا راستہ چھوڑ دینا بھی جہنم میں جانے کا سبب بن سکتا ہے اور یہاں سبیل سے مراد اجماعِ صحابہؓ ہے۔

صحابہ کرامؓ اہل زبان بھی تھے مگر پھر بھی اپنی زبان دانی پر بھروسہ کرنے کے بجائے انھوں نے قرآن حکیم کو سبقاً سبقاً آپؐ سے پڑھا اور نہایت محبت اور جانفشانی سے فہم القرآن میں مہارت حاصل کی۔ اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کے عجیب وغریب واقعات ہیں۔ یہاں ایک مشہور تابعی عالم حضرت ابو عبدالرحمن السلمیؒ کا ایک فقرہ نقل کر دینا کافی ہوگا۔

حدثنا الذین کانو یقرون القراٰن	صحابہ کرام میں سے جو حضرات قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے
کعثمان بن عفان و عبد اللہ بن	مثلاً حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
مسعود وغیرھم انھم کانو اذا	وغیرہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آپؐ سے دس آیتیں
تعلموا من النبی عشر اٰیات لم	سیکھتے تو ان سے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے جب تک
یتجاوزوھا حتی یعلموا مافیھا	کہ ان آیتوں کی تمام علمی اور عملی باتیں حاصل نہ کرلیں۔
من العلم والعمل۔[۳]	

اور موطا امام مالک میں ہے:

قام ابن عمر علی حفظ البقرۃ ثمان سنین[۴]	حضرت عبداللہ بن عمرؓ آٹھ سال تک صرف سورہ بقرہ یاد کرتے رہے تھے

---

[۱] قرآن، سورۃ النساء ۴:۱۱۵۔ [۲] تفسیر و تسہیل بیان القرآن، ص ۱۴۶۔ [۳] الاتقان ج ۲، نوع ۷۸، ص ۱۷۶۔
[۴] ایضاً

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شرح مسوّیٰ میں لکھا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ قرآن حکیم میں تبحر حاصل کریں، اسباب نزول اور احکام میں نئے نئے استخراج کریں۔

مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

كان الرجل اذ قرء البقرة و آل عمران جد فى اعيننا۔ — جب کوئی شخص سورہ بقرۃ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت قابل احترام ہو جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس سے مراد ظاہری اخذ و حفظ نہیں بلکہ قرآن پاک کے علوم و معارف کی تعلیم تھی۔ قرآن حکیم کے مقاصد صرف ظاہری تعبیر میں واضح ہوتے تو وہ صحابہ جو اہل زبان تھے بہت جلد ہی سمجھ لیتے وہ قرآن پاک کی صرف ایک سورۃ سیکھنے پر اتنی مدت صرف نہ کرتے۔ مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

كان الرجل اذا قرء البقرة و آل عمران جد فى اعيننا۔[1] — جب کوئی شخص سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں وہ بہت قابل احترام ہو جاتا تھا۔

آنحضرتؐ کی تفسیر کے بعد صحابہ کرام کی تفسیر کو اولیت حاصل ہے اور حقیقت میں یہ تفسیر بھی آنحضرتؐ کی تعلیم کا ثمرہ ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ کا درجہ ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے صحابہ کرامؓ سے علوم کے وہ فیض پائے جو انھوں نے آپؐ سے براہ راست حاصل کئے۔ تابعی کبیر مفسر جلیل حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

عرضت القرآن على ابن عباس ثلثين مرة۔[2] — میں نے اپنے استاذ حضرت ابن عباسؓ سے تیس مرتبہ قرآن پڑھا۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

تابعین میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے پوری تفسیر صحابہؓ سے حاصل کی۔ مجاہد کہتے ہیں میں نے مصحف قرآنی حضرت ابن عباسؓ کے سامنے پیش کر دیا۔ ہر آیت پر انھیں ٹھہراتا اور مطلب سمجھتا تھا۔[3]

الغرض تابعین نے تفسیر کا علم بھی اسی طرح صحابہؓ سے حاصل کیا ہے جس طرح علم سنت ان سے پایا تھا۔

---

[1] الاتقان، ج ۲، نوع ۷۸، ص ۱۷۶۔ [2] الاتقان، وکذا فی تہذیب ج ۱۰، ص ۴۲۔ [3] ابن تیمیہ، اصول التفسیر مترجم مطبوعہ لاہور، ص ۲۰

تفسیر کا چوتھا ماخذ علمِ لغتِ عرب ہے

علمِ لغت کی رو سے معلوم کیا جاتا ہے کہ فلاں مفرد لفظ کو کس معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی تفسیر کے لئے علوم عربیہ سے واقفیت لازمی ہے اور خود قرآن حکیم کی زبان یہی ہے: بلسانٍ عربیٍ مبینٍ[1]

دوسری جگہ ذکر ہے: انّا انزلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون[2]

اس سے ثابت ہوا کہ علوم عربیہ سے ناواقف قرآن حکیم کی تفسیر نہیں کر سکتا ہے۔ ایک شخص اردو نہیں جانتا وہ دیوان غالب کی شرح کیونکر لکھ سکتا ہے۔ علوم عربیہ میں مندرجہ ذیل پندرہ علوم شامل ہیں:[3]

علم لغت[1]، علم صرف[2]، علم نحو[3]، علم اشتقاق[4]، علم معانی[5]، علم بیان[6]، علم بدیع[7]، علم قرأت[8]، علم اصول دین[9]، علم اصول فقہ[10]، علم اسباب نزول[11]، علم ناسخ ومنسوخ[12]، علم فقہ[13]، علم حدیث[14]، نور بصیرت[15] اور وہبی علم۔

مگر ہر زبان کی لغت کا اپنا ایک عرف ہوتا ہے مثلاً اردو میں ایک محاورہ ہے "کریلا اور نیم چڑھا" تو یہاں لغوی مفہوم کے بجائے عرفی مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ کسی برائی کے بیان کے موقع پر جب مبالغہ مقصود ہو تو اہلِ زبان اس محاورہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم میں لغت عربی کے علاوہ اس کا اپنا ایک خاص عرف ہے۔

صلوٰۃ اور حج کا لغوی مفہوم دعا مانگنا اور ارادہ کرنا ہے مگر صرف دعا مانگنے سے نہ نماز ادا ہوتی ہے اور نہ محض ارادہ کرنے سے حج ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہاں صلوٰۃ اور حج کے الفاظ عربی زبان سے ضرور لئے مگر اس میں مفہوم اپنا رکھا جو ارکانِ مخصوصہ اور مناسک حج کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ یہاں سے معلوم ہو کہ صرف عربی زبان و ادب پر عبور کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سلسلے میں الفاظ مفردہ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے حقائق کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

ہر زبان کی لغت میں اپنے محاورے ہوتے ہیں اور ان محاوروں کا مفہوم اپنے طور پر الگ الگ ہوتا ہے۔

---

1. القرآن، سورۃ الشعراء ۲۶: ۱۹۵، 2. سورۃ یوسف ۱۲: ۲، 3. الاتقان، نوع ۷۸

قرآن حکیم میں ذکر ہے:

واضرب بعصاك الحجر۔ [1] اور اپنی لاٹھی کو پتھر پہ مارو۔ [2]

اہل زبان بجا طور پر اس زبان کا مفہوم یہی سمجھتے ہیں۔ احادیث سے بھی اس مفہوم کو تائید حاصل ہے مگر سرسید احمد خاں نے لغت کے دور دراز حوالوں کی بنیاد پر ایک اور مفہوم نکالا اور آیت کریمہ کے اس عربی محاورے واضرب بعصاك الحجر کا ترجمہ یہ کیا " اور لاٹھی کے سہارے اس چٹان پر چلو"[3] حالانکہ ضرب کے ساتھ فی کا استعمال ہو تو عربی لغت میں چلنے کا مفہوم ہوتا ہے اور و اذا ضربتم فی الارض[4] کا یہی معنی ہے۔

مگر یہاں ضرب کے ساتھ فی کے بجائے با کا استعمال ہوا ہے جس کا مطلب چلنا نہیں مارنا مراد ہے۔ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد کافی نہیں کہ کوئی شخص عربی سے اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ صرف اس قدر استعداد سے قرآن مجید کا اجمالی مفہوم تو سمجھا جا سکتا ہے مگر وہ بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہ ہو سکے گا، اور یہ صرف عربی زبان کی خصوصیت ہی نہیں بلکہ ہر زبان میں یہی اصول کارفرما ہے۔ امام بیہقیؒ بیان کرتے ہیں:

" امام مالکؒ فرماتے تھے کہ" اگر میرے پاس کوئی شخص ایسا لایا جاوے جو عربی زبان سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود کلام اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اس شخص کو سزا دوں گا"[5]

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ میں کوئی لفظ سمجھ میں نہ آئے تو اس کو اشعار عرب میں تلاش کرو"۔ حدیث مبارک میں ذکر ہے:

اعربوا القرآن والتمسوا غرائبه۔[6] قرآن کے معنی اچھی طرح سمجھو اور اس کے غرائب کی تحقیق کرو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا ذوق عربیت انتہائے کمال پر تھا۔ یہاں اعراب سے مراد نحویوں کی اصطلاح نہیں۔ مطلق ادراک معانی مقصود ہے۔

---

[1] ان اضرب بعصاك الحجر۔ سورۂ اعراف، ۷: ۱۶۰، [2] تفسیر و تسہیل بیان القرآن،

[3] سرسید احمد خان، تفسیر القرآن العظیم، ج ۱، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱ ، [4] سورۂ بقرہ، ۲: ۲۷۳

[5] مرتضیٰ زبیدی، شرح احیاء العلوم ج ۴، ص ۵۲۹، [6] الاتقان، ص ۱۷۵

کسی بھی زبان کے اصوات و لہجات اپنے طور پر اہم ہوا کرتے ہیں اور اس طرح عربی زبان کے لب و لہجہ کو بھی فہم قرآن کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مثلاً سورۃ نمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں اولا اذبحنّہ آیا ہے۔ جو شخص قراٴت سے واقف نہ ہوگا وہ فقرہ کا ترجمہ نفی میں کرے گا۔ یعنی "میں اس (ہُدہُد) کو ذبح نہیں کروں گا" مگر قراٴت سے واقف شخص فوراً سمجھ جائے گا کہ دراصل یہ لا، لائے نافیہ نہیں بلکہ لام کے فتحہ کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے صورت لا کی ہوگئی ہے اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ "لا" کے ساتھ قرآن میں کتابت ہوئی ہے۔

تاہم لغت کی اس قدر اہمیت کے باوجود یہ کوئی مستقل ماخذ تفسیر نہیں۔ جس جگہ قرآن و سنت یا آثار صحابہؓ سے قرآن پاک کے کسی لفظ کی تفسیر موجود نہ ہو وہاں آیت کی ایسی تفسیر کی جائے گی جو اہل عرب کے محاورات کے مطابق ہو اور ہر مقام پر صرف لغت کی بنیاد پر ان میں سے کوئی مفہوم متعین کرنا مغالطوں کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لئے امام محمدؒ محض لغت کے ذریعہ قرآن کریم کی تفسیر کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ ●● (باقی آئندہ)

بقیہ: الرشاد کی ڈاک:-

ہم مسلمانوں کیلئے اپنے رسول کی حیات و خدمات سے واقف ہونا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا امام خمینی، ابن تیمیہ، احمد شہید، احمد رضا خاں، اشرف علی تھانوی وغیرہ سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ اور جماعت اپنے نشان فخر و امتیاز کے قیام و بقا کی فکر میں شب و روز مصروف ہے اور اسی کو عین مقصود دین و ایمان ثابت کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ کیا اس وقت پورے ملک میں کوئی ایسا فرد یا جماعت ہے جو اللہ رب العلمین کے دین کو خلوص ارادہ و نیت کے ساتھ اپنے فکر و عمل کی اساس قرار دیتا ہو اور فرقہ ہائے مختلفہ کے نشانہائے امتیاز سے اظہار بیزاری و برات کرتا ہو۔ اگر آپ کے علم میں ایسے افراد یا جماعت کا وجود ہو تو اس کی نشاندہی فرمائیں۔ مجھے ایسے خالص مومن و مسلم افراد و جماعت کی تلاش ہے۔ کیا آپ میری مدد فرمائیں گے؟ میں خود کو صرف مومن و مسلم سمجھتا ہوں اور اسی نام سے جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔ میں نہ سید ہوں نہ سُنی، نہ حنفی ہوں نہ شافعی، نہ مالکی ہوں نہ حنبلی، نہ دیوبندی ہوں نہ بریلوی، اور نہ ہی کسی بھی فرقہ اور جماعت سے کوئی تعلق رکھتا ہوں اسیئے بالکل تنہا ہوں، مجھے اپنے جیسے چند ساتھیوں کی تلاش ہے اس لئے یہ اشتہار پیش خدمت ہے۔

والسلام۔ نجم الدین انصاری، ٹیچرس فلیٹ ۱۱، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس

پہلی قسط

فتنۂ وضع حدیث اور اسکے اسباب و محرکات

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری . ترجمہ: از: مولانا وزیر احمد ندوی استاذ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے " الحدیث ھو ما أثر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول أو فعل او تقریر او صفۃ خلقیۃ او خلقیۃ او سیرۃ سواء کان قبل البعثۃ أو بعدھا[1]" یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل یا کسی کے قول و فعل پر آپ کا سکوت آپ کے جسمانی و روحانی اوصاف آپ کی سیرت و سوانح سے متعلق جو کچھ بھی منقول و ماثور ہے وہ سب کچھ اصطلاحاً حدیث ہے اور اس کا اطلاق قبل بعثت و بعد بعثت کی دونوں زندگیوں کے لئے یکساں طور پر ہوگا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں حدیث کے مقام اور اس کی اہمیت کے پیش نظر صحابہ، تابعین اور پھر علمائے اسلام نے عہد بہ عہد اس کی حفاظت و صیانت اور اس کی نقل و روایت پر غیر معمولی توجہ دی ہے۔ مسلمانوں کی عملی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی زندگی کے احوال و کوائف شخصیت کے خد و خال اور سیرت و اخلاق کی تفصیلات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ مسلمانوں کو انفرادی و اجتماعی پبلک و پرائیویٹ زندگی کے تمام پہلوؤں میں آپ ہی کی اتباع و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے قرآن کریم کی یہ آیتیں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں " لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ[2] " " وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا[3] "[4]

قرآن کریم کے بعد حدیث ہی شریعت اسلامی[5] کا دوسرا مآخذ و مصدر ہے[6]، حدیث پاک ہی

---

[1] السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی للدکتور مصطفی السباعی ص ۵۹ [2] سورۃ الاحزاب آیت ۲۱ [3] سورۃ الحشر آیت ۔ [4] اسلام میں دین کا مفہوم بہت جامع اور وسیع ہے اسمیں عقائد، اخلاق، عبادات اور معاملات سب داخل ہیں اسکے برخلاف دین کا مغربی تصور جسے RELIGION سے تعبیر کیا جاتا ہے نہایت

باقی اگلے صفحہ پر

سے قرآن مجید کے اجمال کی تفصیل، اطلاق کی تقیید اور عموم کی تخصیص ہوتی ہے و نیز حدیث ہی سے ایسے احکام و مسائل بھی مستنبط و متعین ہوتے ہیں جنکے متعلق قرآن میں خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس بنا پر حدیث نبوی کے مقام و مرتبہ کے فہم و ادراک کے بغیر اسلام کا صحیح اور جامع تصور ممکن نہیں ہے۔ حدیث کی اسی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور پھر وفات کے بعد حدیث کی تحفیظ و تدوین اور اس کی تفہیم و تبلیغ میں غیر معمولی دلچسپی لی اور یہ شغف و دلچسپی بعد کی نسلوں میں بھی نہ صرف باقی رہا بلکہ بڑھتا گیا۔

وضع حدیث (حدیثیں گڑھنا) کا فتنہ دراصل اس لئے شروع ہوا کہ بعض گروہوں نے اپنے ذاتی و سیاسی اور ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لئے حدیث کو ذریعہ بنانے کی کوشش کی، سنت رسول ؐ سے مسلمانوں کی شیفتگی و وابستگی کو دیکھتے ہوئے ان کا نفسیاتی استحصال ہمیشہ سے اہل نفاق اور اہل سیاست کا معمول رہا ہے، اس طرح حدیث میں وضع و تحریف کی وہ تحریک شروع ہوئی جس نے دین و شریعت کے اس ماخذ کو بہت کچھ مجروح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک مثبت و مفید اثر یہ ہوا کہ اس صورت حال کے پیش نظر علما و محدثین نے سنت رسول کی تحقیق و تلاش اور علوم حدیث کی تدوین و ترتیب کی طرف خصوصی توجہ دی اور اس کی چھان بین میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور انھوں نے حدیث کے ساتھ کھلواڑ کرنے، اس کی حجیت سے انکار کرنے یا مقام و مرتبہ کو گھٹانے والی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں کسی حد تک[۱] اور دوسری صدی ہجری کے وسط میں وسیع پیمانہ پر علمائے دین حدیث کی تدوین میں منہمک و مشغول ہو گئے اور پھر اس کوشش کے نتیجہ میں

ہی ناقص اور محدود ہے یعنی وہ انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے [۵] ڈاکٹر رابسن کا خیال ہے کہ حدیث کو ماخذ شریعت بہت بعد میں مانا گیا ہے، لیکن ان کا خیال سرتاسر لغو اور باطل ہے، قرآن مجید نے خود ہی حدیث شریف کی تشریعی حیثیت اور مرتبہ کا تعین کر دیا ہے یہ آیتیں اسکے لئے واضح ثبوت ہیں من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ۔ سورۃ النسا آیت ۸۰ ، "وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس" ڈاکٹر رابسن کے خیال کو جاننے کیلئے ملاحظہ ہو۔ THE ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL II 1956.

[۱] پہلی صدی ہجری کے مرتب کردہ بہت مجموعے اب چھپکر سامنے آچکے ہیں، پہلی صدی ہجری میں وضع حدیث نے عمومی فتنہ کی صورت اختیار نہیں کی تھی، پھر صحابۂ کرام بھی موجود تھے، اسلئے کسی کو حدیث نبوی میں خلط ملط کی جرأت نہیں ہوتی تھی، اور اگر کسی نے ایسی ناپاک جرأت کی تو اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا لہذا اس صدی میں تدوین [illegible]

حدیث کی تحقیق وتنقید کے ابتدائی اصول وضوابط سامنے آئے، بعد ازاں مرورزمانہ کے ساتھ یہ اصول وقواعد حدیث کی اصطلاحی کتابوں میں منظم ومرتب شکل میں ظاہر ہوئے، ساتھ ہی ساتھ اس طرح فن رجال بھی ترتیب پا گیا اور رواۃ حدیث کی بابت مختلف اقوال وآراء کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا۔

لیکن حدیث کی تحقیق وتلاش اور علوم حدیث کی تدوین وترتیب کے مختلف ادوار میں شانہ بشانہ وضع وتحریف حدیث کا سلسلہ بھی مفسدین نے جاری رکھا، اس لئے وضع حدیث اور اس کے اسباب ومحرکات کا ایک تحقیقی وتاریخی جائزہ لینا ضروری ہے۔ سطور ذیل میں اسی ضرورت کے پیش نظر ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ حدیثیں گڑھی جائیں گی، اس لئے آپ نے اس سے ڈرایا اور اپنے اصحاب کو احادیث کے قبول کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی، اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ آپ نے اسے ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں فرمایا تھا[۱] بلکہ یہ آپ کی ایک معجزانہ پیش گوئی تھی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اسلام سے والہانہ لگاؤ اور اسلام کی نشر واشاعت کی راہ میں جان ومال اور اولاد کی بے دریغ قربانیاں، ان کے اخلاص، پاکیزگی، سچائی اور عدل وانصاف کا روشن ثبوت ہیں۔ حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں بیان کرتے ہیں ان میں سے کچھ تو ہم نے بذات خود اللہ کے رسولؐ سے سنی ہیں، اور کچھ ان کے اصحاب سے اور ہم جھوٹ نہیں نقل کرتے[۲] حضرت انسؓ نے ایک مرتبہ ایک حدیث بیان کی تو ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حدیث اللہ کے رسولؐ سے سنی ہے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا جی ہاں! مجھ سے اس شخص نے حدیث بیان کی جو جھوٹ نہیں بولتا بخدا نہ ہم جھوٹ بولتے ہیں اور نہ جانتے ہیں کہ جھوٹ کیا ہے[۳] حضرت انسؓ سے جب کسی حدیث کے بارے میں پوچھا جاتا کیا آپ نے یہ حدیث سنی ہے؟ تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے کہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولتا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے، ہم اللہ کے رسولؐ کی حدیثیں اس وقت تک بیان کرتے رہے جب تک

---

[۱] السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی ۲۱۶، ۲۱۷ اور ڈاکٹر مصطفیٰ اسباعی [۲] الکامل لابن عدی ۱/۵۰ ب
[۳] ایضاً ص ۱/۵۱ ب [۴] ایضاً ۱/۵۱۔۱

روایت میں جھوٹ کا سہارا نہ لیا جاتا تھا جب لوگوں نے جھوٹ و سچ کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے حدیث کی عام روایت چھوڑ دی اور انتہائی احتیاط کا راستہ اختیار کیا۔[1]

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت تک وضع حدیث کی کوئی دلیل نہیں ملتی ایسا لگتا ہے کہ اس عرصہ میں کبار صحابہ کرام کے وجود اور امت اسلامیہ کے اتحاد و یکجہتی نے وضع حدیث کو روکے رکھا، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے دور خلافت میں واقعہ ارتداد کی بنا پر وضع حدیث کا تھوڑا سا موقع فراہم ہوا مگر اس عرصہ میں بھی حدیثوں کے وضع اور موضوع احادیث کے رواج کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بعض مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی جانب سے وضع حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی مسلمانوں کے درمیان موضوع احادیث کے رواج کے عدم امکان کی بنا پر معاشرہ پر ان موضوع حدیثوں کا کوئی اثر نہیں تھا، پھر واقعۂ ارتداد پر اتنا عرصہ بھی نہیں گذرا کہ اس میں ملوث افراد اسلامی شیرازہ کو منتشر کرنے کی طرف خاص توجہ کرتے پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بہت جلد اس واقعہ میں ملوث افراد کا قلعہ قمع کر دیا جس کی وجہ سے امت اسلامیہ کا اتحاد پھر مضبوط اور طاقتور ہو گیا۔

وضع حدیث اور سیاسی اختلافات

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دنوں میں اختلاف و افتراق کا ایک بڑا فتنہ رونما ہوا، کچھ لوگ حضرت عثمانؓ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کر دیا جو بالآخر حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ہی ختم ہوا۔ اسلامی معاشرہ میں اگرچہ اس کشیدگی اور چپقلش کا اثر یوں برقرار رہا کہ بہتوں کے دلوں میں صفائی اور نیک نیتی کی جگہ کینہ و حسد پروان چڑھنے لگے لیکن اس کے باوجود آنجنابؓ کے دور خلافت میں ایسے ثبوت نہیں ملتے جو وضع حدیث کے غماز ہوں، ابو ثور الفہمی نے جو روایت نقل کی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "میں حضرت عثمانؓ کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ ابن عدیس[2] منبر پر چڑھا ہے اور کہہ رہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ سنو!

---

[1] الجامع الصحیح امام مسلم ۱/۱۲-۱۳، سنن الدارمی ۱/۱۱۳ مقصد یہ ہے کہ غیر ذمہ دار لوگ اسمیں نہ جانے کیا کیا باتیں ہماری طرف منسوب کر دی۔ [2] ابن عدیس کا پورا نام عبدالرحمٰن بن عدیس ہے حضرت عثمانؓ کے قتل میں یہ شریک تھا۔ تاریخ طبری ۲۰۹/۴

حضرت عثمانؓ اس عورت سے کہیں زیادہ گمراہ ہیں جو اپنے شوہر پر دوسرے کو ترجیح دے[1]۔ ابوثور کہتے ہیں کہ میں یہ سنکر حضرت عثمان کے پاس گیا اور ان کو واقعہ سنایا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا خدا کی قسم ابن عدیس جھوٹا ہے نہ تو اس نے اس روایت کو عبداللہ بن مسعودؓ سے سنا ہے اور نہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کو اللہ کے رسولؐ سے سنا ہے[2]۔

ابوثور الفہمی کی یہ روایت اسناد کی حیثیت سے صحیح نہیں ہے اس کی سند میں انقطاع ہے مزید براں یہ روایت ابن لہیعہ کے طریق سے ہے اور ابن لہیعہ تشیع اور حضرت عثمانؓ کی بجا برائیاں بیان کرتے ہیں ایک بدنام شخصیت ہے۔ ابن لہیعہ ان روایتوں کو ذکر کرتا ہے جو اس کی خواہش کے مطابق ہوں، اس لئے اس کی یہ روایت نا قابل قبول ہے، اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وضع حدیث میں کثرت اسوقت پیدا ہوئی جب مسلمانوں کے درمیان جنگ جمل وصفین اور واقعہ نہروان جیسے سیاسی فتنوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور سیاسی پارٹیاں وجود میں آنے لگیں، جیسے شیعہ اور خوارج، ان سیاسی پارٹیوں کو اپنے مسلک و منشا کی تائید میں قرآن وحدیث کے نصوص تو نہ مل سکے کیونکہ قرآن مجید کی تدوین اور سینوں میں اس کے محفوظ ہونے کی بنا پر قرآن میں تحریف کے تعلق سے انھیں بڑی مایوسی ہوئی لیکن چونکہ حدیث نبوی کی تدوین ابھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اسمیں انھیں تحریف، کذب اور وضع کا موقع مل گیا۔ یہیں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ پہلی صدی کے علماء کے درمیان حدیث کی تدوین وکتابت کے بارے میں اختلاف رائے تھا بعض علماء کا خیال تھا کہ حدیث کو ضبط تحریر میں نہ لایا جائے بلکہ اس کی زبانی یادداشت اور بحث و مذاکرہ پر ہی اکتفا کیا جائے، جبکہ بعض حضرات کتابت حدیث کے قائل تھے[3] یہی وجہ تھی کہ خلفائے راشدین کے عہد کے اختتام تک حدیث کا مدون ذخیرہ غیر مدون ذخیرہ سے بہت کم تھا جس کے سبب خود غرض اور نفس پرست اپنی نفسانی وسیاسی غرض پوری کرنے میں مصروف ہو گئے، موضوع احادیث اور ضعیف راویوں کے متعلق لکھی گئی کتابوں میں حدیث گڑھنے والوں کے مندرج اسماء سے پتہ چلتا ہے

---

[1] اس طرح کی تمثیل میری نظروں سے نہیں گزری ہے میں نے میدانی کی مجمع الامثال، ابو عبید بکری کی فصل المقال اور زمخشری کی مستقصی کھنگال ڈالی لیکن اسطرح کی تمثیل نظر نہیں آئی [2] اللآلی المصنوعۃ للسیوطی ۱/۱۳۱۸ ابن سیوطی کہتے ہیں یہ ابن عدیس کا جھوٹ ہے۔ [3] ملاحظہ ہو (SEZGİN : BUHARİNİN KAYNAKLARİ .P. 3.5)
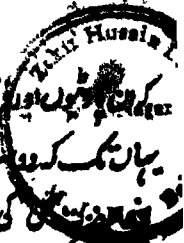
کیونکہ پارٹیوں اور فرقوں کے وجود کے پہلو بہ پہلو موضوع احادیث کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ دوسری و تیسری صدی ہجری تک یہ موضوع احادیث مقام عروج پر پہنچ گئیں، بعض شیعوں نے حضرت علیؓ کی فضیلت اور حضرت معاویہؓ کی طعن و تشنیع میں حدیثیں وضع کیں[1] تو اس کے ردعمل میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ و معاویہؓ کے فضائل و مناقب میں بھی احادیث وضع کی گئیں تاکہ ان کی تنقیص کرنے والوں کی تردید کی جاسکے[2]۔ اسی طرح جب صحابہ کرام پر سب و شتم کا منحوس سلسلہ شروع ہوا تو صحابہ کی فضیلت و اہمیت کے بیان میں موضوع حدیثیں معرض وجود میں آنے لگیں[3]۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حدیثیں اس وقت کے متحارب گروہوں اور جماعتوں کے درمیان موجودہ فکری اور سیاسی کشمکش کی تصویرکشی کرتی ہیں۔ موضوع احادیث کا اکثر و بیشتر حصہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کا پیداوار ہے لیکن عام طور پر یہ احادیث پہلی صدی کے اوائل میں پیش آنے والے واقعات اور موضوعات پر مشتمل ہیں[4]۔ متحارب فرقوں اور برسرپیکار گروہوں کے درمیان بحث و مباحثہ نے بھی بعض افراد کو وضع حدیث پر اکسایا، "مسئلہ خلافت" کی بابت بہت سی حدیثیں گڑھی گئیں[5]، شیعوں نے اور ان کے مخالفین نے بھی اپنے اپنے مسلک کی تائید میں حدیثیں گڑھیں و نیز سب صیہوں کے مفاد کے تحفظ و بقا کے لئے بھی ایسا کیا گیا۔ اسی طرح علویوں کے دلوں میں خلافت سے مایوسی اور کنارہ کشی کی نفسیات پیدا کرنے کے لئے موضوع احادیث کا سہارا لیا گیا[6]۔ خاص طور پر شیعوں نے بے شمار حدیثیں گڑھیں، اسی لئے امام ابوحنیفہ[7]، عبداللہ بن مبارک[8]، امام مالک[9]، شریک بن عبداللہ[10]، یزید بن ہارون[11] اور امام شافعی[12] جیسے جلیل القدر علماء نے شیعوں سے محتاط رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

---

[1] المنتقی من منہاج الاعتدال ابن تیمیہ ص ۳۱۳، اللآلی المصنوعۃ ۱/۳۲۳ للسیوطی۔

[2] اللآلی المصنوعۃ ۱/۲۸۶، ۳۱۵، ۳۱۰، تنزیہ الشریعۃ ۱/۳۷۱، ۲/۳

[3] اللآلی المصنوعۃ للسیوطی ۱/۲۸۶ [4] تنزیہ الشریعۃ لابن عراق ۱/۲۲۴ [5] المنتقی لابن تیمیہ ۳۰۷

[6] تنزیہ الشریعۃ ۲/۱۷، ۱۸، تاریخ بغداد للخطیب ۶/۲۴ [7] الکفایۃ للخطیب ۱۲۶ [8] المنتقی ۴۸۰

[9] ایضاً ۲۱ [10] میزان الاعتدال للذہبی [11] الکفایۃ ۱۲۶ [12] ایضا

انشاء: مجیب اللہ ندوی

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ
اور
اُن کا ترجمۂ شمائل ترمذی

سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ دعوت وجہاد کے فیض سے چند برسوں کے اندر کتاب و سنت کے احیاء و اتباع کا جتنا رواج اور چرچا ہندوستان وپاکستان کے گوشہ گوشہ میں ہوا اتنا چرچا اس سے پہلے کئی صدیوں میں نہیں ہوا تھا۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ آج یہاں قال اللہ وقال الرسول کی جو آواز بھی سنائی دیتی ہے، اگر تاریخی سراغ لگایا جائے اس کا سررشتہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی خانوادۂ مجددیہ یا خانوادۂ ولی اللّٰہی یا سید صاحب کے سلسلۂ طلائے ناب سے ضرور مل جائے گا۔ سید صاحب کی تحریک دعوت وجہاد کا غلغلہ گو چند برسوں رہا اور وہ آپ کی اور حضرت اسمٰعیل شہید اور آپ کے دوسرے رفقاء (رحمہم اللہ اجمعین) کی شہادت کے بعد مدھم پڑ گیا مگر دلوں اور دماغوں میں اس نے جو نقوش چھوڑے تھے وہ آج بھی جریدۂ عالم پر ثبت ہیں اور اس تحریک کے ذریعہ ایمان ویقین، علم وعمل، اتباع سنت اور احیائے دین کے جو چشمہائے فیض ڈیڑھ پونے دو سو برس پہلے جاری ہوئے تھے ان کے سوتے آج بھی خشک نہیں ہوئے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک اسی آب وتاب کے ساتھ وہ رواں دواں رہیں گے۔

ان چشمہائے یمن وسعادت کے سوتے جن بزرگوں کے فیض نظر اور بے پناہ جد وجہد سے خشک نہیں ہونے پائے ان میں ایک مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ مولانا جونپوری بھی جہاد میں جانے کے لئے آمادہ تھے مگر سید صاحب نے انھیں روک کر بنگال میں دعوت وتبلیغ کے کام پر مقرر فرمایا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ حضرت سید صاحب نے ان کو مسندِ خلافت بھی دی تھی جو آج بھی ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ازراہِ عنایت مولانا ظفر صاحب مدظلہ نے اس کی نقل بھیج دی ہے جو اس مضمون کے آخر میں شامل ہے۔

مولانا جونپوریؒ نے جو دینی وعلمی یادگاریں چھوڑی ہیں ان میں ایک شمائل ترمذی کا ترجمہ بھی ہے۔ یہ ترجمہ نہ صرف دینی نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ اردو نثر کی تاریخ میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہونا چاہئے تھا۔ مگر اردو ادب کی تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے کہ اس کی تاریخ لکھنے والوں نے چند شعر موزوں کرنے والوں اور چند مضامین لکھنے والوں کو تو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام دیا ہے مگر بے شمار علماء وصوفیا اور خاص طور پر سید صاحب کے سلسلہ کی اردو کی خدمات کو نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج سے لے کر دلی کالج کے قیام بلکہ غالبؔ کے عہد تک اردو ادب کا جتنا ذخیرہ ان اداروں اور بیسیوں مصنفین نے مل کر فراہم کیا اس سے کئی گنا زیادہ اردو نثر کا ذخیرہ سید صاحب کے سلسلہ کے دو چار بزرگوں مثلاً مولانا اسمٰعیل شہید، خرم علی بلوری، مولانا سخاوت علی جونپوری اور مولانا کرامت علی جونپوری نے فراہم کیا۔ اول الذکر مصنفین کی کتابیں اگر ہزار دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوئیں تو ان علماء کی اردو کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور بکیں، پہلے گروہ نے اگر اردو کی آواز کچھ خواص تک پہنچائی تو ان بوریا نشینوں نے اسکی آواز سے ہندوستان کے بچّے بچّے کے کان کو آشنا کر دیا۔

اس دعوت کا ایک یہ بھی فیض تھا کہ اس تحریک کے نتیجہ میں عیسائیوں، آریوں، سکھوں، اہل بدعت اور دوسرے بہت سے گروہوں نے اپنے عقائد کی تبلیغ اور عوام کے ولولۂ جہاد اور جذبۂ دعوت و اصلاح کو سرد کرنے کے لئے موافقت ومخالفت میں بے شمار کتابیں لکھیں اور سب نے اردو ہی کو اپنا ذریعۂ تحریر وتقریر بنایا۔ اس طرح ہزاروں رسالوں، کتابوں اور مضامین کا انبار لگ گیا مگر تاریخ ادب اردو کے مصنفین نے اس سلسلہ کی خدمات کو تلاش کرنے کی بہت کم زحمت گوارا کی۔ سید حامد حسن صاحب قادری نے صرف اتنا لکھ کر اپنا فرض انجام دیا کہ:

"مولوی سید احمد بریلوی نے اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ فارسی میں تنبیہ الغافلین لکھی ہے جس کا اردو میں ترجمہ مولوی عبداللہ نے ہگلی (کلکتہ) سے شائع کیا۔ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کئی کتابیں عقائد کے متعلق اردو میں لکھیں جن میں تقویۃ الایمان بہت مشہور ہے۔ اس زمانہ میں مولانا سید احمد بریلوی صاحب کے مریدوں نے بہت سی کتابیں تبلیغ واشاعت کی غرض سے لکھیں مثلاً ترغیب جہاد، ہدایۃ المومنین، نصیحۃ المومنین وغیرہ۔ یہ کتابیں اردو کی ترقی کے سلسلہ میں

شامل ہیں۔ مولوی اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان بہت صاف و سلیس زبان میں ہے۔"
(تاریخ داستانِ اُردو، ص ۱۵۶)

"بنگال میں اردو" کے مصنف نے مولانا کرامت علی کو اردو کا شیدائی لکھا ہے، مگر ان کے ذکر میں اتنا لکھنا کافی سمجھا ہے کہ:

"مشرقی بنگال میں اردو کے شیدائی مولوی کرامت علی صاحب نے مذہبی و اصلاحی موضوعات پر بیشتر مفید کتابیں لکھیں۔" (ص ۲۹)

ان کی کتابوں کی محض اتنی حیثیت دینا کہ وہ اردو کی ترقی کے سلسلہ میں شامل ہیں۔ ایک تاریخی ظلم ہے اور اس تاریخی ظلم کے جہاں دوسرے اسباب ہیں ان میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ انگریزوں کے عہد میں مرتب ہوئی، جن کو سید صاحب اور ان کے سلسلہ کے دینی و علمی کارناموں سے شدید بغض و عناد تھا اور ان کے نقشہائے دوام کو مٹانے میں انھیں لذت ملتی تھی۔ ملک میں اس وقت انگریزوں سے جو عام ذہنی مرعوبیت چھائی ہوئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی ساری ترقی کا سہرا انگریزوں اور ان کے قائم کردہ یا ان کے ہمنوا ادارے اور اشخاص کے سر باندھ دیا گیا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر علماء و مصلحین نے اردو کی جو خدمات انجام دیں وہ نظر انداز ہو گئیں۔ خاص طور پر سید صاحب کی تحریک اور ان کے کارناموں کے بارے میں برسوں ہر طرف سناٹا چھایا رہا۔ اب کہیں کہیں اس کا ذکر آنے لگا ہے۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اس میں تشیع کے تعصب نے بھی حصہ لیا۔ سید صاحب کی تحریک، خواجہ میر درد اور مومن خاں مومن کی شاعری اور بہت سے سنی ادبا کی خدمات کو اس عصبیت کی وجہ سے نظر انداز کیا گیا۔ مولانا خرم علی کی "نصیحۃ المسلمین" اور ان کی وہ نظم جو انھوں نے کتاب کے آخر میں عورتوں اور بچوں کے کو یاد کرانے کے لئے لکھی تھی۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

خدا فرما چکا قرآں کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

یہ پوری نظم ایک زمانہ میں بچہ بچہ کی زبان پر تھی۔ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی "تقویۃ الایمان" اور مولانا سلطان احمد کی تذکیر الاخوان ایک مدت تک خاص و عام ہر شخص کے مطالعہ میں

رہتی تھی۔ مولانا سخاوت علی کی راہِ نجات اور مولانا کرامت علی کی مفتاح الجنۃ ہمارے بچپن تک گھر گھر میں پڑھی اور سمجھی جاتی تھیں۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپیں اور شائع ہوئیں۔ یہ جملہ معترضہ بیچ میں اس لئے لانا پڑا کہ مولانا کا ترجمہ شمائل ترمذی دینی حیثیت کے ساتھ اردو ادب کا بھی شاہکار ہے مگر افسوس کہ اس حیثیت سے اس کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا۔

اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما میں علماء و صوفیاء کا جو حصہ رہا ہے اس کی تفصیل بہت طویل ہے مگر انیسویں و بیسویں صدی کی جو یہ مختصر سی تفصیل کی گئی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کو علمی زبان کے ساتھ عوامی زبان بنانے میں علماء و صلحاء کا کتنا حصہ رہا ہے۔

یہاں مختصراً مولانا کے حالات زندگی لکھے جاتے ہیں، پھر ترجمہ شمائل ترمذی کے تعارف کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کی جائیں گی

مولانا کا نام اور مولد و مسکن مولانا کا اصل نام علی تھا مگر عام طور پر ان کی زندگی ہی میں لوگ انھیں مولانا کرامت علی کہنے لگے تھے۔ خود انھوں نے اپنی کتابوں کے شروع میں لکھا ہے:

"خاکساری علی حنفی جونپوری مشہور بہ کرامت علی" (مفتاح، ص ۶۰)

یہ لقب عوام نے مولانا کی ان زندہ کرامتوں کی وجہ سے عطا کیا جو دعوت و اصلاح کے سلسلہ میں ان سے روزانہ صادر ہوتی رہتی تھیں۔ مولانا کے پوتے مولانا عبدالباطن صاحب مولانا کی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

"آپ کا نام علی تھا، آپ سے بکثرت کراموں کا ظہور ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ "کرامت" آپ کے نام کا جزو بن گیا" (ص ۴)

مولانا کا مولد و مسکن شہر جونپور کا مشہور محلہ ملا ٹولہ ہے جہاں اب بھی مولانا کے خاندان کے لوگ موجود ہیں۔ "مشاہیر جونپور" میں ہے کہ اس محلہ کا نام اسی خانوادہ کی سکونت کی نسبت سے پڑا۔ یہیں مولانا کی ولادت ۱۸ محرم الحرام ۱۲۱۵ھ کو ہوئی۔ مشاہیر جونپور میں ہے:

"اسلاف کرامش بعہد سلاطین اسلام خطیب جامع مسجد و عیدین بودند۔ بایں وجہ جائے سکونتش ملا ٹولہ مشہور شد"

ملہ اس وقت عام طور پر علماء اور خاص کر ائمۂ مساجد کو ملا کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا

"سلاطین اسلام کے عہد میں ان کے اسلاف کرام جامع مسجد اور عیدین کے امام تھے۔ اس وجہ سے ان کی رہائش گاہ کا نام ملا ٹولہ پڑ گیا۔"

مولانا کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ مولانا اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جونپور ہی میں ہوئی۔ سب سے پہلے اپنے والد مولانا ابراہیم صاحب سے بسم اللہ کی اور فارسی و ابتدائی عربی کی تکمیل کے بعد دوسرے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا عبدالباطن صاحب لکھتے ہیں:

"علم دینیہ مولانا قدرت اللہ ردولوی مرحوم سے علم حدیث، مولانا احمد اللہ اناوی سے علم معقولات مولانا احمد علی چریا کوٹی سے علم تجوید قرآن، قاری سید ابراہیم مدنی اور قاری سید محمد اسکندر سے علماً و عملاً حاصل کیا۔" (ص ۱۳)

مولانا نے سماعت قرآن پاک کی سند بھی مولانا احمد اللہ اناوی[1] سے لی تھی جن کا سلسلہ نسب مشہور قاری قرآن صحابی حضرت ابی بن کعب تک پہنچتا ہے۔ "مشاہیر جونپور" میں شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمٰعیل شہید سے بھی ان کے علمی استفادے کا ذکر ملتا ہے:

مولانا کرامت علی جملہ علوم معقول و منقول از علمائے عصر اکتساب نمودند، از خوان علوم مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی و مولانا اسمٰعیل دہلوی سے ہم لقمہا برچیدند۔ (۱۳۵)

مولانا کرامت علی صاحب نے تمام علوم عقلی و نقلی کو اپنے عہد کے علماء سے حاصل کیا تھا۔ انھوں نے شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کے خوان علم سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانے سے پہلے مولانا نے دلّی کا سفر کیا تھا۔ آگے لکھتے ہیں:

فاما مسائل فقہ از بس مستحضر بود، قاری ہفت قرأت بودند، کلام مجید را بہ آواز خوش و بہ لحن بر درد خداوندی خواندند، وقتیکہ جہت حصول سعادت حج و عمرہ و زیارت نبوی رفتہ بود بمکہ معظمہ قاریان آنجا مشق نمودے۔ (ص ۱۳۹)

مولانا کو فقہ کے مسائل حد سے زیادہ یاد تھے، سبعہ کے قاری تھے، قرآن مجید انتہائی خوش الحانی اور فطری درد و سوز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب حج و عمرہ کیلئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں کے قاریوں سے بھی مشق کی تھی۔

[1] اس سے معلوم ہوا کہ سماع قرآن کی سند کا بھی رواج تھا۔

شمائل ترمذی اور مشکوٰۃ کے ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن حدیث اور عربی ادب میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی خاص طور پر شمائل نبوی کا ہر فقرہ اپنی معنویت کے ساتھ عربی ادب کا شاہکار بھی ہے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جن الفاظ میں آپ کے حلیۂ مبارک اور سیرت وشمائل کی تصویر کشی کی ہے اس سے بہتر الفاظ کا انتخاب ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کی معنویت کو مجروح کئے بغیر کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر یہ علمی وادبی ترجمہ اردو نثر میں اس وقت ہوا ہے جب اردو نثر قصہ کہانی اور میر امن کے "چہار درویش" سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ ترجمہ پہلی بار ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں شائع ہوا۔ مولانا خط نستعلیق اور خط نسخ دونوں کے بہترین خطاط تھے ان کو اس میں اتنی مہارت تھی کہ ایک چاول پر پوری سورہ اخلاص لکھ دیتے تھے۔

بر یک دانۂ برنج یا نخود سورۂ "قل ہو اللہ" بتمامہ نوشتے۔ (ص ۱۳۶)	ایک چاول یا ایک چنے پر پوری سورہ اخلاص لکھ دیتے۔

مولانا نے فن سپہ گری اور بنوٹ کی بھی مشق کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات منقول ہیں، کچھ واقعات کا ذکر آگے آئے گا۔

مولانا کے علم وفضل پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ صاحب "تذکرہ علماء ہند" نے ان کو کثیر التصانیف لکھا ہے۔ "مشاہیر جونپور" کے مصنف نے انفیس "علماء ناموران ذوات بابرکات، سرمایہ ناز وافتخار جونپور" وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ان کی تصانیف سے بھی ان کے علم وفضل کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے

باطنی فیض

مگر مولانا کی حیات پر سعادت کا دائرۂ فضل وکمال اس سے بھی آگے تھا۔ ایک طرف وہ علم وفن میں تمام علمائے عصر کے ہم عنان تھے تو دوسری طرف زہد واتقار، اتباع سنت اور دعوت وعزیمت کی پر خار وادیوں سے نہ صرف گزرے تھے بلکہ ان صفات ملکوتی ونبوی میں بھی انھیں ایک ممتاز مقام حاصل تھا، اور یہ سب اثر تھا سید صاحبؒ کے فیضِ نظر کا۔

"وفیض وافراز مولانا سید احمد شہید اندوختند۔" (ص ۱۳۵)

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے سید صاحب سے ان کی بیعت کا دو لفظوں میں ذکر آیا ہے:

"ومرید سید احمد بریلوی"	سید صاحب کے مرید تھے۔

مزید تفصیل مولانا عبدالباطن صاحب کے بیان سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کی عمر ابھی اٹھارہ سال کی تھی کہ تزکیۂ نفس کے خیال نے زور پکڑا۔ اس کے لئے دلی جانے کا ارادہ تھا مگر سید احمد شہید کی شہرت ہوئی، وہ وطن سے قریب بھی تھے اسلئے ان کی خدمت میں رائے بریلی پہنچے وہاں علماء کی ایک جماعت جس میں مولانا اسمٰعیل شہیدؒ و عبدالحی جیسے برآمد روزگار علماء بھی موجود تھے، ان کی علمی صحبت میں بھی رہے اور حضرت سید صاحب سے باطنی استفادہ بھی کیا۔ مولانا جس ذوق و شوق سے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سید صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں بیعت کر لی اور ایک ہفتہ میں مقامات سلوک طے کرا دینے کے بعد فرمایا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ۔ سید صاحب نے جو خلافت نامہ مولانا کو عطا کیا ہے وہ اب بھی اس خاندان میں محفوظ ہے۔"

راقم کو اس کا فوٹو مولانا ظفر صاحب نے بھیجا ہے جس کی عبارت اتنے باریک فارسی خط میں ہے کہ پڑھی نہیں جاتی۔ اس پر تاریخ خلافت ۱۲۳۹ھ درج ہے۔ آخر میں یہ مع ترجمہ درج ہے:

خود مولانا کرامت علیؒ صاحب نے سید صاحبؒ سے اپنی عقیدت اور شیفتگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"جب دین میں طرح طرح کے فساد ظاہر ہوتے ہیں تب اللہ تعالیٰ دین کے تازہ کرنے کے واسطے ایک شخص کو پیدا کرتا ہے اور اس کے اعوان و مددگار بہت سے ہوتے ہیں سو اس وقت کے مجدّد صاحب طریقت حضرت امیر المومنین سید احمد قدس سرہ ہوئے اور انھوں نے دین کو تازہ کیا۔" (نور علیٰ نور)

اسی طرح اپنی متعدد کتابوں میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

مولانا ابھی کچھ دنوں اور قیام کرنا چاہتے تھے مگر سید صاحب نے فرمایا تھا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ، اس لئے واپسی کا قصد کر لیا لیکن ان کے ذوق و شوق کو محسوس کر کے سید صاحب نے پھر فرمایا کہ:

"کام تو خدا کی رحمت سے ہو گیا، اور بہت جلد ہو گیا۔ اب بحیثیت مہمان دو چار روز اور بھی ٹھہر کر دیکھ بھال کر لو۔"

مولانا نے یہاں اٹھارہ دن قیام کیا، اس دوران ان سے کئی واقعے پیش آئے جن میں ایک اہم واقعہ مولانا نے خود اپنی کتاب 'نور علیٰ نور' میں نقل کیا ہے:

"ایک روز اس عاجز مسکین نے حضرت عالم ربانی مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ آپ جو اس قدر میاں[1] صاحب سے اعتقاد رکھتے ہیں اور روپے پیسے، کپڑے وغیرہ دنیاوی چیزوں کو چھوڑ کر

---

[1] عام بول چال میں حضرت سید صاحب کو لوگ میاں صاحب اور میر صاحب کہتے تھے۔

میاں صاحب کی صحبت اختیار کئے ہیں اور آپ کے بدن پر جو کپڑا ہے اس کے سوا آپ کے پاس کہیں کپڑا بھی نہیں، اور آپ جب میاں صاحب کے روبرو بات کرتے ہیں تو ترساں اور لرزاں رہا کرتے ہیں تو للہ آپ ہم سے سچ بیان کریں کہ آپ نے میاں صاحب سے کیا پایا جو اپنا حال ایسا بنایا۔ تب مولانا مغفور نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں سچ بیان کروں گا۔ سنو! میرا یہ حال تھا کہ میں سلوک الی اللہ اور مشاہدہ حاصل ہونے کا بڑا اشتاق تھا۔ تب میں نے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ مجھکو آپ سلوک الی اللہ کی تعلیم کیجئے اور اس سے قبل میں بہت سے ہندی اور ولایتی مرشدوں سے توجہ لے چکا تھا، مگر میرا مقصود حاصل نہ ہوا تھا۔ تب آپ نے مجھ کو حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے پاس بھیجا، وہاں بھی چند روز توجہ لیتا رہا مگر میرا مقصد حاصل نہ ہوا۔ تب میں نے حضرت مولانا سے پھر عرض کیا کہ یہ خادم حضور کی توجہ کا محتاج ہے اور حضور دوسرے مقام میں بھیجتے ہیں۔ ہم کو آپ خود تعلیم کیجئے۔ تب حضرت مولانا نے فرمایا کہ "میاں! میں بڈھا ہوں اور کمزور ہوں، مجھ میں بہت دیر تک بیٹھنے کی طاقت نہیں یہ مقصد تمہارا میر احمد صاحب (سید صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب میر صاحب کہا کرتے تھے) سے حاصل ہوگا، ان سے بیعت کرو، تب اس جناب کا فرمانا مجھ کو بہت شاق گزرا اور میں ناراض ہو کے چپ رہا پھر کئی بار اور بھی عرض کیا وہی جواب پایا۔ آخر کو بعد چند روز کے یہ واقعہ درپیش ہوا کہ میں اور حضرت میاں صاحب اور میاں محمد اسمٰعیل مدرسہ کے ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔ ایک شب کو بعد عشاء کے جب ہم تینوں شخص پلنگ پر سوئے تب میاں صاحب نے فرمایا کہ مولانا! مجھ کو حضرت رب العالمین نے اپنے فضل و کرم سے بطور الہام خبر دیا ہے کہ فلانی تاریخ فلانے سفر میں تو جاوے گا اور فلانے مقام میں یہ ہوگا فلانے مقام میں وہ ہوگا اور اس قدر لوگ مرید ہوں گے۔ وعلیٰ ہذا القیاس سب باتیں بیان کیں۔ پھر دوسرے روز بھی ایسی ہی عجیب و غریب باتیں بیان کیں۔ اس طرح سے کئی روز تک مکہ معظمہ کے سفر اور جہاد کے سفر اور جہاد کے واقعات کا بیان بالتفصیل تمام فرمایا۔ تب ہم نے اور میاں محمد اسمٰعیل نے مشورہ کیا کہ اگر یہ سب باتیں سچ بیان کرتے ہیں کہ تو بلاشبہ یہ بہت بڑے شخص اور قطب ہیں۔ ان سے کچھ فیض لینا بہت ضروری ہے سو آؤ کسی بات میں ان کا امتحان کریں۔ تب میاں محمد اسمٰعیل نے کہا کہ آپ ہم سے بڑے ہیں آپ ہی تجویز کر کے کسی بات میں امتحان کیجئے۔ آخر کو جب پہر رات کو میاں صاحب نے پکارا کہ مولانا! تب ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی بزرگی

میں کچھ شبہ نہیں، مگر ہم کو ان باتوں سے کیا فائدہ، کچھ ہم کو عنایت کیجئے۔ تب فرمایا کہ مولانا کیا مانگتے ہو۔ تب ہم نے کہا کہ حضرت! ہم یہی مانگتے ہیں کہ جیسی نماز صحابہ کرام ادا کرتے تھے ویسی ہی دو رکعت ہم سے ادا ہو۔ یہ کہا اور میاں صاحب یک بارگی خاموش ہو گئے اور اس روز کچھ نہ بولے تب ہم لوگوں نے جانا کہ فقط یہ زبانی باتیں تھیں، اصل باتوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں۔ مگر ہمیشہ کی دوستی اور صحبت کی مروّت سے ہم لوگ کچھ نہ بولے کہ اب شرم دلانا کیا ضرور؟ اور چپ ہو کر سو رہے پھر آدھی رات کے قبل یا بعد حضرت میاں صاحب نے پکارا کہ: "مولانا!" اس پکار سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے جواب میں کہا "حضرت!" تب فرمایا کہ "جاؤ اس وقت اللہ کے واسطے وضو کرو" تب پھر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ بہت خوب! اور چلا، دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا "مولانا! سن لو" میں پھر کے حضرت کے پاس حاضر ہوا، فرمایا تم نے خوب سمجھا؟ میں نے کہا اللہ کے واسطے وضو کرو۔ پھر میں نے کہا بہت خوب، اور چلا۔ دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور اسی طرح فرمایا۔ اس طرح تین مرتبہ فرمایا۔ تیسری مرتبہ میں وضو کرنے لگا تو ایسا حضور دل اور حق سبحانہ کے خوف سے میں نے ادب کے ساتھ وضو کیا کہ ایسا وضو کبھی نہیں کیا تھا۔ پھر وضو کر کے حضرت کے حضور میں حاضر ہوا۔ فرمایا: جاؤ اللہ رب العالمین کے واسطے اس وقت دو رکعت نماز پڑھو۔ تب میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور نماز کے واسطے چلا۔ دو تین قدم چلا تھا کہ پھر پکارا اور میں حضور میں حاضر ہوا۔ فرمایا: تم نے خوب سمجھا یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جاؤ اس وقت اللہ رب العزت کے واسطے دو رکعت نماز پڑھو، میں نے کہا کہ بہت خوب! اور نماز کے واسطے چلا، پھر تیسری بار پکارا اور ویسا ہی سمجھا دیا۔ تب میں نے ایک گوشہ میں نماز شروع کی تو تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہی سے ایسا مشاہدہ جلال میں غرق ہوا کہ ہوش باقی نہ رہا اور اس قدر رویا کہ آنسو سے داڑھی تر ہو گئی اور اس قدر نماز میں غرق ہو گیا کہ دنیا کی یاد مطلق باقی نہ رہی اور نہایت خوف و لذت کے ساتھ میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ جب دو رکعت پڑھ چکا تو خیال کیا کہ میں نے سورہ فاتحہ نہ پڑھا تھا۔ پھر سلام پھیر کے دوبارہ دوسری نماز دو رکعت کی نیت کیا پھر جب پڑھ چکا تو خیال کیا کہ فاتحہ میں سورہ ضم نہ کیا تھا۔ پھر شروع کیا۔ اس طرح ہر بار ایک ایک واجب ترک کرنے

کا خیال آیا تھا اور نماز کو ناقص سمجھ کر دہراتا تھا۔ واللہ اعلم سو رکعت، یا زیادہ یا کم پڑھا ہوگا کہ صبح صادق کا وقت قریب ہوا پھر آخر کو ناچار ہوکے سلام پھیرا اور بہت شرمندہ ہوا کہ میری استعداد اس طرح کی ناقص ہے کہ دو رکعت پوری بھی حضور دل کے ساتھ نہ پڑھ سکا اور اتنے بڑے کامل شخص کو کو میں نے آزمایا۔ اب اگر وہ پوچھیں کہ تم نے دو رکعت نماز اللہ کے واسطے پڑھا، تو میں کیا جواب دوں گا۔ میں تو حضورِ دل کے ساتھ جیسا کہ حق نماز پڑھنے کا ہے ویسا دو رکعت بھی نہ پڑھ سکا۔ اسی سوچ میں شرم کے دریا میں غرق ہو گیا اور اپنے قصور کا معترف ہوکے اللہ سبحانہ کے خوف سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہنا شروع کیا۔ جب اذان ہوئی تب مجھ کو ہوش آیا اور یاد پڑا کہ صحابۂ کرامؓ کا یہی حال تھا کہ تمام رات عبادت کرتے اور پچھلی رات کو استغفار کرتے تھے۔ ان کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۔ اور سوچا بلاشبہ یہ بڑے کامل مرشد ہیں کہ ان کے کلام سے میرا مقصد پورا ہوا اور جو نعمت مدّتِ دراز کی محنت میں حاصل نہ ہوئی تھی سو ان کے ایک دم کے فرمانے سے حاصل ہوئی۔ پھر میں مسجد میں گیا اور قبل نماز فجر میں نے حضرت میاں صاحب سے بیعت کیا اور صبح کی نماز کے بعد محمد اسمٰعیل سے میں نے رات کا پورا قصّہ بیان کیا۔ چونکہ وہ مجھ کو صادق جانتے تھے، انھوں نے بھی حضرت میاں سے بیعت کیا پھر میں دن کو حضرت شاہ عبدالعزیز کے پاس گیا اور رات کا قصّہ بیان کیا اور اپنے بیعت کرنے کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: بارک اللہ، خوب کیا، میاں! میں تم سے اسی واسطے کہا کرتا تھا، کیوں میاں! تم نے میر صاحب کا کمال دیکھا۔ تب میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں نے بہت درویشوں کی خدمت کی اور بہت طریقوں کے موافق میں نے شغل اور مراقبہ کیا۔ میرا مقصد کبھی حاصل نہ ہوا۔ حضرت سید صاحب نے ایک بات زبان سے کہہ دی اور میں اپنا وہی مقصد پا گیا۔ حضرت! یہ کون سا طریقہ کہلاتا ہے؟ تب فرمایا کہ میاں! ایسے لوگ کسی طریقے کے محتاج نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ جو زبان سے کہیں وہی طریقہ ہے۔ ایسے لوگ خود صاحب طریقہ ہوتے ہیں اور ایسے لوگ طریقہ نکالتے ہیں۔ حضرت مولانا کے فرمانے سے اور بھی زیادہ مجھ کو حضرت میاں صاحب کے مرشد صاحبِ طریقہ ہونے کا یقین ہوا اور میرا اعتقاد اور بھی زیادہ ہوا۔ اس سبب سے میں میاں صاحب کی غلامی میں حاضر ہوں

اور ان کی غلامی کے قابل بھی میں اپنے کو نہیں پاتا۔"

حضرت سید صاحبؒ کی یہ روشن کرامت تھی کہ مولانا جونپوری کو ان کے شوق جہاد کے باوجود بنگال روانہ کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ بنگال اور آسام جیسے تاریک خطہ کا کیا انجام ہوتا۔ "سوانح حیات احمدی" مصنفہ مولوی محمد جعفر صاحب، کے صفحہ ۱۴۱ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا کرامت علی مرحوم سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے اور قبل معرکہ بالاکوٹ حضرت سید صاحب نے مولانا کو ہدایت خلق اور اشاعت دین کی غرض سے ہندوستان روانہ کر دیا۔ واللہ اعلم بتحقیق الحال، جہاد بالاکوٹ کی ظاہری ناکامی حضرت سید صاحب پر منکشف ہو چکی تھی اس لئے حضرت سید صاحب نے مولانا سے وہی خدمت لینی چاہی جو اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص و مقدر ہو چکی تھی۔

جو لوگ حضرت سید صاحب کی تحریک کو ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں وہ اگر تحریک کے معنوی اثرات، جہاد سے واپس آنے والے علماء کی احیائے سنت کی مساعی خاص طور پر علمائے صادق پور اور مولانا کرامت علی جونپوری رحمہم اللہ کی تبلیغی مساعی پر ایک نظر ڈال لیں تو شاید وہ اپنی رائے واپس لینے پر مجبور ہوں گے۔ آگے ذکر آئے گا کہ صرف مولانا جونپوری کی وجہ سے صوبہ بنگال جو عہد مغلیہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ بن سکا تھا وہ محض مولانا کرامت علی کی کوششوں سے اکثریت کا صوبہ بن گیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید کی صحبت علمی نے ان کو اگر علم و فضل سے آراستہ کیا تو سید صاحب کے فیض باطنی سے ان میں زہد و قناعت، ورع و تقویٰ، ایثار و قربانی اور دعوتِ دین و احیائے سنّت کا وہ پُر شور جذبہ پیدا ہوا کہ انھوں نے جونپور کی مسند درس و افتاء اور امامت و خطابت اور ذاتی عزّت و وجاہت کو خیرباد کہہ کر بنگال کے گاؤں گاؤں کی خاک چھانی اور قال اللہ و قال الرسول کی صدائے پر سوز کو اہل بنگال کے کانوں سے اتار کر ان کے دل کی گہرائیوں تک پہنچا دیا اور اسی دیار غیر میں یہ مبارک کام کرتے ہوئے جان جانِ آفریں کے سپرد کی یعنی ۳ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ بروز جمعہ صوبہ بنگال کے مقام رنگ پور میں مولانا کی وفات ہوئی۔ صاحب مشاہیر جونپور سید نورالدین زیدی نے ان کی تاریخ وفات "بر و رحمت ساطع النور باد" لکھی ہے۔ دوسری تاریخ وفات "جناب کرامت علی جنتی" سے نکلتی ہے۔

اب ہم مولانا کے عادات و خصائل اور ان کی تبلیغی کوششوں کی تھوڑی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

کیا چین میں نئے دور کا آغاز ہے؟

عربی مجلہ "الدعوہ" ریاض سے ماخوذ۔ ترجمہ: مولانا بدر جمال صاحب اصلاحی

• کیا آج چین کے مسلمان نئے دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں؟ اور کیا اب جب کہ ایک طویل مدت تک وہاں انسان نما درندوں نے ملت اسلامیہ کو قتل و غارت اور ظلم و قہر کا نشانہ بنا کر بے جان کر دیا تھا، پھر سے اس بے جان لاشے میں سانس کی لہر آسکتی ہے؟ اور کیا اسلامی تہذیب و تمدن کے تمام نشانات و امکانات مٹا دیئے جانے کے بعد پھر وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکتا ہے؟ اور کیا چین کی جدید حکومت نے ظالم ماؤزے تنگ کی موت اور چار جماعتی گروپ کے زوال کے بعد مسلمانوں کو جو تھوڑی سی خصوصی چھوٹ دے رکھی ہے وہ حقیقت ہے یا کوئی سیاسی چال، جو وقتی مصلحت کے طور پر اختیار کر لی گئی ہے؟

ونیس اسمتھ صحافی اپنی ایک خاص رپورٹ میں کہتا ہے:

"چینی مسلمانوں کے متعلق عالمی اسلامی تاثرات کو ختم کرنے کے لئے چین نے بعض خاص دینی سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے۔" وہ بطور دلیل، چینی وزیر خارجہ ہوانگ ہوا کی تقریر ١٩٨٠ء کے اس اقتباس کو پیش کرتا ہے: "مشرق وسطی کے ملکوں سے تعلقات استوار کرنے کے لئے ہمیں ہر قیمت پر اپنے ملک میں دینی امور کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی، کیوں کہ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ملکوں میں دین کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں۔ اگر ہم ماہرانہ لچک دار سیاست کے قائل ہیں تو بعض دینی سرگرمیوں میں ہمیں حصہ لینا ہی پڑے گا۔"

• جی ہاں ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں چین کی نئی سیاست کا مصداق کیا ہے؟ کیا ذمہ داران حکومت صرف ان ہی دینی مظاہر پر اکتفا کریں گے جن کی انجام دہی کی اجازت انھوں نے مسلمانوں کو دے دی ہے، یا آگے بڑھ کر وہ ان کی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی

حالت کو بہتر بنانے کے لئے بھی کوئی نتیجہ خیز قدم اٹھائیں گے؟

• اور آخر میں ہم یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ، کس حد تک خود چینی مسلمان اپنے ماحول کے حالات و واقعات کا شعور رکھتے ہیں؟ اور حکومت کی رواداری پالیسی سے فائدہ اٹھانے کے لئے انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کے باشعور اور حکیمانہ عملی پروگرام کیا ہیں؟ اور کیا چین سے باہر کے مسلم افراد، مسلم تنظیمیں اور مسلم حکومتیں اپنے چینی بھائیوں کی اقتصادی اور تعلیمی امداد و تعاون کا جذبہ رکھتی ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات مستقبل ہی دے سکتا ہے۔ اس مستقبل کی جھلکیاں دیکھنے کے لئے ہمیں چین کے ماضی پر غور کرنا ہوگا۔ اور حال سے باخبر رہنا ہوگا۔

چینی مسلمانوں کی تاریخ

استاذ عبداللہ ناجونگ (جنھوں نے ۱۹۳۷ء میں ازہر شریف سے عالمیت اور اسلامی تاریخ سے تخصص کیا ہے) کا خیال ہے کہ چین عرب تعلقات قبل از اسلام سے ہیں۔ شہنشاہ اودی نے ۱۳۹ قبل مسیح میں اپنے ایک سفیر چیانگ چیون کو وسط ایشیائی ممالک میں دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا جس نے اپنے اس سفر میں بشمول عرب و ایران ۳۶ ملکوں کا دورہ کیا۔ استاذ ناجونگ مزید کہتے ہیں کہ چینی و عربی تاریخ کا اتفاق ہے عرب مسلمانوں اور چینیوں کا پہلا سرکاری پیمانے کا تعلق تانگ خاندان کے شہنشاہ " فاؤتسانگ "کے عہد (۶۵۱ء مطابق ۳۱ھ) میں ہوا جب کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنیؓ کے وفد شہنشاہ مذکور سے اس زمانے کے چینی دار السلطنت "چنگان چیان" میں ملاقات کی۔

لیکن استاذ فہمی ہویدیٰ اپنی کتاب " الاسلام فی الصین" میں اس بات کی تردید کی ہے کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی نے اپنے وفد کو چین بھیجا تھا، ان کا کہنا ہے کہ تمام عربی اور یوروپین مراجع متفق ہیں کہ خود چین کے بادشاہ نے حضرت عثمان غنی کے پاس وفد بھیجا۔

طبری کا بیان ہے کہ ایران کے بادشاہ یزدگرد نے معرکۂ نہاوند میں شکست کھانے کے بعد بادشاہ چین کے پاس اپنے قاصد کو بھیجا، وہاں کے لوگوں نے قاصد سے حالات دریافت کئے تو اس نے کہا کہ جو خط اور تحفے میں شاہ چین کے پاس لایا ہوں ان سے تمام باتیں ظاہر ہیں۔ شاہ چین نے کہا کہ بادشاہوں کا فریضہ ہے کہ وہ مغلوب بادشاہوں کی مدد کریں، اور پوچھا کہ جس قوم نے تمہیں تمہارے وطن سے نکال دیا ہے ان کے اوصاف و کردار کیا ہیں؟ ۔ جیسا کہ تم کہتے ہو کہ وہ بہت تھوڑے ہیں اور تم ان سے

بہت زیادہ ہو، پھر وہ اپنی کسی خوبی ہی کی وجہ سے تم پر غالب آئے ہیں اور تمہارے اندر ضرور کوئی کمزوری ہے۔

جب یزدگرد کے قاصد نے مسلمانوں کے اوصاف بیان کئے تو شاہ چین نے یزدگرد کے پاس لکھا کہ "میں آپ کی مدد کے لئے ایسا لشکر جرار بھیج سکتا ہوں جس کا اگلا سرا "مرو" میں ہو تو پچھلا سرا "چین" میں۔ لیکن آپ کے قاصد نے دشمن کے جو اوصاف بیان کئے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ لوگ ان اوصاف کے حامل رہیں گے، پہاڑ بھی ان کی ہیبت سے اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور میری مضبوط حکومت کو ختم کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا، لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ آپ ان سے صلح کر لیں، ان کی برتری پر راضی ہو جائیں اور ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔"

پھر شہنشاہِ چین (فاؤتسانگ) نے مسلمانوں کی اس قوت کا راز جاننے کے لئے اپنے دو قاصدوں کو عرب بھیجا جس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے کچھ مبلغین دینِ اسلام کی دعوت و تبلیغ کیلئے چین بھیجے۔

مسلمانوں اور چینیوں کے نمایاں تعلقات کا ظہور ۹۶ھ میں ہوا، جب کہ ولید بن عبدالملک کے عہد میں قتیبہ بن مسلم باہلی کی فوجیں کاشغر تک پہنچ گئیں جو مشرقی ترکستان (موجودہ سنکیانگ) میں واقع ہے۔ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل میں لکھتا ہے:

"قتیبہ بن مسلم اپنے ایک آدمی کبر بن فلاں کو فوج کے ساتھ کاشغر روانہ کیا، وہ اسے فتح کرتے ہوئے چین کی سرحد تک جا پہنچے۔ چین کے بادشاہ نے قتیبہ سے فرمائش کی کہ آپ اپنے کسی صالح شخص کو بھیج دیں جو آپ اور آپ کے دین کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتا سکے۔ تو انھوں نے دس وجیہ، فصیح، بارعب، ہوشیار اور صاحب رائے آدمیوں کو بہترین ساز و سامان، عمدہ لباس اور اصیل گھوڑوں کے ساتھ روانہ کیا جن میں ہبیرہ بن مشمرج کلابی بھی شامل تھے۔ روانگی کے وقت قتیبہ نے ان لوگوں سے کہا کہ بادشاہ سے ملاقات کے وقت بتاؤ کہ "میں نے قسم کھائی ہے کہ بغیر چین کی سرزمین روندے، وہاں کے بادشاہوں کو قید کئے اور ٹیکس لئے ہرگز نہ لوٹوں گا۔"

طبری، "تاریخ الرسل والملوک" میں چینی دربار میں اس وفد کے شاندار استقبال اور باہمی گفتگو کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ جب شاہ چین نے قتیبہ کے ارادے کو سنا کہ وہ بغیر چین کی سرزمین روندے اور وہاں کے بادشاہوں کو قید کئے اور جزیہ لئے نہ لوٹیں گے، تو اس نے کہا کہ ہم انھیں باہر ہی باہر سے ہٹا

دیں گے، اپنے ملک کی مٹی ان کے پاس بھیج دیں گے کہ وہ اسے اپنے قدموں سے روند دیں اور اپنے چند بیٹوں کو ان کے پاس بھیج دیں گے کہ وہ انھیں قید کی علامت کے طور پہ بیڑی پہنا دیں، اور ہم ان کی مرضی کے مطابق انھیں جزیہ بھیج دیں گے۔

طبری آگے لکھتا ہے کہ چنانچہ شاہ چین نے سرزمین چین کی دھول سے بھری ہوئی سونے کی چند پلیٹیں اور اپنے چار لڑکے اور بہت سارے ریشمی کپڑے، قیمتی تحفے اور سونا قتیبہ کے پاس بھیجے۔ قتیبہ نے جزیہ قبول کیا، مٹی کو پیروں سے روندا اور شہزادوں کو بیڑیاں پہنانے کے بعد واپس کر دیا۔ اسی وقت سے چین میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔

چوتھی صدی ہجری میں کاشغر نے پھر ایک بڑا اہم اسلامی تاریخی واقعہ دیکھا جبکہ خاقان ستوق "بغرا خان" حلقہ بگوش اسلام ہوا، جس کی وجہ سے پورے مشرقی ترکستان (موجودہ سنکیانگ) میں اسلام پھیل گیا اور یہ نشر و تبلیغ کا سلسلہ چین تک پھیلتا چلا گیا۔

چینی ریکارڈ اور عربی و یوروپی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ منگولی حکومت "یوان" (۱۲۷۱ — ۱۳۶۸ء) کے دوران چین میں اسلام کی زبردست اشاعت ہوئی۔ اس حکومت کو چنگیز خاں کے پوتے قبلائی خاں نے چین میں سوانگ خاندان کو ختم کر کے قائم کیا تھا۔

چین میں مسلمانوں کے حالات میں مختلف مد و جزر گزرتے رہے، کبھی وہ قوت و شوکت سے بہرہ ور رہے تو کبھی انھیں ضعف و بے نوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے منشوری (مانشو) حکومت (۱۶۴۴ — ۱۹۱۱ء) نے ملتِ اسلامیہ چین پر مسلسل کاری ضربیں لگا لگا کر ان کی قوت و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔

اس آخری دور میں مسلمانوں کی کئی تعلیمی اور تربیتی تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ ازہر شریف میں چینی مبعوث استاذ محمد مکین کا بیان ہے کہ مسجد بکین کے امام شیخ الیاس عبدالرحمٰن وانگ نے ۱۹۰۲ء میں حکومت سے بکین شہر میں ایک اسلامی درس گاہ اور ایک ابتدائی مدرسہ کھولنے کی منظوری حاصل کی جس میں چینی زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان پڑھائی جاتی رہی ہے اور قرآن و حدیث کے چینی ترجمے کا رواج رہا ہے۔ اس سے پہلے مسلمان بچوں کی تعلیم (اور وہ بھی سہولت ہونے پر) دیہاتوں میں پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکاتب میں ہوتی تھی جہاں سے وہ لادینی سرکاری مدارس میں چلے جاتے تھے۔
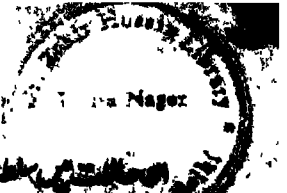
اسی عرصہ میں سلطان عبدالحمید نے چینی مسلمانوں سے ربط قائم کرنے کی بڑی کوششیں کیں اور ان کے حالات و کوائف سے آگاہی کے درپے رہے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے ایک آدمی کو ۱۹۰۰ء میں پکین بھیجا، لیکن ان کی یہ مہم بے نتیجہ رہی۔ پھر اتفاق سے مسجد پکین کے امام استنبول گئے اور وہاں سلطان عبدالحمید سے ملاقات کر کے انھیں چین میں اسلامی وفد بھیجنے کی صلاح دی۔ چنانچہ سلطان نے دو مسلمان ترکوں کو بھیجا جنھوں نے ۱۲۰ طلبہ پر مشتمل مسجد "نیو جاۃ" میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جو بفضلہ اب تک وہاں کی راجدھانی میں چل رہا ہے۔

۱۹۱۱ء میں جب ڈاکٹر سن یاٹ سن نے چین میں نیشنلزم اور جمہوریت کا اعلان کیا تو ملک کے پانچ بنیادی عناصر میں مسلمانوں کو بھی تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں چینی مسلمانوں کی پہلی تنظیم "جمعیۃ التقدم الاسلامیۃ" کے نام سے منصۂ شہود پہ آئی۔ نئی جمہوریت کے سلسلے میں چینی مسلمانوں کی امیدوں کو پھر سے پنپنے کا

> چینی مسلمانوں کے لئے ثقافتی انقلاب (۶۶-۱۹۷۶ء) ایک مہلک وبا تھا۔ اس منحوس دور میں وہ سو سال پیچھے ڈھکیل دیئے گئے۔

موقع ملا۔ وہ اپنی منتشر صفیں درست کرنے لگے اور اس طوق عزلت کو توڑ پھینکا جو اُن کے گلے میں جبراً ڈال دیا گیا تھا۔

۱۹۳۱ء میں پانچ اشخاص پر مشتمل چینی مسلم طلبہ کی پہلی ٹولی اسلام کے مطالعے کے لئے ازہر شریف گئی۔ اس جمہوری دور حکومت میں چین اور خصوصاً مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں حکومت کے ظلم و طغیان کے خلاف کئی اسلامی تحریکیں اٹھیں (ان تحریکوں کا مختصر ذکر مقامی تاریخوں میں بھی موجود ہے) جنھیں "چیانگ کائی چیک" اور "کومنتانگ" پارٹی کے درندوں نے نہایت وحشیانہ انداز سے کچل دیا۔

ان تحریکوں میں سب سے مشہور اور اہم خواجہ نیاز کی برپا کی ہوئی تحریک تومول ہے جو ۱۹۳۱ء میں مشرقی ترکستان (سنکیانگ) کی ایک ریاست سے اٹھی اور ۱۹۳۳ء میں ایک علیحدہ قومی حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی جس کا دارالحکومت کاشغر تھا۔ ایسے ہی ۱۹۴۴ء میں علی خان تورہ کے زیر قیادت ایک اور قومی تحریک اٹھی جس نے مشرقی ترکستان کی علیحدگی کا اعلان کیا۔

مسلمان کمیونسٹ حکومت میں

۱۹۴۹ء میں جب چین میں کمیونسٹ انقلاب آیا تو مسلمان اس وقت حالت منتظرہ میں تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے اپنی ایک تنظیم "الجمعیۃ الاسلامیۃ الصینیہ" کے نام سے بنائی۔

۱۹۶۶ء میں ماؤتسی تانگ کی قیادت میں ثقافتی انقلاب کا آغاز ہوا جو دس منحوس سالوں تک جاری رہا۔ یہ انقلاب چینی سماج پر مختلف پہلوؤں سے ایک مہلک وبا بن کر ٹوٹا جس کا اعتراف خود چینیوں کو بھی ہے۔ اس مہلک انقلاب کے سبب مسلمانوں کی فکری، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت سخت ادبار کا شکار ہوئی اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان سو سال پیچھے جا پڑے۔

ثقافتی انقلاب؟!! نہیں، تخریبی انقلاب کے دوران چین اور مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں جلیل القدر مسلمان علماء کی کثیر تعداد شہید کر دی گئی۔ سینکڑوں کو اندھیری کوٹھریوں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا اور ہزاروں کو بیوی بچوں سمیت ملک بدر کر دیا گیا۔

مشرقی ترکستان (سنکیانگ) کے ایک عالم کا بیان ہے کہ انھیں ۱۲ سال تک اس جرم کی پاداش میں قید وبند کی سزا دی گئی کہ وہ مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے، اور ان کے گھر کی تلاشی پر بعض دینی کتابیں مثلاً تفسیر منار وغیرہ نکلیں جس کی بنا پر وہ رجعت پسند اور انقلاب دشمن قرار پائے۔

اس ثقافتی تخریبی عہد میں لوگوں کے گھروں میں زبردستی گھس گھس کر تلاشی لی گئی اور قرآن مجید نیز دوسری عربی دینی کتابوں کے نسخوں کو نذر آتش کیا گیا۔

ایک مسلمان بہن نے ہمیں بتایا کہ اس نے خدا کے خوف کے باعث اپنے قرآن مجید کو اقتدار کے حوالے نہیں کیا بلکہ اسے اپنے پاس چھپا رکھا، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اگر انقلابی جان گئے تو اسے قتل کر دیں گے یا سخت سزا دیں گے۔

اس بہن نے مزید بتایا کہ خدا نے تلاشی لینے والوں کو اندھا کر دیا، انھوں نے پڑوس کے سب گھروں کی تلاشی لی لیکن میرے گھر کو چھوڑ دیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے میرے قرآن مجید کی حفاظت کی جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

اس ثقافتی تخریبی دور میں ایک ایک مسجد اور ایک ایک دینی مدرسے کو تلاش کر کر کے مسمار کیا گیا یا غلّے کے گودام اور جانوروں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔

ایک عالم صاحب نے بتایا کہ ان کے گاؤں کی کل مسجدیں جن کی تعداد ۱۶ تھی، سرخ انقلابیوں نے ڈھا دیں جس کی وجہ سے نماز باجماعت اور دینی تعلیم وتدریس اور وعظ وارشاد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آدمی ایسی جگہ چھپ کر نماز پڑھنے پر مجبور ہوا جہاں اسے کوئی دیکھ نہ سکے، حالانکہ ہر جگہ جاسوس لگے رہتے تھے، اور فتنوں کی حکومت تھی۔

مسلمانوں کے خلاف بہت ساری قراردادیں پاس کی گئیں جن کے نتیجے میں عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی چھٹیاں منسوخ کر دی گئیں، مسلم ریسٹورنٹ بند کر دیئے گئے۔ مشرقی ترکستان (موجودہ سنکیانگ) میں مسلمانوں کی ترکی زبان کو، جسے عرف عام میں " الیغوری زبان" کہتے ہیں، عربی رسم الخط میں لکھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ "چینی" یا "لاطینی" رسم الخط اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں کو اپنے ملّی لباس کے استعمال سے روک دیا گیا اور سرکاری نیلے لباس کو بالجبر لاگو کیا گیا۔ ملّی تشخصات وروایات اختیار کرنے میں طرح طرح کی رکاوٹ اور تنگی پیدا کی گئی۔

فہمی ہویدی کے بیان کے مطابق " مسلمانوں کو جس چیز نے سب سے زیادہ مضطرب کیا وہ مسلمان میت کو چینی رسم ورواج کے مطابق نذر آتش کرنے کی تجویز تھی جس کے لئے یہ عذر لنگ تراشا گیا کہ مسلم قبرستانیں زمین کی بڑی مسافتیں گھیر لیتی ہیں جس سے زمین کے خاطر خواہ استثمار میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔"

تخریبی دور میں سرخ قوتوں نے مسلمانوں کو ان کے علاقوں سے، بالخصوص مشرقی ترکستان (سنکیانگ) سے کھدیڑ کر دوسرے مختلف علاقوں میں پھینک دیا اور ان کے علاقوں میں چینیوں کو آباد کیا۔

مسلمانوں پر ثقافتی انقلاب کے دس سال اس طرح گزرے کہ گزشتہ عہد ظلمت کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ان دس منحوس سالوں میں مسلمانوں کے خوابوں کے تمام شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ اعلان جمہوریت ۱۹۱۱ء کے بعد سے جتنے آرزوؤں کے قلعے انھوں نے تعمیر کئے تھے، سب ڈھا دیئے گئے ۱۹۴۹ء میں امیدوں کی وہ تمام راہیں مسدود کر دی گئیں جنھیں نام نہاد آزادی نے ان کے سامنے کھولی تھیں۔ ان کے سامنے تیرہ وتار مستقبل تھا جہاں دور دور تک لامتناہی رنج والم کے منحوس بادل پھیلے ہوئے تھے۔ ●●

(باقی آئندہ)

معلوماتِ علمیہ

پٹرولیم اور قدرتی توانائی گیس کے دو بڑے ماخذ ہیں۔ دنیا میں ان ہی دونوں کو زیادہ تر ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پٹرول کے ذخائر سعودی عرب، ایران، عراق، لیبیا، میکسیکو اور امریکہ میں بھی موجود ہیں۔ پاکستان میں تیل کی تلاش زور و شور سے جاری ہے اور آج کل پوٹھوار، اٹک، دھرنند بدین اور میال کے علاقوں میں تیل کی تلاش میں کامیابی ہوئی اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تیل ملنے کے قوی امکانات ہیں۔

پٹرولیم، لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہے۔ "پیٹرا" کے معنی چٹان اور "اویم" کے معنی تیل کے ہیں۔ لہٰذا اس کو ہم چٹانی تیل کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ ایک بُو دار مادّہ ہے جو کئی مرکبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر کاربن اور ہائیڈروجن کے مرکبات "ہائیڈرو کاربن" ہوتے ہیں۔ زمین کے اندر پٹرولیم کی ابتداء کے متعلق دو نظریات ہیں:

غیر نامیاتی نظریہ:۔ غیر نامیاتی نظریہ کو روسی سائنسدان مینڈ لیف نے پیش کیا۔ اس کے مطابق اندرونی گرم حصے میں پائے جانے والے چند دھاتی کاربائیڈوں سے بہت زیادہ دباؤ کے تحت پانی اور بھاپ کے عمل سے پٹرولیم پیدا ہوتا ہے لیکن یہ نظریہ زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔

نامیاتی نظریہ:۔ اس نظریہ کو اینگلر نے پیش کیا جس کا حاصل یہ کہ سمندری جانور لاکھوں سال تک مٹی اور گاد میں تپش اور دباؤ کے زیر اثر دفن رہے اور آہستہ آہستہ بیکٹیریا کے عمل سے پٹرولیم اور قدرتی گیس میں تبدیل ہو گئے جس کے اوپر غیر مسامدار چٹانیں آگئیں جس کی رکاوٹ سے گیس اور پٹرولیم زمین کی سطح پر نہ آسکے۔ اور زمین کے اندر ہی اندر رہ گئے۔ یہ نظریہ پٹرولیم کی تخلیق کے سلسلے میں زیادہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے بہت زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہے۔ پٹرولیم کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں جو نامیاتی مرکبات ہیں وہ جانوروں اور پودوں میں پائے جاتے ہیں۔

پٹرولیم عام طور سے زمین میں تین ہزار سے پانچ ہزار فٹ گہرائی تک پایا جاتا ہے۔ جہاں پٹرولیم کی موجودگی کا امکان ہوتا ہے وہاں بڑے بڑے برموں کے ذریعہ مناسب گہرائی تک کھدائی کی جاتی ہے پٹرولیم زیرزمین جھیل یا تالاب کی شکل میں نہیں پایا جاتا بلکہ مسامدار چٹانوں کی تہوں میں جذب ہوتا ہے۔ مسامدار اور غیر مسامدار چٹانوں کے درمیان ایک گنبد نما خم ہوتا ہے جو پٹرولیم اور قدرتی گیس سے پُر ہوتا ہے۔ چونکہ قدرتی گیس کا دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا کنوئیں سے گیس کے دباؤ کے تحت یہ بڑی تیزی سے اوپر آتا ہے۔ طاقتور پمپوں کے ذریعہ پٹرولیم کو ریفائنری میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں اس کی کثری کشید کے ذریعے مختلف مرکبات علیحدہ کر لئے جاتے ہیں مثلاً گیس، مٹی کا تیل، موبل آئل، پیرافین، لبریکیٹنگ آئل اور پٹرول وغیرہ۔

تیل کی تلاش وحصول میں حضرت انسان نے کارہائے نمایاں انجام دیئے اور توانائی کے اس پوشیدہ ذخیرے کو زمین کا سینہ چیر کر حاصل کیا لیکن اپنی ان تمام تر کوششوں اور مظاہروں کے لئے دوسروں کا محتاج ہے مثلاً پودے اور حیوانات وغیرہ لیکن کیا آپ اس پوشیدہ ننھی مخلوق سے بھی واقف ہیں جو تعریف اور لالچ کی فکر کئے بغیر انسان کے لئے توانائی کے ان گنت ذرائع فراہم کرنے میں مصروف عمل ہے۔ یہ وہی ننھی مخلوق ہے جس نے جنگلات کے لئے نائٹروجن فراہم کی، فضلے سے بایو گیس بنانے میں مدد دی، زمین کے اندر نامیاتی مادوں کو پٹرولیم میں تبدیل کرنے کا عمل بھی ان ہی ان ہی ننھے منے جانداروں کا مرہون منت ہے۔ ان ننھے منے جانداروں کو جو ہماری آنکھ سے اوجھل ہیں عام فہم الفاظ میں خردنامئے کہتے ہیں۔ ان میں بیکٹیریا، فنجائی، الجی، وائرس وغیرہ شامل ہیں۔ آیئے ہم پٹرولیم اور خردنامیوں کے تعلق کا جائزہ لیں۔

پٹرولیم کی تیاری میں بہت سارے عوامل یعنی عمل انگیز تابکار عناصر، حرارت اور دباؤ انفرادی اور اجتماعی طور پر زیرزمین سرگرم عمل ہوتے ہیں لیکن ان تمام عوامل پر بیکٹیریا کی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ فوقیت حاصل ہے۔ بعض بیکٹیریا ہوا کی موجودگی میں نمو پاتے ہیں جنھیں ہوا باش بیکٹریا اور ہوا کی غیر موجودگی میں نمو پانے والے بیکٹریا کو ناہوا باش کہتے ہیں۔ لہٰذا بیکٹریا کی تعمیری اور تخریبی سرگرمیوں کا انحصار بھی ماحول پر ہوتا ہے۔ پٹرولیم کی تیاری میں ناہوا باش جراثیم کو خاص اہمیت حاصل ہے پٹرولیم کی نامیاتی مادوں سے تیاری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان مادوں کے اطراف ناہوا باش

تخفیفی ماحول پیدا نہ ہو۔ لہٰذا انتہائی تخفیفی ماحول میں سطح آب کے نیچے بیکٹریا جانوروں اور پودوں کے باقیات کو پٹرولیم قسم کی اشیاء میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ بیکٹریا نامیاتی مادوں کو پٹرولیم میں بدلنے میں حصہ لینے کے علاوہ کئی دوسرے طریقوں سے اس کی نشو ونما میں بھی حصہ لیتے ہیں مثلاً ناہوا باش بیکٹریا، تخمیر کے نتیجے میں آزاد ہائیڈروجن نہیں بننے دیتے۔ آزاد ہائیڈروجن نہ بننے کی وجہ یہ ہے کہ ہائیڈروجن کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ساتھ مل کر میتھین گیس بناتی ہے۔ $CO_2 + 4H_2 \rightarrow CH_4 + 2H_2O$
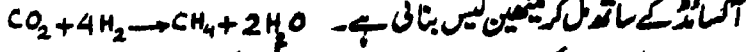
اس کے علاوہ کچھ بیکٹریا پیدا ہونے والی ہائیڈروجن کو سلفیٹ کے ساتھ تامل کے نتیجہ میں ہائیڈروجن سلفائیڈ میں تبدیل کر دیتے ہیں $SO_4 + 5H_2 \rightarrow H_2S + 4H_2O$
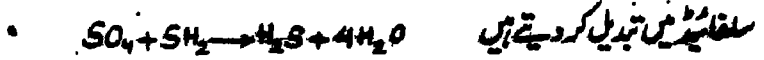
یہ تمام تعاملات نہ ہوا باش بیکٹریا کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں جو تخفیفی ماحول کا مظہر ہوتی ہیں۔

بیکٹریا نہ صرف پٹرول بنانے اور تخفیفی ماحول پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں بلکہ پٹرولیم کو اس کے ماخذ سے منتقل کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بیکٹریا کی سرگرمیوں کی وجہ سے کاربونیٹ اور نامیاتی ترشوں کا محلول بنتا ہے۔ یہ محلول چونے کے پتھر اور ڈولومائیٹ اور دوسری قسم کی چٹانوں میں گزرگاہیں اور مسام بناتا ہے جس سے پٹرولیم کی اخذ سے منتقلی عمل میں آتی ہے۔ تخلیقی مقام پر بیکٹریا کی سرگرمیوں کی وجہ سے گیس کا دباؤ پیدا ہونے سے بھی نامیاتی اجزاء کے باہر نکلنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بیکٹریا مصفی بناتے ہیں یہ مصفی ٹھوس سطحوں اور چٹانوں پر عمل کر کے ان سے تیل نکلنے میں مدد دیتے ہیں۔ خاص طور پر اندرونی مسامات کے تناؤ میں تبدیلی کی وجہ سے وہ دن دور نہیں جب تیل پیدا کرنے والی کمپنیاں ایسے بیکٹریا جینیاتی طریقے سے بنانے میں بہت جلد کامیاب ہو جائیں گی جو چٹانوں سے براہ راست تیل کشید کر سکیں۔

جانوروں کی غذا سے متعلق جدید تحقیق نے ایک نئی صنعت کی بنیاد ڈالی ہے جس میں خمیر کی بڑے پیمانے پر کاشت کر کے جانوروں کی غذا میں ایک سستے پروٹین منبع کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک بین الاقوامی تیل کمپنی نے خام تیل کو کنسیڈیڈا ایپولائٹیکا کی کاشت کے لئے استعمال کیا ہے جس سے دو فائدے حاصل ہوئے ہیں اس کی نمو سے موم خام تیل سے علیحدہ ہو جاتا ہے جس سے پٹرول کے حصول اور صفائی میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری جانب جانوروں کے لئے بڑی مقدار میں ایک خلوی پروٹین حاصل ہوتے ہیں جو توانائی کا مؤثر ذریعہ ہیں۔

جہاں تک خرد نامیوں سے تیل کی صفائی اور حصول کا معاملہ نہایت ہمت افزا ہے وہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ یہ ننھے منے نا سمجھ جاندار تیل ضائع کرنے کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ ان سے پٹرولیم میں پائے جانے والے ہائیڈرو کاربن کی تحلیل ایک قابل توجہ مسئلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سمندری پانی ہر سال ۱۲ ملین میٹرک ٹن پٹرولیم سے، تیل کے ٹینکوں کے رسنے، بندرگاہوں پر ان کی صفائی اور تیل بھرنے سے آلودہ ہو جاتا ہے۔ یہ آلودگی کچھ عرصے بعد پٹرولیم بالخصوص ان میں موجود ہائیڈرو کاربن کی خرد نامی تحلیل کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے نیز تیل صاف کرنے والی کمپنیوں کے آس پاس کی مٹی سے تیل کی آلودگی ختم ہونے سے بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اگر وہ خرد نامئے جو تیل کی تباہی کا باعث ہیں پٹرولیم کے ذخائر کو تباہ کر کے توانائی ضائع کرنے کا باعث بھی ہو سکتے ہیں۔ سوڈوموناس، کرومو بکٹریم، الکلیجیز، سارسینا اور فطروں کی اجناس ایپرجلس اور مونیلیا سے تعلق رکھنے والی کئی انواع گیسولین کی تحلیل کا باعث ہوتی ہے۔ (سید اقبال عالم)

کہکشاں کا ایک ستارہ

سورج

ہمارا سورج کہکشاں کا ایک ستارہ ہے۔ تمام اجرام فلکی میں سورج ہمیں سب سے زیادہ گرم اور چمکدار معلوم ہوتا ہے کیونکہ سورج ہماری زمین کا قریب ترین پڑوسی ستارہ ہے۔ اس کے اس قدر گرم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہم سے صرف ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہماری زمین کا دار و مدار ہر طرح سے سورج پر ہے۔ اگر یہ سورج سرد ہو جائے تو زمین بھی مردہ ہو جائے گی۔ سورج ہمیں حرارت اور روشنی بخشتا ہے ہماری فصلیں اگاتا اور پکاتا ہے، ہمارے موسموں میں خوشگوار تبدیلیاں لاتا ہے اور بارش اسی کی وجہ سے برستی ہے۔ پہاڑوں کی برف پگھل کر دریاؤں میں پانی چھوڑتی ہے۔ گویا ہم ہر طرح سے سورج کے مرہون منت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم لوگ اس کی پوجا کرتے تھے۔ سورج کا قطر ۸۶۴۰۰۰ میل ہے یعنی زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور اس کی کمیت زمین کی کمیت سے ۳۳۳۰۰۰ گنی ہے اور سورج کا حجم ہماری زمین کے حجم کا ۱۳۳۰ گنا ہے اور اس کی اوسط کثافت پانی کی کثافت کی ۱۴۱ گنی ہے، اور یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے

سورج کی کشش ثقل زمین کے مقابلے میں ۲۸ گنی زیادہ ہے یعنی زمین پر ہمارا وزن ۱۰۰ پونڈ ہے تو سورج پر ۲۸۰۰ پونڈ ہوگا۔ سورج ایک نہایت گرم کرہ ہے اور اس کی سطح کا درجۂ حرارت دس ہزار ڈگری سے تیرہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ تک بتایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی زبردست حرارت پر کوئی بھی شے ٹھوس حالت میں موجود نہیں ہو سکتی۔ سورج کا سرمایہ حیات ہائیڈروجن گیس ہے اور سورج کا اندرونی زبردست دباؤ اس گیس کے ایٹموں کو توڑ کر توانائی پیدا کرتا ہے جو حرارت اور روشنی کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق سورج میں ہر سیکنڈ چالیس لاکھ ٹن ہائیڈروجن توانائی میں تبدیل ہوتی ہے۔ سورج کی سطح کا ہر مربع گز ٹکڑا ہر سیکنڈ ستر ہزار ہارس پاور توانائی خارج کرتا ہے ہماری زمین اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے اور درمیان میں ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کا فاصلہ بھی حائل ہے اس لئے سورج سے خارج ہونے والی توانائی کا نہایت ہی قلیل حصہ اس کو ملتا ہے۔ اس کے باوجود دن کے وقت ہماری زمین کے ہر ایک مربع میل حصے پر ہر سیکنڈ ۴۶۹۰۰۰۰ ہارس پاور کے بقدر توانائی پڑی رہتی ہے جبکہ انسان نے شروع سے اب تک اپنی تمام مشینوں اور ذرائع سے اس قدر توانائی پیدا نہیں کی۔

عظیم سائنسداں گیلیلیو نے جب پہلی مرتبہ دوربین سے سورج کو دیکھا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس میں کئی سیارہ دھبّے نظر آرہے تھے ان دھبّوں کی مدد سے گیلیلیو نے یہ نئی بات دریافت کی تھی کہ سورج اپنے محور پر مغرب سے مشرق کی طرف گھومتا ہے۔ وہ جتنے عرصے میں ایک گردش پوری کرتا ہے وہ ہمارے ۲۵ دن کے برابر ہے۔ چونکہ سورج ٹھوس نہیں ہے اس لئے اس کے مختلف حصے مختلف مدت میں ایک چکر مکمل کرتے ہیں اور وہ دھبّے جو سورج کی سطح پر نظر آتے ہیں انھیں کرہ نور کہتے ہیں۔ یہی وہ حصہ ہے جس سے روشنی آتی ہے۔ اس حصے کی تصویر لینے سے ہمیں تصویر میں دانے دانے سے نظر آتے ہیں لیکن ہر دانے کا قطر سیکڑوں میل ہے یہ دانے اصل میں گیس کے وہ زبردست بادل ہیں جو سورج کی سطح پر مستقل طور پر اٹھتے رہتے ہیں بلکہ فوارے کی طرح پھوٹتے رہتے ہیں اور ہماری زمین سے کئی گنا زیادہ بڑے ہیں۔ اس کرہ نور کی چمک یکساں نہیں ہے بلکہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہے۔ کرہ نور کے اوپر گرم گیسوں کی ایک تہہ نظر آتی ہے جس کی گہرائی تقریباً چھ ہزار میل ہے۔ اس میں کیلشیم، ہلیم، ہائیڈروجن اور دوسرے چند عناصر ملی جلی حالت میں ملتے ہیں۔ اس تہہ کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس سے نہایت گرم گیسوں کے عظیم شعلے بلند ہوتے ہیں جو خاص طور پر اس وقت نمایاں ہو جاتے ہیں جب سورج گرہن ہوتا ہے۔ ان شعلوں کی رفتار دو سو میل فی سیکنڈ تک

ہوتی ہے۔ ایک شعلہ ایسا بھی دیکھا جا چکا ہے جس کی بلندی دس لاکھ میل سے زیادہ تھی۔ گیسوں کے یہ عظیم شعلے شمسی طوفان کا پتہ دیتے ہیں۔ سورج پر اکثر زبردست طوفان آتے رہتے ہیں اور جب کبھی یہ طوفان زیادہ تعداد میں آتے ہیں تو ہماری زمین بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی کیونکہ زمین بھی سورج کا ہی ایک سیارہ ہے سورج کا اپنا ایک مقناطیسی اثر ہے اور چونکہ وہ زمین کے مقابلے میں بہت بڑا ہے اس لئے زمین کا مقناطیسی میدان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بعض سائنسدانوں کا خیال ہے کہ سورج کی سطح پر ظاہر ہونے والے دھبے ٹورنیڈو کی شکل کے طوفان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ سورج کے اندر گیسوں کے پہاڑ مینار جیسے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میناروں کے بالائی سرے ہمیں دھبوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھبے گیارہ سال میں اپنا چکر پورا کرتے ہیں یعنی ہر گیارہ سال کے بعد وہ سب سے زیادہ تعداد میں نظر آتے ہیں پھر ان کی تعداد کم ہوتی چلی جاتی ہے سب سے کم تعداد حاصل کرنے کے بعد وہ پھر بڑھتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ سورج سے تقریباً تین لاکھ میل کی بلندی پر نہایت لطیف گیسوں کا ایک غلاف اسکے چاروں طرف لپٹا ہوا ہے جسے سائنس داں "ہالہ" کہتے ہیں اس کا رنگ زردی مائل سفید ہے۔ جب سورج کے دھبے زیادہ ہوتے ہیں تو یہ ہالہ بھی پھیل کر وسعت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا تعلق سورج کی مقناطیسی خصوصیات سے ہے۔

سائنس داں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سورج کا مقناطیسی میدان زمین کے مقناطیسی میدان کے مقابلے میں کم از کم سو گنا زیادہ قوی ہے۔ سورج کے چاروں طرف پھیلا ہوا یہ ہالہ صرف اسی وقت نظر آتا ہے جب سورج گرہن ہوتا ہے۔ اب سائنسدانوں نے ایک ایسا آلہ بھی بنا لیا ہے جو سورج کو مصنوعی طور پر گرہن کر دیتا ہے ہیئت داں انتظار میں رہتے ہیں کہ کب پورا سورج گرہن ہو اور وہ اس کا مشاہدہ کریں لیکن یہ اتفاق برسوں میں پیش آتا ہے۔ مصنوعی گرہن پیدا کرنے کے لئے سائنسداں جو آلہ استعمال کرتے ہیں اس کا نام کورونوگراف ہے۔ اس کی مدد سے نہ صرف سورج کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے دھبوں اور اس سے اٹھنے والے گیسی میناروں اور طوفانوں کی تصاویر بھی اتاری جا سکتی ہیں۔ ہیئت داں سورج کے دھبوں کا مشاہدہ اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اس سے دوسرے سیاروں کی بناوٹ اور ان کے حالات معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ••

(ماخوذ)

الرشاد کی ڈاک

۹ر جنوری ۱۹۸۶ء

محترمی ومکرمی، حفظکم اللہ سبحانہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ "الرشاد" میں مسئلہ کفاءت پر آپ کا مضمون شائع ہوا ہے ہمیں اس کی سخت ضرورت ہے۔ آپ دونوں شمارے بھیج دیں یعنی دونوں قسطیں۔ انشاءاللہ ان کی قیمت ارسال کر دوں گا۔

وقت کے اہم سماجی مسئلہ پر آپ نے روشنی ڈال کر رہنمائی کا عظیم فریضہ انجام دیا ہے اور غالباً سبقت آپ ہی کو حاصل ہے اور کسی کی اس جانب توجہ نہیں ہوئی۔

دیگر اہم سماجی مسائل پر بھی اگر آپ روشنی، آئندہ شماروں میں ڈالیں تو ملت آپ کا احسان نہ بھولے گی، اور یہ وقت کا تقاضا بھی ہے۔

(۱) بیوہ اور مطلقات کی شادیوں کی اہمیت وضرورت (۲) جہیز (۳) مہر کی ادائیگی (۴) لڑکی کا وراثت میں حصہ اور حصہ نہ دینے کی روش (۵) تاخیر سے شادی، مسلم سماج کی ایک برائی (۶) مسلم لڑکیوں کے لئے اعلیٰ دینی تعلیم کی ضرورت۔

توقع ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہ فرمائیں گے۔

طالب دعا: امین عثمانی، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳

۲۳ر دسمبر ۱۹۸۷ء

محترم مجیب اللہ ندوی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ میرا یہ خط آپ کو نئے سال میں ملے گا، اس لئے نئے سال کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا رسالہ "الرشاد" کے چند شمارے میرٹھ میں ہاتھ آئے۔ پڑھ کر اتنی مسرت ہوئی جیسا کہ مجھے اللہ کی طرف سے وہ دولت مل گئی جسکی ایک مسلمان کو آرزو ہوتی ہے۔

میرے پاس ایسے الفاظ نہیں جن سے میں "الرشاد" میں "رشحات" کی تعریف کروں۔ مجھے آپ کے مضمون "مسلمانوں نے سیکولر جماعتوں میں جاکر کیا کھویا کیا پایا؟" کی یہ عبارت بہت پسند آئی:

"ہمیں اب اپنی دینی وحدت کے ساتھ ایک الگ سیاسی وحدت بھی قائم کرنی چاہئے۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں ہم پر فرقہ پرستی اور تنگ نظری کو بڑھاوا دینے کا الزام لگایا جائے گا، علیحدگی پسندی کا جرم عائد کیا جائے گا اور بہت سے خطرات سامنے لائے جائیں گے، لیکن اگر ہم کو ہندوستان میں اپنی امتیازی حیثیت کو باقی رکھنا ہے تو یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔"

کاش ہمارے مفاد پرست علماء اور راہنما اس عبارت پر غور و فکر کر کے اپنے ذاتی مفاد کے مقابلے میں ملی مفاد کو ترجیح دیتے تو واقعی ہماری یہ بدقسمت قوم بام عروج پر پہنچتی۔

مولانا صاحب! میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ مجھے "الرشاد" جنوری ۱۹۸۸ء سے باقاعدہ طور پر ملنا چاہئے اور اگر اس کے پرانے شمارے بھی آپ کے دفتر میں موجود ہوں تو مجھے ان کے بارے میں بھی پوری انفارمیشن ملنی چاہئے۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

والسلام

این۔ اے رفیع آبادی۔ کشمیر

۱۳ر فروری ۱۹۸۸ء

مکرم و محترم جناب حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب زید مجدہم، ناظم جامعۃ الرشاد و مدیر مجلہ الرشاد اعظم گڑھ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مجلہ "الرشاد" کے مطالعہ کا شرف یوں تو بہت دنوں سے ہے البتہ اب اس کے ہر شمارہ کا شدت سے انتظار رہنے لگا ہے۔ آپ کے "رشحات" عموماً مسلمانوں کے قومی، ملی اور دینی و تعلیمی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ امور ایسے ہیں جو ہر مسلمان کے لئے قابل توجہ ہیں۔ آپ کی جولانی طبع اور زور قلم، پھر اس پر آپ کا خلوص "رشحات" کو دوآتشہ بنا دیتا ہے۔

ضرورت ہے کہ آپ جیسی فکر اور لوگوں میں پیدا ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ جامعۃ الرشاد اور

اسکی ملی، تعلیمی کوششیں اور بارآور ہوں۔ مجلہ "الرشاد" کے جواہر پاروں سے عوام اور خواص سب مستفید ہوں۔
و السلام۔ ظہیر انوار، دارالعلوم الاسلامیہ، بستی۔

---

۱۳ فروری ۱۹۸۶ء

محترم جناب مولانا حبیب اللہ ندوی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اس ماہ "الرشاد" کے شمارہ میں مولانا وحیدالدین خان پر آپ نے عنایت فرمائی ہے اور موصوف کے ذاتی کردار اور ان کی تحریر و تقریر کے مواد میں غیر ہم آہنگی کے سلسلہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، کیا دور حاضر میں ملت اسلامیۂ ہند کے مشہور و معروف بعض دیگر علماء و مشائخ پر بھی یہ منطبق نہیں ہے؟ مسلمانوں میں فکر و عمل میں جو بھی انتشار ہے وہ بد کردار امراء و حکام اور دنیا دار علماء ہی کی دین ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اسلام نے اپنی دعوت کے عہد آغاز میں فکری و عملی انتشار کی شکار انسانیت کو وحدت و اخوت کی لڑی میں پرو دیا تھا اور اس حیرت انگیز تبدیلی کو صراحتاً ایک نعمت قرار دیا تھا۔

"واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فألف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا"

آج بیسویں صدی آتے آتے ہم مسلمان اس نعمت سے پورے طور پر محروم ہو چکے ہیں۔ ہم مسلمان صرف بیرونی جارحیت اور انتقام ہی کا نشانہ نہیں ہیں بلکہ اندرونی طور پر بھی بالکل ٹوٹ اور بکھر چکے ہیں۔ ہم شریعت کے تابع فرمان نہیں ہیں۔ بلکہ ہم نے خود شریعت کو اپنا تابع فرمان بنا لیا ہے جس کے نتائج مختلف صورتوں میں بھگت رہے ہیں پھر بھی ہماری آنکھ نہیں کھلتی۔ علمائے ملت اسلامیۂ ہند شہرت، دولت اور اقتدار کی موجودہ دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہ خود کو نائب رسولؐ کہتے اور کہلاتے ہیں لیکن رسول پاک کی مکی و مدنی زندگی کے ابتلاء و آزمائش میں رسولؐ اور انکے اصحاب باصفا کے کردار کو عملاً اپنے لئے اسوہ قرار نہیں دے رہے ہیں۔ البتہ بلا کسی محنت کے وہ نتیجہ ضرور حاصل کر لینا چاہتے ہیں جو اُن حضرات کو جہد مسلسل کے نتیجہ میں حاصل ہو گیا تھا۔ اس ماہ کے رشحات میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے محرر سطور کو پورا اتفاق ہے۔ مسلمانوں کو علم و عمل کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کئے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ کرنے کا اصل کام یہی ہے لیکن نائبین رسول اس محاذ پر کام کرنا اپنے لئے کسر شان سمجھتے ہیں۔

ان کا اپنا گھر اور محلہ جہالت و ناخواندگی کی تاریکیوں میں غرق ہوتا جا رہا ہے اور یہ حوصلہ مند لوگ پوری دنیا میں علم و معرفت کی شمع جلانے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ کوئی امریکہ میں تبلیغ کا مرکز قائم کر رہا ہے تو کوئی ہالینڈ میں، کوئی ایران میں تو کوئی توران میں، حتی کہ اب ہم اتنے حوصلہ مند ہو گئے ہیں کہ مرکز اسلام پر بھی قابض و دخیل ہو جانا چاہتے ہیں۔ شاید دور حاضر میں

باقی ص ۱۸ پر

کوائف جامعۃ الرشاد

جامعۃ الرشاد محض ایک عربی درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ وسیع المقاصد ادارہ ہے، یہاں دینی علوم کی معیاری اور جدید علوم کی بقدر ضرورت تعلیم کے ساتھ بچوں میں زیادہ سے زیادہ علم کا ذوق عمل کا پرشور جذبہ اور ملی احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، طلبہ میں تقریر و تحریر کا سلیقہ پیدا کرنے اور ان کی بہترین سوئی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے "ندوۃ الطلبۃ" کے نام سے باضابطہ ان کی ایک انجمن ہے اور اس کے ماتحت ان کا ایک دارالمطالعہ ہے جس کا انتظام جامعہ کی نگرانی میں وہ خود کرتے ہیں اور اس طرح مطالعہ کے ساتھ ساتھ انتظامی سلیقہ بھی سیکھتے ہیں

یوں تو ہر جمعرات کو طلبہ کی خطابت و صحافت کی بزمیں بطور مشق و تمرین منعقد ہوا کرتی ہیں لیکن سال میں ایک مرتبہ انعامی مقابلہ کی ایک مجلس منعقد ہوتی ہے۔

طلبہ کی یہ سرگرمیاں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک اردو میں دوسرے عربی میں، اس ضمن میں طلبہ کو مناسب مشورے اور ہدایات دینے کیلئے عربی و اردو زبان و ادب کا اچھا علم و ذوق رکھنے والے اساتذہ مقرر ہوتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ امسال کے انعامی مقابلہ میں طلبہ نے بہترین صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے اس تقابلی پروگرام کی مختصر روداد درج ذیل ہے:

اردو کے انعامی مقابلہ میں کل ۳۹ طلبہ شریک ہوئے اور عربی میں کل ۳۷ طلبہ۔ ہر طالبعلم کو حوصلہ افزائی کے لئے کچھ نہ کچھ انعام دیا گیا۔ اول پوزیشن حاصل کرنیوالے طلبہ کو سو روپئے سے زائد قیمت کے، دوسری پوزیشن حاصل کرنیوالے کو پچہتر روپئے سے زائد قیمت کے اور تیسری پوزیشن حاصل کرنیوالوں کو پچاس روپئے سے زائد قیمت کے انعامات بشکل کتب و اشیاء ضروریہ تقسیم کئے گئے۔

حسب ذیل طلبہ نے امتیازی نمبر حاصل کیے:

اُردو (الف) علیا:

(۱) محمد حبیب الرحمان نیپالی متعلم عربی پنجم - اوّل (۲) محمد حسن کشمیری متعلم عربی چہارم - دوم
(۳) محمد محی الدین نیپالی متعلم عربی چہارم - سوم (۴) محمد اخلاص بنگالی متعلم عربی پنجم - چہارم

(ب) وسطی:

(۱) محمد الیاس بہاری عربی سوم - اوّل (۲) عبدالناصر گورکھپوری عربی دوم - دوم
(۳) محمد مشتاق گیاوی عربی دوم - سوم (۴) محمد مبارک حسین دیوریاوی چہارم

(ج) سفلی:

(۱) محمد نعیم اختر بہاری اعدادیہ - اوّل (۲) محمد اسامہ اعظمی اعدادیہ - دوم
(۳) محمد عمر اعظمی درجہ عربی اول سوم (۴) محمد ناظر جمال اعظمی چہارم

عربی (الف) علیا:

(۱) محمد محی الدین عربی چہارم اوّل (۲) عبدالودود نیپالی پنجم - دوم
(۳) محمد خورشید عالم بھاگلپوری پنجم سوم (۴) حیدر علی نیپالی چہارم

(ب) وسطی:

(۱) محمد الیاس عربی سوم اوّل (۲) عبدالناصر دوم
(۳) محمد نسیم احمد سوم (۴) محمد آصف محبوب جونپوری چہارم
(۵) محمد قسیم الدین درجہ عربی سوم - چہارم

(ج) سفلی:

(۱) ظفر احمد بستوی درجہ عربی اول - اوّل (۲) محمد اسامہ اعدادیہ بھوپالی دوم
(۳) محمد نعیم اختر اعدادیہ سوم (۴) عبدالرزاق چہارم

نئی کتابیں

بدائع الصنائع جلد ہفتم مترجم | کتابت وطباعت روشن وپاکیزہ، کاغذ نہایت عمدہ، تقطیع کلاں، ضخامت ۸۹۵ صفحات، قیمت مجلد دو سو بیس روپے، طبع اول، جنوری ۱۹۸۷ء، ناشر مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ، لاہور پاکستان:۔

زیر نظر کتاب علامہ علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ علیہ الرحمۃ کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ جناب پروفیسر خاں محمد چاولہ صاحب نے کیا ہے۔ فقہ اسلامی کے لٹریچر میں اس کتاب کی اہمیت وحیثیت اور مصنف موصوفؒ کی شخصیت سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ علامہ نے پوری کتاب میں مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل کا بھی ذکر کیا ہے اور ہر اصولی مسئلہ کو بڑی حد تک کتاب وسنت سے مربوط کر کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور موضوعاتی ترتیب کے اعتبار سے فقہ حنفی کی دوسری تمام کتابوں میں یہ ممتاز ہے۔

مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور اپنے قیام کے دن سے اسلامی قانون کے مختلف گوشوں پر درجنوں اعلیٰ درجہ کی تحقیقی کتابیں اب تک پیش کر چکا ہے جو اسلام میں قانون سازی کے میدان میں نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً:

اسلامی حدود، بلا سود بنک کاری، نظام عشر وزکوٰۃ کی برکات، اسلامی حکومت میں اقلیتیں، نفاذ شریعت میں تدریج وغیرہ وغیرہ۔

زیر تبصرہ کتاب کا ترجمہ آخری جلد سے شروع کیا گیا ہے جو مسائل ذیل پر مشتمل ہے:

قاضی اور اسکے فرائض، قانون تقسیم، شرعی حدود اور تعزیرات، قانون سرقہ، قانون رہزنی، قانون جہاد، قانون غصب، قانون ممانعت وحبس، قانون جبر واکراہ، قانون فوجداری، قانون خنثیٰ، قانون وصیت، قانون قرض۔

اگر تحشیہ وتعلیقات کا کچھ اور اہتمام کیا گیا ہوتا تو اس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ مترجم صاحب اور اصحاب مرکز خاص طور پر اسکے ڈائرکٹر جناب سید عبد المتین صاحب ہاشمی اس بہترین کاوش کیلئے

اہلِ علم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔
یہ ترجمہ علماء، وکلاء، قاضی اور جج حضرات کیلئے ایک نادر تحفہ ہے۔ کم پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے بہت کچھ استفادہ کرسکتے ہیں۔

حُلیۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کاغذ عمدہ، کتابت روشن نستعلیق، طباعت پاکیزہ، صفحات ۴۲، تقطیع متوسط، قیمت مبلغ چھ روپے
ناشر مکتبۃ الفیض مدرسہ کرمتیہ دارالفیض جلالپور فیض آباد (یو۔پی)، ٹائیٹل رنگین مگر پاکیزہ۔

کتاب کا پورا نام "حُلیۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (منظوم) احادیث کی روشنی میں" ہے۔
یہ منظوم مجموعہ جناب عبدالسلام مضطر ہنسوری کی کاوش فکر کا بہترین ثمرہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حُلیہ، سراپا اور آپ کے شمائل و خصائل پر عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی، مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قلبی تعلق اور والہانہ وابستگی ہے اور آپ کی عقیدت و محبت جس طرح ایک ایک رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی ہے، اس کا فطری اثر ہے کہ آپ کے اوصاف و احوال، آپ کی وضع قطع، آپ کا سراپا، آپ کا حلیہ بار بار بیان کرنے میں روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔
جناب مضطر ہنسوری نے احادیث کی روشنی میں حلیہ مبارکہ کو نظم کا روپ دیا ہے، یہ کوئی آسان و ہموار میدان نہیں ہے، یہ وہ میدان ہے جہاں نثر کا اشہب قلم بھی ہار مان لیتا ہے، مگر یہ مضطر صاحب کا یقیناً شاعرانہ کمال اور ذات گرامی سے ان کا والہانہ تعلق ہے کہ ان کی راہ کی دشواریاں دور ہوگئیں اور ماشاءاللہ وہ فاتحانہ گذر گئے، ملاحظہ ہو

وجاہت بھی فخامت بھی جمالِ دلبرانہ بھی
جلالِ حسن بھی اور عظمتِ پیغمبرانہ بھی
اچانک دیکھ لیتا جب کوئی مرعوب ہوجاتا
مگر اللہ کا محبوب پھر محبوب ہوجاتا

کبھی جب گفتگو فرماتے تھے موتی پروتے تھے
کہ سب الفاظ واضح، غیر مبہم، صاف ہوتے تھے
کلام ایسا مکمل جامع و پُر معنیٰ حقانی
نہ بالکل مختصر، مغلق، ادھورا ہی، نہ طولانی

منصور صاحب ہنسوری کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا انکی اس قیمتی کاوش نکر کو قبول فرمائے اور اسے نفع بخش بنائے۔ کتاب ہر خاص وعام کیلئے یکساں مفید و قابل مطالعہ ہے۔

اسلامی تعلیم ۴ؔ

کاغذ، کتابت، طباعت غنیمت، تقطیع خورد، ضخامت ۲۲ صفحات
ناشر دارالعلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، مقام دڈا کخانہ کنتھاریہ، تعلقہ بھروچ گجرات
قیمت ندارد۔

کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، یہ غالباً دوسرا اڈیشن ہے جیسا کہ عرض ناشر سے محسوس ہوتا ہے۔

ایک جامع اور آسان نصاب اردو کا آسان قاعدہ اور اسلامی تعلیم کے نام سے پانچ نمبرات پر مشتمل تیار کیا گیا جسمیں بچوں کی استعداد وقت کے تقاضوں اور عبارات کی آسانی کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے جسکا پہلا اڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اور بہت ہی قلیل مدت میں قرب وجوار اور دور دراز کے مکاتب میں اپنا لیا گیا، الحمد للہ علیٰ ذلک

اس کے مضامین کی فہرست یہ ہے:

(۱) اسلامی عقائد (۲) مسائل وعبادات (۳) سیرت پاک (۴) اسلامی اخلاق (۵) اسلامی تہذیب (۶) ہدیۂ سلام۔

زبان کی بعض خامیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے کتاب اچھی ہے، گجرات کے مکاتب اسلامیہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

اسلامی تعلیم کے نام سے آج سے بیس برس پہلے چار حصوں میں ایک جامع دینیات کی کتاب جامعۃ الرشاد کے شعبۂ دار التالیف کی طرف سے بھی شائع ہو چکی ہے جو سیکڑوں مکاتب میں داخل ہے یہ کتاب محترم مولانا مجیب اللہ ندوی کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی [illegible] پاس کرنیکے [illegible] یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے، کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہوچکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے

اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں:

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت و جلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دو درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ

تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے

ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درس گاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہیئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہوجاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ماہ شوال سے داخلہ شروع ہوجاتا ہے اور ۲۰ شوال تک ختم ہوجاتا ہے۔

دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ یوپی

اسلامی فقہ (اوّل و دوم)

مرتبہ:- حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب !

دو برس سے اصلی اسلامی فقہ بازار سے غائب تھی۔ بحمد اللہ اب اسلامی فقہ کا پانچواں شاندار ایڈیشن تاج کمپنی نئی دلی سے شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے۔

مصنف موصوف نے اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس سے اب یہ بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ شروع میں اسلامی عقائد کے باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح معاشرتی و معاملاتی مسائل والے حصہ میں سیکڑوں جدید مسائل مثلاً خون چڑھانا، پوسٹ مارٹم، نسبندی اور ٹلی زلوہ، مصنوعی اعضا وغیرہ کے احکام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں دیوانی اور فوجداری کے بقیہ ابواب مثلاً دعویٰ، قضا و شہادت، حدود و قصاص، احکام سلطانیہ اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گویا شریعت اسلامی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ پڑ گئی ہو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں اس سے زیادہ مفصل کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ تمام اہم مسائل میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بھی متن یا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ شریعت اسلامی کی وسعت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اسلئے دو حصے میں کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف عام پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مفید ہے بلکہ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بھی ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ کتاب ہر گھر اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے پہلے اسلامی فقہ کے چار ایڈیشن مکتبہ الحسنات سے شائع ہو چکے ہیں، مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مکتبہ الحسنات کے موجودہ مالک کی بے مہری کی وجہ سے ان سے دو برس پہلے اسلامی فقہ کا معاملہ ختم کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں انہوں نے عبارت کا تھوڑا ردوبدل کر کے قانون و اخلاق کے سارے حدود توڑ کر مولانا موصوف کی اسلامی فقہ کو اسی نام سے ایک غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کر دیا، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ بالکل نمایاں ہے۔ یہ فرضی مثل "نقل را چہ عقل" کے تحت مسائل میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر بیٹھے ہیں۔

بہرحال جس اصلی اسلامی فقہ کا لوگوں کو انتظار تھا اب وہ چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔

ملنے کے پتے } تاج کمپنی، ۳۱۵۱، ترکمان گیٹ، نئی دلی ....

} دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱، یوپی | منیجر دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد،

سالانہ چندہ غیر ممالک سے پندرہ ڈالر امریکی 15/- $	جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان ماہنامہ جامعۃ الرشاد	سالانہ چندہ ہندوستان سے -/۳۰ خصوصی معاون -/۱۰۰ قیمت فی پرچہ -/۳

شمارہ ۸۰ — مارچ ۱۹۸۸ء مطابق رجب ۱۴۰۸ھ — جلد ۱۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل فہیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رشحات

پچھلے مہینے کے رشحات میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ حمید اللہ بیگ جیسے گورنمنٹ کے وفادار مسلمان اور کچھ دوسرے لوگ بھی یہ اعتراف کرنے لگے ہیں کہ چالیس برس کے اندر مسلمانوں کو انصاف نہیں مل سکا ہے۔ حکومتیں تو انصاف کے تقاضے سے نہیں بلکہ اپنے سیاسی مصالح کے تحت کسی طبقہ کو اٹھاتی اور کسی کو گراتی ہیں، کسی کے ساتھ انصاف کرتی ہیں اور کسی کے ساتھ ظلم روا رکھتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری عدالتیں جن کا مقصد ہی انصاف دینا اور دلانا ہے، وہ بھی انصاف دینے کے بجائے انصاف کا خون کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس وقت ایوان حکومت ہو یا ایوان عدالت، سب مسلمانوں کے حق میں فرقہ پرست طاقتوں کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں اور خاص طور پر مسلم پرسنل لا جسکی چالیس برس کے اندر تکا بوٹی کر دی گئی ہے مگر اس کے باوجود ابھی تک تسکین نہیں ہوئی ہے اب بھی اس کا جو کچھ رہا سہا ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی سب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ہمیں عدلت عالیہ کا تجربہ ہو چکا ہے۔ شاہ بانو کے کیس ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۸۸ تک سیکڑوں فیصلے ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالت عالیہ تک ایسے ہو چکے ہیں جنھیں کسی طرح انصاف نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مسلم پرسنل لا کو مجروح کرنے والے فیصلے ہیں۔ ابھی حال میں ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے ۶ر جنوری ۱۹۸۸ء اور علی گڑھ کی عدالت نے ۲۴ر فروری کے دو طلاق کے مقدموں میں جو فیصلے دیئے ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں جس کو عام حضرات عین انصاف قرار دے کر خوشی کے نقارے بجا رہے ہیں لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایک دوسری پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔ جہاں تک مہر کا تعلق ہے وہ جو کچھ مقرر ہے اس کا دلانا تو صحیح ہے لیکن رخصتی جوڑا جسے قرآن پاک نے متاع کہا ہے اور عدت کے خرچ کے لئے ۸۶ ہزار کی رقم کا دلانا انتہائی ظلم اور قرآن پاک کے منشاء اور ائمہ فقہ و حدیث کے تعامل کے بالکل خلاف ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے میں جج صاحبان کو علماء سے رجوع کرنا چاہئے تھا لیکن ہم نے خود پارلیمنٹ کو ۱۲۵ سے سلسلہ میں تفصیل کرنے کا اختیار دے دیا اس لئے جج صاحبان کو فیصلہ کرنے میں کسی شرعی تحقیق کی ضرورت

محسوس نہیں ہوتی حالانکہ بعض فقہار نے اس میں مرد اور عورت دونوں کی حیثیت کا لحاظ کیا ہے لیکن اکثر فقہار نے نان نفقہ اور متاع کے دینے میں صرف مرد کی حیثیت کا لحاظ کیا ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ - (بقرہ)
خوش حال پر اس کی خوش حالی کے اعتبار سے اور تنگدست پر اسکی تنگدستی کے اعتبار سے متاع ہے۔

اس سلسلہ میں جو لوگ مہر کے ساتھ متاع کے واجب ہونے کے قائل ہیں ان کے جواب میں امام شعبی نے یہ رائے دی ہے۔

واللہ مارأیت احداً حبس فیھا (ای فی المتعہ) واللہ لوکانت واجبۃً لحبس فیھا القضاۃ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۶)
خدا کی قسم میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جس کو متاع نہ دینے میں قید کیا گیا ہو۔ اگر یہ واجب ہوتا تو ہمارے قضاۃ ضرور ایسے شخص کو قید کی سزا دیتے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور امام شافعیؒ واجب، لیکن کوئی امام ۳۰ درہم سے زیادہ یا مہر مثل کے نصف سے زیادہ متاع دینے کا قائل نہیں ہے۔ اگرچہ لوگوں نے اپنی خوشی سے زیادہ دیا ہے تو وہ ان کا حسن سلوک ہے۔ اسے قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ غرض یہ کہ اس کی کمی بیشی میں فقہا کا اختلاف ہے اس لئے یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہوا۔ اس میں فیصلہ کے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ عورت مرد کس مسلک کے ماننے والے ہیں۔ احناف کے نزدیک خلوت صحیحہ سے پہلے اگر طلاق ہو جائے تو متاع نہیں ہے اور جس صورت متاع ہے اس میں اپنی حیثیت کے مطابق ایک جوڑا کپڑا ہے۔ اسی طرح جہیز میں دیئے جانے والے سامانوں کی دو حیثیت ہوتی ہے۔ کچھ تو لڑکی کے گھر والے استعمال کی چیزیں داماد کو بطور تحفہ دیتے ہیں مثلاً گھڑی ریڈیو، کپڑے اور کچھ اور استعمالی چیزیں اور کچھ لڑکی کے استعمال کے لئے مخصوص ہوتی ہیں جیسے زیور، کپڑے وغیرہ اور کچھ چیزیں مشترک استعمال کی ہوتی ہیں، ان کی واپسی اور عدم واپسی کا تعلق عرف پر ہے۔ عام طور پر طلاق کے بعد عرف یہ ہے کہ جو چیزیں جس حال میں موجود ہیں وہ واپس کر دی جاتی ہیں اور جو چیزیں دونوں کے لئے مخصوص استعمال کی ہوتی ہیں ان کی واپسی نہیں ہوتی اور جو چیزیں مشترک استعمال کی ہیں وہ جس حال میں ہوتی ہیں واپس کر دی جاتی ہیں ان سامانوں کی نئی قیمت لگا کر واپس کرانا شریعت کے منشار کے خلاف ہے لیکن ایک مقدمہ میں جہیز کے سامانوں کے لئے دو لاکھ اور ایک سو ۶۵ ہزار ان سامانوں کی قیمت لگا کر دلانا سراسر ظلم ہے اور شریعت کے منشار کے خلاف ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چالیس برس سے مسلمانوں کے ساتھ یہ تماشہ ہو رہا ہے مگر ہم کو حقیقی طور پر اس کا احساس نہیں ہو سکا ہے کہ ملی حیثیت سے ہم کہاں سے کہاں پہنچا دیئے گئے ہیں اگر ہم کو پارلیمنٹ اور اسمبلی کی کچھ سیٹیں اور کچھ وزارتیں مل گئیں اور کچھ اقتصادی میدان میں ہم کچھ ترقی کر لی بھی تو کیا اس سے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے، جو ہم کو اپنی زبان، تہذیب اور مسلم پرسنل لا اور اپنے ملی وقار کے سلسلے میں پہنچ چکا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے کچھ گھر پکے بھی بن گئے ہیں، قدرے اقتصادی خوشحالی بھی آئی ہے اور ہمارے گھر ریڈیو، صوفہ سیٹ اور ٹی۔وی سے مزین بھی ہو گئے ہیں، ہماری مسجد اور مدرسے بھی پہلے سے شاندار بن گئے ہیں۔ مگر مسجد اور مدرسے کے باہر زندگی کے ہر میدان میں کیا ہم پیچھے نہیں چلے گئے ہیں؟ غلامی کے دور میں ہم کو ملی حیثیت سے جو عزت و وقار حاصل تھا کیا وہ سب چھن نہیں گیا ہے۔ کیا حکومت اور ملک کی سیاسی پارٹیاں اپنے فیصلوں کے وقت ہم کو بھی کوئی وزن دیتی ہیں یا ہم کو صفر مان کر اپنے فیصلے کرتی ہیں؟ اگر شخصی طور پر کچھ لوگوں کو پوچھ لیا جاتا ہے یا ان کو کچھ اعزاز مل جاتا ہے اس سے ملت کے عزت و وقار کو یہی نہیں کہ فائدہ نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس سے نقصان ہوتا ہے اور جو تھوڑی سی خوشحالی ہمیں نظر آ رہی ہے ملک کے دوسرے طبقوں کی خوشحالی کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ آزادی کے بعد ہریجنوں میں ہم سے زیادہ خوشحالی آئی ہے مگر آج وہ اس ظاہری خوشحالی پر اس لئے مطمئن نہیں ہیں کہ سماجی طور پر ان کو وہ عزت نہیں مل پائی ہے جو ہندوؤں اور اونچی ذات والوں کو حاصل ہے۔ آج سکھوں سے زیادہ کوئی طبقہ مجموعی حیثیت سے اس ملک میں خوشحال اور ترقی یافتہ نہیں ہے مگر وہ محسوس کر رہے ہیں کہ قومی حیثیت سے ان کے وقار کو دھکا پہنچا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہماری مسجدوں، مدرسوں کی عمارتیں شاندار بن گئی ہیں یا ہماری کچھ اقتصادی حالت بہتر ہو گئی ہے تو کیا اس سے ہمارا ملی وقار بھی کچھ بڑھا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں تھوڑی ترمیم کے بعد تو ہم یہ کہیں گے ؎

مسلم کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں ہے سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہماری موجودہ مشکلات میں ہمارے دینی و اخلاقی انحطاط کو بھی دخل ہے

جس کی وجہ سے ہم پورے طور پر نصرت خداوندی سے محروم ہو گئے ہیں، مگر جو لوگ اس کی آڑ لے کر ظاہری تدبیر اور جدوجہد سے باز رہنے کا مشورہ دیتے ہیں اور یہ بات ذہن میں ڈالتے ہیں کہ اگر ہم دینی واخلاقی طور پر درست ہو جائیں تو ہمارے سارے مسائل بند و مظاہرہ، جلسہ اور گرفتاری کے بغیر خود بخود حل ہو جائیں گے، تو اس بات کو راقم الحروف شیطان کا فریب اور ایک فرضی آئیڈیل معاشرہ کے تصور کو فلسفیانہ خبط سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ مثالی معاشرہ ہمارا عہد نبوی اور عہد صحابہ میں رہا ہے۔ مگر ان کو جتنی جدوجہد اور آزمائشوں کی خاردار گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد پھر ہمارا معاشرہ کبھی بھی مثالی نہیں بن سکا بلکہ بھلے بُرے دونوں معاشرہ میں ہمیشہ رہے اور رہیں گے، اس لئے کسی مثالی معاشرہ کے انتظار میں اپنی جدوجہد سے باز رہنا کوئی عقل مندی کی بات نہیں کہی جا سکتی بلکہ ایک طرف ہم کو اصلاح معاشرہ کی کوشش بھی جاری رکھنی چاہئے لیکن اسی کے ساتھ اسلامی قدروں اور تہذیبی امتیازات کو مجروح کرنے والی قوتوں کا مقابلہ بھی جاری رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اگر ہمارے عوام کے دلوں سے اسلامی قدروں کی حفاظت اور ملّی حمیت وغیرت کا جو ایک جذباتی تعلق ہے وہ اگر باقی رہے گا تو ان کی دینی اصلاح کا موقع بھی باقی رہے گا۔ اگر وہ بھی جاتا رہا تو پھر کوئی سرا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہے گا جس سے ہم ان تک پہنچ سکیں۔ راقم الحروف کو زندگی کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہر طرف سے فسادات کی خبریں آرہی تھیں راقم نے اپنے گاؤں میں جس کی مسلمان آبادی ۲۵ گھر ہو گی، جمعہ کے دن یہ اعلان کیا کہ یہاں جمعہ جائز نہیں ہے اس لئے اب یہاں جمعہ کے دن ظہر کی نماز ہو گی۔ اتفاق سے دوسرے دن گاؤں میں ایک کام سے جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک مسلمان مہتر کا گھر تھا جس کے پاس سے میں گزر رہا تھا وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ مہتر سے چھیدی نام کا ایک ہندو کہہ رہا تھا کہ اب تم لوگوں کو پاکستان جائے کے ہوئی (جانا ہوگا) مہتر اس سے کہنے لگا کہ پاکستان جائے کی جرورت کا ہو۔ ہم تو ہی بنْ سکے رہب اب تو مولبی صاحب جمعوں ختم کر دہلیں یعنی" پاکستان جانے کی کیا ضرورت ہے ہندو بن جائیں گے، جمعہ پڑھتے تھے وہ بھی مولوی صاحب نے ختم کر دیا۔ یہ سننا تھا کہ دماغ ہل گیا اور ذہن میں بات آئی کہ ایک ہلکا سا دین کا رشتہ جمعہ کی وجہ سے جو باقی تھا اگر یہ بھی نہ رہا تو پھر اس کے ہندو بن جانے میں کیا چیز روک سکتی ہے۔ فوراً لوٹا اور اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے دوسرے دن

اعلان کرا دیا کہ ہم نے مسئلہ غلط بتایا تھا، جمعہ یہاں ہو گا۔ چنانچہ آج بحمداللہ اس کا پورا گھر نمازی ہے اور کارِ خیر میں بڑھ کر حصّہ لیتا ہے۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ دین و ملت کے مسائل کے لئے یہ عوامی جدوجہد کا جو سرا ہمارے ہاتھ میں دشمنوں نے دے رکھا ہے یہ ہماری ملّی بقا کا سامان بھی ہے۔ اسی لئے آئیڈیل اسلامی معاشرہ کے انتظار میں اس سے صرف نظر کرنا انتہائی خطرناک غلطی ہو گی۔ افسوس ہے کہ نہ تو مسلمانوں کے خواص اس کو پورے طور پر محسوس کر پارہے ہیں اور نہ عوام، اور اگر محسوس کر رہے ہیں تو ملّی عزت وقار حاصل کرنے کے لئے کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور جو لوگ ملی سطح پر کبھی کبھی تھوڑی سی جرأت دکھاتے ہیں ان میں ایک تعداد تو اپنے سیاسی مفاد کی فکر میں رہتی ہے یا پھر ان سے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ وہ کب اپنی قیمت لگوا کر عوام کو بیچ میں چھوڑ کر راستے سے ہٹ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عوام جو ہر قربانی کے لئے تیار رہتے تھے اب آہستہ آہستہ وہ بھی مصلحت پرست اور بزدل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ آزادی کے بعد صرف عبدالجلیل مرحوم ایک ہی لیڈر پیدا ہوا جس نے ساری لڑائی ملت کے وقار کے لئے کی اور اس کی قیمت کوئی نہیں لگا سکا۔ گو خواص اور عوام مسلمانوں نے بھرپور ان کا ساتھ نہیں دیا ورنہ مسلم یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ دوسرے اقلیتی محاذوں پر بھی اپنی بازی جیت لیتے۔ اگر ان سے کچھ سیاسی غلطیاں ہوئیں تو اس میں بھی ملت کو باوقار کرنے کا جذبہ ہی کارفرما رہا۔

ہم مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں سے گزارش کریں گے کہ آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا میں جو ترمیمیں ہوئی ہیں یا کسی بل یا قانون کے ذریعہ وہ مجروح کیا گیا ہے، اس کی ایک فہرست تیار کر کے اس کے لئے عوام کو آواز دیں اور اس سے بڑے پیمانہ پر اس کے لئے تحریک چلائیں جیسی ۱۲۵ کی ترمیم کے سلسلہ میں چل چکی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ ہو گا جسے صدیوں مسلمانوں کی نسلیں یاد رکھیں گی۔ ہم کو پرسنل لا کے مطالبہ کی بات کرتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ہماری شریعت کا ایک حصہ ہے لیکن مجبوراً ان چند کلیوں پر قناعت کی بات کرنی پڑتی ہے ورنہ مطلوب تو پوری شریعت اسلامی ہے۔ دوسری جدوجہد ہمارے راہنماؤں کو یہ کرنی چاہئے کہ ہمارے نظام قضا کے فیصلوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس سے نہ صرف ہمارے معاشرہ کا فائدہ ہے بلکہ ہماری عدالتوں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائیگا

اور ان کے غلط فیصلوں سے جو ایک شبہ اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے وہ کم ہو جائیگی۔

گاندھی جی کا ہندوستان

گاندھی جی نے ہندوستان کا جو خاکہ بنایا تھا جسے آزادی سے پہلے سارے لیڈر بھی تسلیم کرتے تھے وہ یہ تھا کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے یہاں کی ۸۵ فیصد آبادی کسان ہے اس لئے اس کو سب سے زیادہ دیہی ترقی اور چھوٹی چھوٹی صنعتی ترقی پر زور دینا چاہئے۔ جب یہ دیہات کی ۸۵ فیصد آبادی ترقی یافتہ ہو جائے گی تو اس سے فطری طور پر جو بڑی صنعتی ترقی ابھرے گی وہ مضبوط اور پائیدار ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں جب سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں تو سب سے پہلے گرام سدھار کی اور چرخہ وغیرہ اسکیم چلائی گئی اور اس سے دیہات میں کچھ زندگی آئی مگر ۱۹۳۹ء میں جب کانگریس سے ہندوستان کے برطانیہ اور جرمنی کی جنگ میں شریک ہونے نہ ہونے پر انگریزوں سے اختلاف ہوا تو ساری کانگریسی حکومتیں مستعفی ہوگئیں اس کے بعد یہ اسکیم بند ہوگئی پھر ۶ برس کی جنگ کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی ملی اور کانگریس پورے ملک پر قابض ہوگئی اور گاندھی جی کے بنائے ہوئے ہندوستان کے خاکے میں رنگ بھرنے کا موقع آیا تو ان کو اور ان کے سارے منصوبوں کو پس پشت ڈال کر جواہر لال نہرو اور انکے ساتھیوں نے جو مغرب کی صنعتی ترقی سے مرعوب تھے، زراعت کے مقابلہ میں بڑی صنعتوں کو زیادہ اہمیت دی جس کا نتیجہ چالیس سال کے اندر یہ ہوا کہ ہندوستان کھربوں روپے کا مقروض ہوگیا اور اس کی جو کچھ ترقی دکھائی دے رہی ہے وہ سب دوسروں کے ہاتھ میں گروی ہے۔

ہندوستان کے مشہور قانون داں اور ماہر معاشیات مسٹر نینی پالکھی والا نے بنگلور میں ۵ر مارچ ۸۸ء کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ:

"ملک قرض کے چکر میں پڑ کر تباہی کے کنارے پہنچ گیا ہے، حکومت کو ان قرضوں کے سود کی ادائیگی کے لئے قرض لینا پڑتا ہے۔" انھوں نے بتایا کہ "اس طرح مرکزی حکومت پر دو لاکھ چوبیس ہزار کروڑ روپے (یعنی بائیس کھرب چالیس ارب) قرض ہے جس پر اس کو ۱۴ ہزار ایک سو کروڑ (یعنی ایک کھرب ۴۱ کروڑ) روپے سود دینا ہوتا ہے۔"

(نیشنل ہیرالڈ ۸ر مارچ ۱۹۸۸ء)

اس اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو گویا ہندوستان کا ہر آدمی خواہ بچہ ہو یا بوڑھا مرد ہو یا عورت ہر ایک پر دو ہزار ۸ سو روپئے کا قرض لدا ہوا ہے اور ہر شخص سال میں ایک سو ستتر روپئے (۱۷۷) کا سود ادا کرتا ہے۔

یہ تو ہوا گاندھی جی کی دیہی ترقی کو نظر انداز کر کے صنعتی ترقی کو اولیت دینے کا نتیجہ۔ پھر گاندھی جی نے کانگریس کے ہر منشور میں شراب بندی اور منشیات پر پابندی کو بنیادی مقاصد کی حیثیت سے باقی رکھا لیکن اس وقت ملک میں شراب کے کاروبار کا دریا بہہ رہا ہے اور سب سے زیادہ چھوٹ شراب بندی اور منشیات کے سلسلے میں دی جا رہی ہے۔ اگر آزادی سے پہلے دو چار فیصد آبادی نشہ استعمال کرتی تھی تو اب پچاس فیصد آبادی اس کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ جو لوگ کہ اپنے کو گاندھی کا بھگت کہتے ہیں ان کا یہ کارنامہ ہے مگر اس لرزہ خیز حالات کے باوجود ہماری حکومت کو سب سے زیادہ فکر اور دلچسپی ہندی زبان کو فروغ دینے اور دوسرے طبقوں کے امتیازات کو مٹانے کی ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کے لئے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی فکر پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ملک کے اندر طبقہ وارانہ ذہنیت فروغ پا رہی ہے اور سارے سرحدی صوبوں میں بغاوت کی لہر چل رہی ہے۔

ہندوستان کے ساتھ چین اور مشرقی ایشیا کے کئی ملک آزاد ہوئے ہیں مگر ان میں اکثر قرض لینے کے بجائے قرض دینے کی پوزیشن میں ہیں۔ جاپان، جسے جنگ میں چور چور کر دیا گیا تھا، آج اسکی ترقی سے بڑی بڑی طاقتیں گھبرا رہی ہیں۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ اگر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو ہندوستان نے آزادی کے بعد نہ تو اقتصادی حیثیت سے حقیقی ترقی کی ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے۔ جو کچھ ترقی کی چمک دمک دکھائی دے رہی ہے وہ سب دوسروں کی مرہون منت ہے۔ اس قرض کے سب سے بڑے سبب دو ہیں ایک حکومت کے اہلکاروں سے لے کر ذمہ داران کی لوٹ کھسوٹ دوسرے پاس پڑوس کے ملکوں کے مقابلہ میں فوجی طاقت میں اضافہ کی کوشش جس کی وجہ سے ایک طرف قرض کا بوجھ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے دوسری طرف ناوابستگی کے دعوے کے باوجود ملک آہستہ آہستہ روس کی گود میں چلا جا رہا ہے۔

دوسری قسط

فتنۂ وضع حدیث اور اسکے اسباب و محرکات

ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری
ترجمہ:- وزیر احمد ندوی استاذ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

عراق اور کوفہ وضع حدیث اور احادیث موضوعہ کی نقل و روایت کا بڑا مرکز رہا، خاص طور پر جب حضرت علیؓ نے کوفہ کو دار السلطنت بنایا تو کوفہ امویوں سے جنگ کا مرکز بن گیا، اور یہ حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد بھی اموی حکومت کے مد مقابل مرکز کی حیثیت سے باقی رہا جس کے سبب کوفہ کی صورت حال ان عناصر کے لئے موزوں ترین ثابت ہوئی جو سلطنت کے حصول کے لئے اس صورت حال کا انتظار کر رہے تھے اور اس کے لئے کوشاں تھے، سیاسی بغض و عداوت سے بھرپور اس معاشرہ میں، امویوں کے خلاف نقطۂ نظر کی تعمیر اور ان کی تذلیل اور ان کے سیاسی دبدبہ کو خاک آلود کرنے کی غرض سے حدیثیں گڑھی گئیں چنانچہ مختار ثقفی نے ایک مرتبہ ایک انصاری سے کہا آپ میرے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے ایک حدیث گڑھئے جسمیں یہ صراحت ہو کہ میں حضورؐ کے بعد خلیفہ بنوں گا، اس کے عوض میں تمھیں دس ہزار درہم، پوشاک، سواری اور خادم ملیں گے۔ ان انصاری صاحب نے حضورؐ کی طرف منسوب کرکے حدیث گڑھنے سے تو انکار کر دیا مگر کم اجرت پر کسی صحابی کی طرف منسوب کرکے حدیث گڑھنے پر راضی ہو گئے[1]

دوسری جانب ناخواندہ اور جھاڑ پھونک کرنے والے افراد علم کے حلقوں میں صدر نشین ہونے لگے حضرت عاصم الاحول بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک ایسی مجلس میں حاضر ہوا جسمیں ایک عجمی صدر نشین تھا جو عربی اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا تھا اس کے باوجود وہ امام بنا بیٹھا تھا اور لوگ اس کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوئے خاموش بیٹھے تھے[2] درس و تدریس کے حلقوں میں ان جاہلوں کی پیش قدمی نے شریعت اسلامیہ کے احکام کے ساتھ استہزاء و تمسخر کا موقعہ فراہم کر دیا جس سے

---

[1] الاحادیث الموضوعہ لابن الجوزی ۱/ ۴۰ب [2] المجروحین من المحدثین ۲/ ۲۸ ألا بن حبان۔

زہد و تقویٰ میں کمی، شرعی احکام کی خلاف ورزی اور شرعی نظام سے اعراض کی کوشش کا سراغ ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ایک کتاب لائی گئی جسمیں حضرت علیؓ کے فیصلے تحریر تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک بالشت بھر چھوڑ کر بقیہ سب مٹا دیا[۱] حضرت اعمشؒ نے ایک کوفی بزرگ کو دیکھا کہ وہ مطلقہ (جسکو تین طلاق دی گئی ہو) کے بارے میں حضرت علیؓ کے فیصلہ میں تحریف سے کام لے رہے تھے اور کہتے تھے کہ لوگوں نے انھیں اس پر مجبور کر دیا[۲]

کوفہ میں وضع حدیث کی کثرت کے باعث عالم اسلام کے علمی مراکز کی نظر میں عراق کی مرکزی حیثیت مجروح ہونے لگی اور شروع ہی سے عراقیوں کی علمی شہرت زوال کا شکار ہوتی گئی، حضرت عائشہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا، اے عراقیو! تم سے شامی بہتر ہیں! شامیوں کے پاس اللہ کے رسول کے اصحاب کی کافی تعداد پہنچی اور انھوں نے حدیثیں بیان کیں جن سے ہم آشنا ہیں اور تمھارے پاس (عراق میں)، بہت تھوڑے اصحاب پہنچے اور تم نے وہ حدیثیں بیان کیں جنمیں سے کچھ سے تو ہم واقف ہیں اور کچھ سے بے خبر[۳] عراقیوں کی ایک جماعت حضرت عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئی اور ان سے حدیث بیان کرنے کی خواہش بیان کی تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے ان سے کہا: عراق میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں اور حدیث کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں[۴] امام زہری فرماتے ہیں کہ جب میں کسی عراقی سے حدیث سنتا ہوں تو پس و پیش میں مبتلا ہو جاتا ہوں[۵] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دمشق کی حکومت نے افتار کے بارے میں عراقی علمار پر پابندی لگا دی نئے مسائل اور واقعات میں ان سے فتویٰ لینا چھوڑ دیا حکومت کے نزدیک افتار کے سلسلہ میں معتمد علیہ مدینہ اور شام کے علمار تھے، امام اوزاعی ارشاد فرماتے ہیں۔ شام کے خلفار جب کوئی واقعہ پیش آتا تو شام اور مدینہ کے علمار کی طرف رجوع کرتے اور عراقیوں کے فتاوے ان کی حدیثیں ان کے گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی۔ شام کے علمار عراق کے خوارج سے پہلو تہی کرتے[۶] خوارج سے امام اوزاعی کی مراد سنت نبوی کے مخالفین بھی ہو سکتے ہیں اور دمشق حکومت کے باغی بھی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خوارج سے اس نام سے موسوم فرقہ ہی مراد لیا ہو البتہ اس پابندی کے اثرات میں مبالغہ سے کام لینا کسی طرح

---

[۱] الجامع الصحیح المسلم ۱/۱۴ [۲] الکامل لابن عدی ۱/۱۵۸ [۳] التاریخ الکبیر لابن عساکر ۱/۶۹ [۴] الطبقات لابن سعد ۴/۲۶۷-۲۶۸ [۵] التاریخ الکبیر لابن عساکر ۱/۷۰ [۶] ایضاً ۱/۷۰

مناسب نہیں ہے کیونکہ عراقیوں کی علمی شان و شوکت کی کمی کی ذمہ داری اموی حکومت پر نہیں ڈالی جا سکتی اور نہ اس کا کوئی سیاسی سبب ہے بلکہ نئے مسائل میں ان کے فتاوے کے ساتھ بے رغبتی برتی گئی، اموی حکومت کے اختیار سے یہ باہر تھا کہ وہ ہر شخص کو عراقیوں سے ملنے جلنے اور ان سے استفادہ سے باز رکھ سکے۔ عراق کی مرویات پر عدم اعتماد کی فضا ہموار ہوتی گئی یہاں تک کہ بعض ائمہ نے یہ صراحت کر دی کہ وہ عراق کی مرویات سے قصداً استغنا برتتے ہیں اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن مبارک کا یہ قول بڑی اہمیت کا حامل ہے "میں شام صرف اس لئے گیا تاکہ اہل کوفہ کی حدیث سے بے نیاز ہو سکوں[1] مدینہ منورہ کے جلیل القدر فقیہ امام مالک بن انس رح نے اپنے ہم مسلک عبداللہ بن ادریس کو چھوڑ کر کسی کوفی سے روایت نہیں کی ہے وہ فرماتے تھے کہ جس طرح ہمارے متقدمین نے متقدمین (عراقیوں) سے روایت نہیں لی اسی طرح ہمارے متاخرین، متاخرین (عراقی) سے روایت نہ لیں[2] حضرت امام مالک کا یہ قول اس بات کا غماز ہے کہ عراقیوں کی حدیث کو قبول نہ کرنے کا طریقہ ان کے زمانہ کا ایجاد کردہ نہیں بلکہ وہ اپنے متقدمین کے طریقہ پر عمل پیرا تھے۔ امام مالک رح کی طرح دوسرے شہر کے علماء بھی عراق سے آنے والی حدیثوں کے بارے میں سخت توقف اختیار کیا۔ امام مالک کی رائے یہ تھی کہ ان کی مرویات کو اہل کتاب کی روایات کا درجہ دیا جائے یعنی نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب[3]۔ عبدالرحمن بن مہدی نے امام مالک سے ذکر کیا کہ انھوں نے مدینہ میں چالیس سال کے دوران جو احادیث سنی اتنی ہی عراق میں ایک دن میں سنی تو امام مالک نے فرمایا ہمارے یہاں روایت حدیث کا وہ مرکز کہاں جو آپ کے پاس ہے، آپ رات کو احادیث سنتے ہیں اور دن کو بیان کرتے ہیں[4]۔ گویا امام مالک رح نے عراقیوں کے نزدیک متداول احادیث کی کثرت کا سبب وضع حدیث کو قرار دیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اہل مدینہ عراقیوں سے روایت قبول کرنے میں سختی سے کام لیتے تھے عراقیوں کی بہت کم روایتیں قبول کی جاتیں، حدیث کے قبول کرنے میں اہل مدینہ کی چھان بین اور تحقیق و تمحیص کے پیش نظر مختلف اسلامی ملکوں کے علماء اور محدثین مدینہ کے علماء اور اصحاب علم پر اعتماد کرتے۔ دمشق کی حکومت بھی نئے مسائل کی بابت انھیں سے رجوع کرتی انکے فتاوی پر اعتماد کرتی، وضع حدیث کی بنا پر علمی مراکز میں عراق کی علمی شہرت کو نقصان پہنچا سفیان بن عیینہ جو

---

[1] ایضا ۱/۰۷، [2] الکامل لابن عدی ۱/۳ [3] المنتقی من منہاج الاعتدال لابن تیمیہ ۸۸۔
[4] ایضا ۸۸

کہ عصر کے امام حدیث شمار کئے جاتے ہیں، کہتے ہیں، جو حق و باطل کو ایک دوسرے میں گڈ مڈ طور پر جاتا ہو وہ عراقیوں سے ملے؎۱ ان کی مراد یہ ہے کہ عراقی صحیح کو موضوع میں اس طرح خلط ملط کر دیتے ہیں کہ طالب علم اس میں تمیز اور فرق نہیں کر پاتا، ہاں البتہ جو اس علم کے ماہرین ہیں وہ اپنے علم کی گہرائی اور تجربہ کی بنیاد پر صحیح اور موضوع میں فرق کریں گے اور موضوعات سے صحیح کو الگ کریں گے۔ اس میں شک نہیں کہ عراق میں موضوع احادیث کا فروغ اتنی کثرت سے ہوا جتنا دوسری جگہ پر نہیں ہوا، عراق کا سیاسی کردار بھی وضع حدیث کا بڑا محرک ہے عراق کے اسلامی معاشرہ میں زبردست پھوٹ رونما ہوئی۔ مسلمان جنگ صفین کے بعد جمہور، خوارج اور شیعہ میں بٹ گئے۔ عراق کی سرزمین پر ہی وہ خوں ریز فتنے اور انقلابات ہوئے جن کا سلسلہ اموی حکومت کے آخری دور تک چلتا رہا، وضع حدیث کے محرکات وعوامل نے عراق کی سیاسی صورت حال کو تقویت بخشی۔ مذکورہ اسباب و عوامل کے علاوہ وضع حدیث کے دوسرے اسباب بھی مہیا ہو گئے، جن کی تفصیل اس وقت آئے گی جب ہم عراق میں موضوع احادیث کی کثرت اور اس کی نشو و نما پر بحث کریں گے، یہاں پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا عراق کے علم اور اہل علم نے واقعتاً اپنا اعتماد کھو دیا تھا؟ کیا سچ مچ علماء نے اہل عراق سے بے نیازی اختیار کر لی تھی؟ جبکہ اسلامی حکومت میں عراق علم و فن کا ایک اہم مرکز شمار ہوتا رہا ہے اور کیا وضع حدیث وہاں اس کثرت سے موجود تھا کہ علماء نے عراق پر پابندی لگا دی تھی؟ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ صحابہ کی معتد بہ تعداد کوفہ پہنچی، مورخین نے انکی تعداد تین سو سے اوپر بتائی ہے۔ تین سو صرف وہ اصحاب تھے جو بیعت الرضوان میں شامل تھے اور ستر اہل بدر میں سے تھے؎۲، ان میں عبداللہ بن مسعودؓ بھی شامل تھے جو فقہ کے جلیل القدر امام سمجھے جاتے ہیں۔ جب حسن بصری سے اہل بصرہ اور اہل کوفہ کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ اہل کوفہ سے آغاز کرتے؎۳

حدیث کی نقل و روایت میں عراق نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا اندازہ علی بن المدینی کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے وہ فرماتے ہیں، ثقہ راویوں کی احادیث چھ آدمیوں کے اردگرد گھومتی ہیں جنہیں سے دو بصری ہیں، دو کوفی اور دو حجازی۔ بصرہ میں قتادہ اور یحیی بن کثیر، کوفہ میں ابو اسحاق،

؎۱ التاریخ الکبیر لابن عساکر ۱/۰، ؎۲ الطبقات لابن سعد ۶/۹ ؎۳ الکامل لابن عدی ۱/۱۴۵

اور اعمش، حجاز میں زہری اور عمرو بن دینار پھر ان سے بارہ آدمیوں تک پہونچیں۔ بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ شعبہ بن الحجاج معمر بن راشد حماد بن سلمہ جریر بن حازم اور ہشام الاستوائی تک اور کوفہ میں امام ثوری ابن عیینہ اور اسرائیل تک اور حجاز میں ابن جریج محمد بن اسحاق اور امام مالکؒ تک پھر ان تمام لوگوں کی حدیثیں یحییٰ بن معین تک پہنچیں، ان علما اور محدثین نے جنکی زندگی عراق میں گذری صحیح اور موضوع میں تمیز کے میدان میں زبردست رول ادا کیا انھوں نے ایک حد تک عراق کے علمی مقام کی حفاظت کی امام ابن تیمیہ اہل کوفہ کے کذب و دروغ گوئی کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں، اس کے باوجود کوفہ اور دوسرے ملکوں میں ثقہ اور معتمد علیہ راوی بکثرت موجود تھے [۲] اسی لئے محدثین نے کوفہ کے ثقہ راویوں سے حدیثیں اخذ کیں ان میں بعض شیعہ بھی شامل ہیں جو صدق اور زہد و تقوی میں ممتاز تھے یحییٰ بن معین سے ایک مرتبہ کہا گیا، امام احمد بن حنبلؒ عبید اللہ بن موسیٰ کی حدیث تشیع کی وجہ سے رد کر دیتے ہیں تو یحییٰ بن معین نے قسم کھا کر کہا کہ ضعف حدیث میں عبد الرزاق ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں اور انھوں نے جو روایتیں عبد الرزاق سے سنی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو انھوں نے عبید اللہ سے سنی ہیں [۳] یحییٰ بن معین کے سامنے حسین الاشقر کا تذکرہ کیا گیا جن کا شمار غالی شیعوں میں ہوتا ہے اور ان کی حدیث کی بابت ان سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کوئی حرج نہیں ہے نیز ان سے اپنی روایت کا تذکرہ بھی کیا [۴] گویا محدثین اور علماء نے عقائد اور اخلاق کے درمیان فرق باقی رکھا سچا آدمی خواہ وہ شیعہ ہو یا خارجی، قدریہ میں سے ہو یا مرجئہ میں سے اس سے روایت لی جائے گی اس شرط کے ساتھ کہ اس کے اندر اپنے آراء و افکار کی نشر و اشاعت کا جذبہ موجود نہ ہو اس لئے کہ یہ جذبہ اسے کذب اور دروغ گوئی پر ابھار سکتا ہے، عراقی مرویات سے بے اعتنائی کے نتیجہ میں بڑا خسارہ لاحق ہوا علم کی حفاظت اور نقل میں عراق کا بیش بہا حصہ ہے جس سے تغافل نہیں برتا جا سکتا۔ علی بن المدینی کہتے ہیں، اگر بصریوں کو مسئلہ تقدیر میں مبالغہ آرائی اور کوفیوں کو تشیع کی بنا پر چھوڑ دیا جائے تو کتابیں ناپید ہو جائیں گی [۵] اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب صحاح ستہ کی تدوین عمل میں آئی تو عراقیوں کی روایات بھی ان میں شامل کی گئیں اور شیعوں کی بھی روایات ان میں

---

[۱] الکامل لابن عدی ۱/۵۲ أ المجروحین من المحدثین ۱/۷ ا ب [۲] المنتقی لابن تیمیہ / ۸۸

[۳] الکفایۃ للخطیب / ۱۳۰ [۴] ایضاً / ۱۳۰-۱۳۱ [۵] ایضاً / ۱۲۹

تحریر کی گئیں، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری میں جن شیعوں کی روایتیں درج کیں ان میں سرفہرست عبدالرزاق الصنعانی جریر بن عبدالحمید الضبی اسماعیل بن ابان خالد بن مخلد علی بن الجعد الفضل ابن دکین اور عباد بن یعقوب وغیرہ ہیں، امام مسلم اور ان کی صحیح مسلم کے بارے میں امام مسلم کے شاگرد ابو عبداللہ محمد بن یعقوب فرماتے ہیں، میرے استاد کی کتاب شیعوں کی روایات سے بھری پڑی ہے[۱]

اگر ایک طرف عراق وضع حدیث کا بڑا مرکز رہا ہے تو دوسری طرف صحاح ستہ میں عراقیوں کی روایات کا وجود عراق کے علماء کی ان کوششوں کی نشاندہی کرتا ہے جو انھوں نے سنت نبوی کی تحقیق صحیح اور موضوع کے درمیان تمیز اور ثقہ وغیر ثقہ راویوں کے مابین واقفیت کے سلسلہ میں کیں۔

[۱] الکفایہ للخطیب - ۱۳۱

قسط ۲ — از: حبیب اللہ ندوی

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ
اور
ان کا ترجمۂ شمائل ترمذی

عادات وخصائل مولانا کی ذات زہد واتقار اور بذل وجود اور ہمت وجرأت میں اسلاف کا نمونہ تھی۔ افسوس ہے کہ مولانا کے اخلاق وعادات کے بارے میں تذکرۂ علمائے ہند اور مشاہیر جونپور میں دو چار فقروں سے زیادہ اور کچھ نہیں ملتا مگر ان مجمل بیانات سے بھی کسی قدر ان کے مرتبہ کی بلندی کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں ہے۔

متشرع و متورع بودند	شریعت کے پابند اور حد درجہ پرہیزگار تھے

مشاہیر جونپور میں ہے:

مولانا مردِ میداں زہد وتقویٰ صاحب بذل و ہمت وسیر چشم بودند ہرکہ از نذر وفتوح آمدے برحاجت منداں وفقرا ومساکین تقسیم کردے۔	مولانا زہد وتقویٰ کے مرد میداں اور بڑے اولوالعزم فیاض اور سیر چشم تھے، ان کے پاس جو نذریں اور ہدایا آتے تھے وہ سب غربا ومساکین پر صرف کردیتے تھے۔

مولانا کے عادات وخصائل اور معمولات کو مولانا عبدالباطن نے قدرے تفصیل سے لکھا ہے جس کا کچھ خلاصہ یہ ہے:

"حضرت مولانا کے مزاج میں حرارتِ اسلامی اور جوشِ ایمانی پلے درجہ کا تھا، آپ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے اور تہجد سے صبح تک آپ ذکر خدا میں مشغول رہا کرتے تھے۔ نماز فجر کے بعد اشراق تک آپ مع اپنے مریدین کے مراقبہ کرتے۔ آپ کے حلقہ میں بہت لوگ بیٹھا کرتے تھے اور اور اس کے بعد طلبا کو قرآن شریف با تجوید وقرأت پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے بعد چائے پی کر تصانیف کے شغل میں مصروف رہا کرتے تھے اور کھانا کھانے کے بعد دوپہر کو آپ قیلولہ فرمایا کرتے تھے، ظہر کی

نماز موافق مذہب حنفی اوّل وقت میں اور عشار کی نماز تاخیر کرکے ادا کرتے تھے اور عشار کے بعد کھانا کھا کر کتابوں کی تصنیف اور کتب بینی میں معروف رہا کرتے تھے۔ آپ رات کو بہت کم سوتے تھے اور تھوڑی دیر استراحت فرماکر تہجد کی نماز کے واسطے بیدار ہوا کرتے تھے اور آپ اکثر باوضو رہا کرتے تھے ۔۔ آپ سنّت رسول اللہؐ کے بڑے پابند تھے یہاں تک کہ مسواک قبل وضو پنج وقتہ کیا کرتے تھے اور پابند کلوخ تھے۔ عمامہ ہمیشہ باندھتے تھے، پائجامہ اونچا پہنتے تھے، موزہ کا استعمال کبھی نہیں کیا، ہاتھوں میں ہر وقت تسبیح رکھتے اور پڑھتے تھے۔ آپ کو پان کا بڑا شوق تھا اور حُقّہ سے نفرت تھی اور حُقّہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اس کا ترک کرنا اولیٰ ہے اور بعد مغرب بھی آپ طلبہ کو قرأت مشق کراتے اور علم قرأت میں آپ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ آپ سات قرأتوں کے ساتھ قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، ابتدائے زمانہ میں آپ درسی کتابوں کو بھی پڑھایا کرتے، اس کے بعد علم تجوید، اس کے بعد تعلیم ذکر و مراقبہ آپ کی خوراک بہت مختصر تھی اور کھانے میں کوئی تکلف نہ تھا۔ قناعت ایسی تھی کہ جو کچھ سامنے آتا شکر بھیج کر اسے کھا لیتے۔ آموں سے آپ کو شوق تھا۔ احقر کی بڑی پھوپھی صاحبہ فرماتی تھیں کہ آم کے فصل میں آپ کے واسطے آم کا انتظام رہتا جسے آپ کھانا کھانے کے بعد نوش فرماتے۔ جب فصل ختم ہونے والی ہوتی تو آم کا حلوہ گھی اور چینی کی آمیزش سے تیار کیا جاتا آپ اسے کچھ روز تک کھاتے۔ آپ کی مہر میں "علی جونپوری" کھدا ہوا تھا۔ آپ اپنے نام کو اپنی تصانیف میں یوں لکھا کرتے :

"خاکسار علی جونپوری معروف بہ کرامت علی جونپوری"

آپ کی روشن تحریر عربی مثل محدثین کے سادہ اور سلیس عام فہم خواص پسند ہوا کرتی تھی۔ خیاں چہ نسیم الحرمین، براہین قاطعہ، میلاد خیر البریہ وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوگا۔ مولانا نے اپنی مادی و معنوی دونوں یادگاریں چھوڑی ہیں۔

اولاد

مولانا کی کل ۱۴ اولادیں ہوئیں، ۶ لڑکے اور ۸ لڑکیاں، بڑے صاحبزادے مولانا کی زندگی ہی میں وفات پاگئے تھے بقیہ وفات کے وقت موجود تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام حافظ عبداللہ تھا۔ مولانا کے بعد ان کے اہل خاندان نے ایک مدت تک دعوت و تبلیغ کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

دعوت و تبلیغ کا کام

ہندوستان کے علماء و صوفیہ نے ہمیشہ دعوت و تبلیغ کے خصوصی کام کو اپنا شعار بنائے رکھا اور انہی کے فیض سے پورے ملک میں

اسلام اپنی اصلی حالت میں زندہ و پائندہ رہا مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ مغل حکومت کے سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں اور خصوصیت سے مسلمانوں میں جو دینی اور اخلاقی انحطاط پیدا ہو رہا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ دعوت و تبلیغ کے کام کو زیادہ سے زیادہ عمومیت دی جائے اور اسے خانقاہوں اور مدرسوں سے نکال کر بازاروں اور گلی کوچوں تک پہنچایا جائے، چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں اس طرف توجہ دلائی اور اس خانوادے نے اس کو کسی قدر عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی مگر یہ سعادت حقیقتاً اسی خانوادہ کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اس خانوادہ کے چشم و چراغ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالحئی صاحب بڈھانویؒ کے حصہ میں آئی جنھوں نے دعوت و تبلیغ کی ایسی مشعل جلائی کہ اس کی روشنی سے پورا ملک منور ہوگیا اور چند برسوں میں توحید خالص کا غلغلہ اور قال اللہ وقال الرسول کی آواز مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پہنچ گئی۔ سید صاحب اور ان کے رفقائے خاص کی شہادت کے بعد گو تحریک جہاد کی ہماہمی تو قدرے کم ہوگئی مگر دعوت و تبلیغ کی جو شمع انھوں نے جلائی تھی انشاء اللہ اس کی پوری تابانی قیامت تک باقی رہے گی اور اس کی ایک تابندہ یادگار مولانا کرامت علی صاحب جونپوریؒ بھی تھے۔

مولانا کرامت علی جونپوری میں دعوت و تبلیغ کا جذبہ عنفوان شباب ہی سے موجود تھا مگر سید صاحب کی خدمت سے واپسی کے بعد اس جذبہ میں نہ صرف تیزی آگئی بلکہ وہ دو آتشہ ہوگیا اور انھوں نے اس کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی اور اسی کے ہو رہے۔ ان کی دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں کے بارے میں ان کے معاصر تذکرہ نویسوں نے اپنی عادت کے مطابق محض چند جملے لکھے ہیں مگر دوسرے ذرائع سے جو معلومات مل سکی ہیں ان سے ان کے کاموں کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف نے لکھا ہے:

متشرع متورع واعظ کثیر التصانیف در ہدایت خلق بغایت کوشید خصوصاً مردم ممالک بنگال از مستفیض شدند در آں دیار طریق اسلام از یمن و برکت او خوب شیوع یافت۔

شریعت کے انتہائی پابند، بڑے متقی اور واعظ تھے، اپنی تصانیف اور درس و تدریس کی بہت سی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں اور خلائق کی ہدایت میں بہت کوشش کیں۔ بنگال کے لاکھوں آدمی ان سے مستفیض ہوئے اور اس دیار میں انکی برکت و سعادت سے اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔

مشاہیر جونپور کے مصنف نے قدرے اور تفصیل کی ہے:

ہمت شیوع دین اسلام بر وعظ و ہدایت اسلامیاں کر ہمت چست بستہ مادام الحیات دریں شغل ستر گ گزرا نید۔	اسلام کی اشاعت میں انھوں نے پورے طور پر کمر ہمت باندھی اور پھر پوری زندگی اس کار عظیم میں صرف کر دی۔
زیادہ حصۂ عمر عزیز در سیاحی بلا شرقیہ بعظمت و سر بلندی بسر شد۔ درآں دیار باعث شیوع و ترقی اسلام این ذات مغتنمات شد۔	عمر عزیز کا زیادہ حصہ ملک کے مشرقی حصہ میں بسر کیا اور بڑی عظمت و عزت حاصل کی دیار مشرق میں اسلام کی اشاعت و ترقی میں ان کی ذات مغتنم تھی۔

مولانا کی تبلیغی سرگرمیاں دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک کا تعلق جونپور اور اس کے گرد و نواح سے ہے اور دوسرے کا تعلق بنگال اور آسام کے بعض علاقوں سے ہے۔ جون پور اور اس کے گرد و نواح میں آپ کی اصلاح و تبلیغ کا دائرہ زیادہ تر مسلمانوں تک محدود رہا مگر بنگال میں مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ آپ نے تنہا غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کا جو وسیع کام کیا وہ کام کوئی حکومت یا ایک پوری جماعت بھی نہ کر سکی۔ افسوس ہے کہ ان کے کارناموں کو ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں وہ مقام نہ مل سکا جو انھیں ملنا چاہئے تھا۔ ہندوستان کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں بے شمار ایسی شخصیتیں ملیں گی جن کے کارنامے صفحۂ قرطاس پر بالکل ہی نہیں آسکے ہیں بلکہ اس راہ میں ہزاروں ایسے مردانِ کار ملیں گے جن کے نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں اور جن لوگوں کے نام اور کارنامے تاریخ کے صفحات میں آگئے ہیں ان میں بھی بیشتر تعداد ایسی ہے کہ ان کے جتنے کارنامے ہمارے سامنے آسکے ہیں ان سے کئی گنا زیادہ کارنامے ہمارے علم میں نہیں آسکے ہیں۔ یہ ان کی بے نفسی اور اخلاص تھا کہ وہ اپنی شخصیت کو مٹا کر خدا کے دین کو زندہ کر گئے۔ ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کے لئے آج بھی ان کے خاموش مگر باعزیمت طریقۂ کار میں بڑی بصیرتیں پوشیدہ ہیں۔

پہلے ہم جون پور اور اسکے گرد و نواح میں مولانا کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں اسکے بعد مشرقی ہند میں ان کی تبلیغی کوششوں کی تفصیلات جو ہمیں مل سکی ہیں، کی وضاحت کریں گے۔ مولانا نے تقریباً اپنی عمر کو دو تہائی حصہ بنگال میں بسر کیا۔ مگر بنگال جانے سے پہلے اور پھر درمیان میں جب جب جونپور واپسی ہوئی آپ اصلاح حال کی فکر میں رہتے۔ جون پور، جو ایک زمانہ میں علماء اور صلحاء کا مرکز رہ چکا ہے

اور "شیراز ہند" کہا جاتا تھا۔ جس سرزمین میں ملا محمود جونپوری اور نہ جانے اور کتنے سرآمد روزگار علماء اور صلحاء سپرد خاک ہیں، جہاں ایک زمانہ میں جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کیلئے بیک وقت کئی کئی سو علماء وصلحاء کی پالکیاں جاتی تھیں، دو صدی کے اندر وہاں کی دینی حالت یہ ہوگئی تھی کہ ابراہیم شرقی کی بنوائی ہوئی شاندار جامع مسجد میں جمعہ تک نہیں ہوتا تھا۔ وہاں دن کے وقت اذان کہنے کو نحوست سمجھا جاتا تھا۔ دینی احکام کی جگہ بے شمار بدعتوں اور رسم ورواج نے لے لی تھی۔ نہ صرف جونپور بلکہ اسکے قریبی اضلاع اعظم گڑھ، سلطانپور وغیرہ کا بھی یہی حال تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا جسم وجثہ کے اعتبار سے بھی قوی ہیکل تھے اور انھوں نے فن سپہ گری بھی سیکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دعوت وتبلیغ میں اپنی جسمانی طاقت اور فن سپہ گری دونوں سے بھرپور کام لیا۔ مولانا نے اس دیار میں جو اصلاحی کام کئے ان کی ایک ہلکی سی جھلک ذیل کے بیانات وواقعات سے معلوم ہوگی۔ یہ معلومات اور بیانات مولانا کی بعض تصنیفات اور ان کے پوتے مولانا عبدالباطن صاحب کی بعض کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

ذکر آچکا ہے کہ مولانا کے اندر دعوت واصلاح کا جذبہ عنفوان شباب ہی سے تھا اور حضرت سید صاحبؒ کی خدمت سے واپس آکر تو بالکل اسی کے ہو رہے۔ محلہ محلہ جاکر نماز روزہ کی تاکید کرتے، لوگوں میں جو بدعات اور رسومات رواج پاگئی تھیں ان کے خلاف وعظ کہتے تھے، بعض محلوں میں اذان وجماعت شروع کی تو لوگ کہتے تھے یہ دن کے وقت اذان کیسی؟ مولانا عبدالباطن صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا نے اپنے مرشد سید صاحب سے رخصت ہوکر اپنے وطن جونپور تشریف لائے۔ چونکہ آپ تبلیغ وہدایت خلق کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری فرماچکے تھے اب جونپور آکر اس کام میں اور بھی سرگرم عمل ہوگئے اور محلہ محلہ اور گھر گھر پھرتے۔ نماز وروزہ اور دیگر ارکان اسلام کی تلقین وتاکید فرماتے۔ اس جونپور میں دن کو اذان نہ ہوتی صرف صبح وشام کو طلوع وغروب کی پہچان کی غرض سے بطور رسم اذان ہوا کرتی۔ آپ نے اس جاہلانہ رسم کی اصلاح کی اور بڑی کوششوں سے پانچوں وقت اذان وجماعت مسجدوں میں جاری کرائی۔ غیر اللہ کے نام پر منتیں ماننا اور دیگر مشرکانہ رسوم میں لوگ بکثرت مبتلا تھے، شادی وغمی کے موقع پر ہندوانہ رسوم برتے جاتے تھے ان سب برائیوں اور معصیتوں سے لوگوں کو وعظ ونصیحت کے ذریعہ باز رکھا، عوام بھی مولانا کی جد وجہد دیکھکر متاثر ہوتے اور مطیع فرماں بردار بن جاتے۔ اس سرعت کے ساتھ مولانا کی یہ کامیابی حضرت سید صاحبؒ کی دعا کی برکت کے سبب تھی۔" (ص ۴۶)

مسلمانان جونپور کے دینی تحفظ اور ان کے دین پر ثابت قدم رہنے کے خیال سے مولانا نے جامع مسجد جون پور میں بعد نماز جمعہ وعظ کا سلسلہ قائم کیا کہ ہر ہفتہ دین کی باتیں سننے سے لوگوں کی استقامت میں پختگی ہوگی نماز جمعہ وعظ و نصیحت کا جو سلسلہ قائم فرمایا تھا وہ ہمیشہ کا معمول ہو گیا اور اس سے اہل جون پور کو بہت کچھ فائدہ ہوا۔ یہی سبب ہے کہ جونپور کے عوام دینی سمجھ میں بہت غنیمت ہیں۔ (سوانح مولانا کرامت علیؒ)

خود مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب زادالتقویٰ میں جونپور کی دینی حالت کے بارے میں لکھا ہے: "اور مسجدوں کا یہ حال تھا کہ لوگ ناچ کرواتے اور ہندوؤں کی بارات اترتی اور شراب پیتے تھے"۔ (زادالتقویٰ) وہاں کی جامع مسجد کی جو حالت تھی اسکو اس دور کے ایک مشہور شاعر منشی عبدالحمید صاحب دماغ نے نظم کردیا ہے جسکے چند اشعار یہ ہیں:

جو مشہور کعبہ کے حالات ہیں — تھی اس سے بھی کچھ اس کی حالت ردی
مویشی یہاں باندھتے تھے کسان — وہاں تو بتوں ہی کی بھرمار...... تھی
یہاں لید و گوبر کا انبار تھا — وہاں تو صفائی تھی ہر طرح کی
وہاں تھا نہ اس طرح فسق و فجور — عبادت ہی تھی، گو بتوں ہی کی تھی
یہاں بر خلاف اس کے اندھیر تھا — برے کاموں کی سارے مرکز یہ تھی

وہ مسجد جو سلطان اولیاء عیسیٰ تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے شاہ ابراہیم شرقی نے تعمیر کرائی تھی جسمیں خود شیخ نماز پنجگانہ ادا کرتے تھے، جسمیں علماء کی نو سو پالکیاں نماز جمعہ کیلئے آیا کرتی تھیں اس کا یہ حال تھا تو دوسری مسجدوں کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا برابر اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح پھر سے یہ مسجد آباد ہو جائے۔ اہل بدعت جن کیلئے دن کی اذان تک نامانوس تھی اسمیں جمعہ باجماعت کو کب برداشت کر سکتے تھے مگر مولانا نے خدا کے اعتماد پر اس میں دوبارہ جمعہ قائم کر دیا، پہلا جمعہ جب آپ نے اس میں ادا کیا تو صرف پانچ آدمی شریک تھے، ایک مولانا اور انکے چچا شیخ امیر اللہ صاحب اور محلے کے تین اور مخلص آدمی۔ مولانا کے پوتے مولانا ابوالبشر صاحب راوی ہیں کہ اس زمانے میں مولانا کے اتنے دشمن ہو گئے تھے کہ انکی جان کو بھی خطرہ تھا چنانچہ آپکو قتل کرنے کی کوشش کی گئی مگر اللہ نے محفوظ رکھا۔ ایک بار کا واقعہ مولانا خود بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں منشی امام بخش صاحب رئیس جونپور کے مکان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ مجھ کو جاتے ہوئے ایک بوڑھی عورت نے دیکھ لیا اور وہ اس وقت ہانڈی لے کر دھونے نکلی تھی، جب وہ میرے پاس پہنچی تو یہ کہہ کر ہانڈی کھینچ کر پھینک ماری کہ یہی وہ نیا مولوی ہے جس نے دن کو اذان دلائی ہے"۔ (ص ۳۲)

اس فقیر نے دین جاری کرنے میں جس قدر کوشش کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک ملک پھرتا رہا اور قرآن شریف لکھ کر اور تجارت کر کے اپنا خرچ چلاتا رہا یہاں تک کہ سفر سے آکر سواری کا خرچ قرض لے کر ادا کرتا تھا اور جس مقام میں جاتا تھا وہاں اکثر مقام میں جان کا خوف رہتا تھا اور فقیر اس وقت ہتھیار بند رہتا تھا۔ (اطمینان قلب)

مولانا کو دعوت و تبلیغ کے جرم میں کئی بار قتل کرنے کی سازش کی گئی مگر وہ اپنے فن سپہ گری سے ہر بار بچ نکلے مولانا مرحوم نے جو سنتیں زندہ کیں خدا کا شکر ہے کہ بڑی حد تک وہ آج تک جاری ہیں۔ جونپور جو ایک دو صدی پہلے مدارس عربیہ کا سب سے بڑا مرکز اور "شیراز مشرق" کہا جاتا تھا وہاں اب علم دین کے اعتبار سے ہر طرف سناٹا تھا، مولانا نے علم دین کی اشاعت کیلئے مدرسہ حنفیہ اور مدرسۃ القرآن جاری کئے۔ اول الذکر کے سب سے پہلے مدرس مولانا عبدالحئی[1] صاحبؒ کے والد محترم مولانا عبدالحلیم صاحبؒ ہوئے۔ خود مولانا عبدالحئی صاحب کی حفظ قرآن کی تعلیم یہیں شروع ہوئی۔ خدا کے فضل سے یہ دونوں مدرسے جاری ہیں مگر یہ مدرسے تو اب نام کے رہ گئے ہیں البتہ دوسرے مدارس نے اب ان کی جگہ لے لی ہے۔

جونپور کے نواحی میں کام کرنے کے بعد سید صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق بنگال تشریف لے گئے اور جب تک آپ بقید حیات رہے وہاں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔

بنگال اور آسام میں دعوت و تبلیغ کا کام

مولانا نے ۷۵ سال کی عمر پائی جسمیں تقریباً ۵۰ سال بنگال اور آسام اور انکے قرب و جوار میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے گزرے۔ مولانا کے بعض بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا بعض قدم جزائر تک بھی گیا ہے، اس درمیان ایک دو بار جونپور بھی آنا ہوا مگر یہاں زیادہ مدت تک قیام نہ رہ سکا۔ مولانا نے اصلاح و تبلیغ کا جو وسیع کام بنگال و آسام میں کیا اسکی پوری تفصیل ہمارے سامنے نہیں آسکی ہے[2] مگر بعض تذکرہ نگاروں

---

[1] مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ [2] کشکول باطن کی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے ہاتھ پر تقریباً ایک کروڑ آدمیوں نے اسلام قبول کیا یعنی مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت مولانا ہی کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے۔ اس روایت میں ممکن ہے کہ کچھ مبالغہ ہو مگر یہ تو واقعہ ہے کہ مشرقی بنگال کو مسلمان صوبہ بنانے میں مولانا کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ الحاج محمد اجمل خاں ایم اے اپنی کتاب "سوانح حیات خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ" میں لکھتے ہیں: اور زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اسکے بعد اس کثرت سے مسلمان ہونا

باقی اگلے صفحہ پر

اور بعض دوسرے بیانات سے اُنکے کام کی وسعت اور سعی مشکور کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے۔ مشاہیر جونپور میں ہے:

در ملک بنگالہ لکھوکھا مردم دست گرفتہ ایشانند شاید قریہ و بلدہ باقی نبودے کہ دراں مریداں و مستفیضان فیض نماندے۔ (ص ۳۶)

بنگال میں لاکھوں آدمی مولانا کے حلقۂ ارادت میں داخل ہیں کوئی شہر اور کوئی بستی باقی نہ ہوگی جہاں مولانا کے ارادتمند اور فیض یافتہ موجود نہ ہوں۔

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف کا بیان اوپر آ چکا ہے۔ چند جملے اور ملاحظہ فرمائیں:

در ہدایت خلائق بغایت می کوشید خصوصاً مردم ممالک بنگالہ از و مستفیض شدند دراں دیار طریق اسلام از یمن و برکت او خوب شیوع یافتہ۔ (ص ۱۷۱)

مخلوق کی ہدایت میں حد درجہ کوشاں رہتے تھے خصوصیت سے بنگال کے لوگ بہت زیادہ ان سے مستفیض ہوئے اس دیار میں ان کی برکت سے اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔

مولانا نے دو درجن سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں مگر ان کی للّٰہیت و کسر نفسی تھی کہ اپنی مساعی جمیلہ کا کسی کتاب میں مفصل ذکر نہیں کیا ہے جا بجا دو چار جملے مل جاتے ہیں جن سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فقیر کا تو حال یہ ہے کہ ہندوستان سے کلکتہ اور چاٹگام سے سندیپ[۳] تک اور ڈھاکہ سے سلہٹ تک سارے شہر اور گاؤں میں جو دیار مشرقی میں ہیں ہمیشہ سیر کرتا اور محافظت کرتا پھرتا ہے۔ اسی کام میں پچاس برس سے زیادہ مدت گزر گئی۔ (مراد المریدین)

مولانا پہلی بار ۱۲۵۰ھ میں جون پور سے کلکتہ روانہ ہوئے اس سفر کی مختصر روداد سنئے: اوپر ذکر آ چکا ہے کہ شوق کے باوجود حضرت سید احمد شہیدؒ نے جس طرح مولانا محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو تحریک جہاد کی شرکت سے روک کر معرکۂ بالاکوٹ سے پہلے ہی دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے ہندوستان کے مختلف خطوں میں روانہ فرما دیا تھا اسی طرح مولانا کرامت علی صاحبؒ کو اپنے یہاں مختصر قیام کے بعد واپس کر دیا اور ان کے لئے مشرقی ہند کا خطہ منتخب کیا۔ رخصت کرتے وقت فرمایا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ۔ مرشد کی ہدایت کے

شروع ہوئے کہ مشرقی بنگال پورا اور مسلمان ہو چکا ہے۔ یہ کوشش صرف جونپور کے ایک بزرگ کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنا دیا۔ آپ کا نام نامی مولانا کرامت علی صاحب رحمۃ علیہ تھا۔ (ص ۸۴، بحوالہ روایت مولانا عبدالباطن صاحب)

۳؎ جزائر ہند کے جزیروں میں ایک جزیرہ ۱۲۰۰

مطابق مولانا نے کچھ دن جونپور اور اسکے نواح میں اصلاح کا کام کر کے بنگال وآسام کا قصد کیا، جونپور سے روانہ ہوئے تو پہلی منزل کلکتہ ہوئی۔ جونپور سے کلکتہ پہنچنے میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا۔[۴۰] کلکتہ میں حضرت سید صاحب کے متعدد خلفاء ومتوسلین مثلاً مولانا وجیہہ محدث مدرس اول مدرسہ عالیہ مولانا حافظ جمال الدین صاحب، مولانا قاضی عبدالباری موجود تھے۔ مولانا کی آمد سے ان حضرات کو بیحد مسرت ہوئی۔ کئی دن کلکتہ میں مولانا کا وعظ ہوتا رہا جسکا عوام وخواص پر بڑا اچھا اثر ہوا پھر یہیں سے مولانا کے مشرقی بنگال کے تبلیغی دورے کا پروگرام بنا۔ مشرقی آسام اور بنگال میں مولانا کے دوروں اور ان کے کاموں کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ مولانا عبدالباطن صاحب کی زبانی مختصر روداد درج ذیل ہے:

حضرت مولانا جونپوری نے کلکتہ سے فارغ ہوکر بنگال وآسام کا دورہ بذریعہ بوٹ (دخانی کشتی) شروع کیا۔ اس وقت ریل وجہاز کی سہولتیں جو اب ہیں بالکل نہ تھیں جیسا کہ ذکر آیا ہے کہ جونپور سے کلکتہ پہنچنے میں ایک ماہ لگ گئے۔ سفر میں ہزاروں قسم کی دقتیں اور رکاوٹیں حائل تھیں ہر مشکل وآزمائش کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں دشمنان دین اور مخالفین شریعت کہیں کہیں راہ میں روڑے بن کر آتے۔ سید صاحبؒ کی دعاء خاص اور مولانا کے خلوص نیت کی برکت نے تبلیغی کام میں کہیں رکاوٹ اور تنزلزل پیدا ہونے نہ دیا۔ رفتہ رفتہ دشمن دوست اور مخالف شریعت پابند شریعت ہوگئے۔ مولانا کا صبح وشام کا مشغلہ رد شرک وبدعت تھا جسکو تقریر وتحریر سے ظاہر فرماتے رہے اس طرح ارکان دین اور احکام شریعت کو بسط کے ساتھ لوگوں کو سمجھاتے اور اسکا پابند کرنے کی کوشش کرتے۔ جس جگہ مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بنانے میں جد وجہد فرماتے جس جگہ مدرسہ یا مکتب کی ضرورت سمجھتے وہاں مدرسہ ومکتب قائم کراتے تاکہ لوگوں میں دینی ترقی کی بنیاد مستحکم ہو اور ہدایت وتبلیغ کی جڑیں مضبوط اور دیرپا ہو جس کا واحد ذریعہ دینی علم اور مدرسہ ہے۔ اس ضمن میں بے شمار غیر مسلم آپ سے متاثر ہوتے اور حلقہ بگوش اسلام ہوتے جاتے۔

سفری مدرسہ

حضرت مولانا کا سارا وقت اور سارا سال دورہ وسیاحت میں صرف ہوتا تھا اسلئے ضرورت وقت کی بنا پر اپنے ہمراہ سفری مدرسہ قائم کیا جس میں مقامی باشندوں کو تعلیم وتدریس کے

---

[۴۰] مولانا کے اہل خاندان اور خود مولانا کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا مع اہل وعیال روانہ ہوئے اور ہمیشہ اہل وعیال ساتھ رہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس سے پہلے بھی اس دیار کا سفر کر چکے تھے ورنہ ایک اجنبی جگہ مع اہل وعیال سفر کرنا ظاہری طور پر کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا گو کہ اللہ والوں کا معاملہ بالکل جدا ہوتا ہے۔ ۱۲

فقیہ پابند عمل و عقائد بنا کر اور احکام شریعت سے خوب واقف کرا کر اطراف و جوانب میں اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوت حق کے لئے بھیجے۔ اس سفری مدرسہ کے سارے اخراجات نیز طلبا کے مصارف خوراک کے مولانا خود کفیل ہوتے چونکہ آپ بوٹ کے ذریعہ دریائی سفر کرتے اور اہل و عیال بھی ہمراہ ہوتے اسلئے ایک بوٹ مدرسہ کیلئے بھی مخصوص تھا جس پر ظاہری تعلیم درستگی اخلاق و اخلاص اور ذکر و اذکار کا طریقہ اور مقامات سلوک کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ اس سفری مدرسہ سے جو حضرات فارغ ہو کر نکلے وہ خود ایک زبردست داعی و مبلغ ثابت ہوتے، ان صحبت یافتہ مبلغوں نے بنگال کے گوشہ گوشہ میں مولانا کی ہدایت کے مطابق اور انکے بتائے ہوئے دستور العمل کے موافق دین اسلام کی بہت ٹھوس خدمات انجام دیں جن کا مبارک اثر آج تک باقی ہے۔ غالباً غیر مسلموں تک پہنچنے کا یہی لوگ سب سے بڑا ذریعہ بنے۔

یوں تو مولانا نے پورے بنگال اور آسام میں دعوت و تبلیغ کا کام کیا مگر چند ضلعے آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا خاص مرکز رہے ہیں ہیں ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، دیناج پور، فرید پور، بریال۔ آسام میں گوالپارہ، کامروپ، دھوبڑی وغیرہ خاص طور پر نواکھائی میں مولانا کا کام سب سے زیادہ تھا۔ مولانا عبد الباطن صاحب اپنے سفر کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

احقر نے متعدد بار اضلاع بنگال ڈھاکہ، میمن سنگھ، رنگ پور، دیناج پور، بریسال، فرید پور تیرہ واضلاع آسام میں گوالپاڑہ، کامروپ، دھوبڑی کے دیہاتوں کی سیاحت کی تو ہر جگہ مولانا کی اصلاح و تبلیغ کا اثر پایا بہت سے مقامات پر دورانِ سیاحت میں احقر کا گزر ہوا تو لوگوں نے بتایا کہ اس اطراف میں فلاں بزرگ کو مولانا کرامت علی صاحبؒ نے اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا تھا۔ ان بزرگ سے دیس کو بہت ہدایت ہوئی۔ خاص طور پر نواکھائی کا پورا ضلع مولانا کے حلقۂ اثر میں تھا، نواکھائی میں سید صاحب کے ایک خلیفہ حضرت مولانا امام الدین صاحب پہلے سے موجود تھے اور انہی کے ایما سے مولانا نے نواکھائی کو اپنے کام کا خاص مرکز بنایا۔ اسکی کچھ تفصیل مولانا کے پوتے کی زبانی سنئے:

"پھر نواکھالی کی طرف یہ تحریک اپنے پیر بھائی ولی کامل شیخ طریقت حضرت مولانا امام الدین صاحب مرحوم سوداارامی جو اجلۂ خلفاء سید صاحب ہیں تشریف لے گئے۔ نواکھالی پہنچنے پر حضرت مولانا جونپوری سے باشندگانِ نواکھالی بڑی عقیدت و محبت سے پیش آئے اور جلد مطیع و فرمانبردار ہو گئے اور صحیح معنوں میں نمونۂ انصار بن گئے اور مثل پروانہ مولانا پر نثار ہونے لگے اور مولانا کی خدمت گزاری کو سرمایۂ آخرت شمار کرنے لگے تو مولانا ان لوگوں کے حسن اخلاق سے بہت خوش ہوئے آپ کی مسرت اور دعا کا اثر آج تک نواکھالی اور اسکے سارے ضلع میں باقی ہے چنانچہ آج بھی باشندگان نواکھائی بہ نسبت اور اضلاع کے پابند شریعت اور اسلامی لباس کے شیدا ہیں، اس ضلع میں بکثرت مدرسے موجود ہیں، نمازیوں سے آباد مسجدیں آپکو گاؤں گاؤں میں ملیں گی، غریب گھرانہ بھی پردۂ شرعی کا پابند ملیگا، ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے کیلئے پالکی اور

کشتی کے علاوہ برقع کا رواج ہے، غریب چادر اور چھتری کو استعمال میں لاتا ہے۔ نواکھالی ضلع میں غسل کرنے کے لئے تالاب بنے ہوئے ہیں، عورتوں کیلئے یہ انتظام دیکھکر دل بہت خوش ہوا کہ ان کو بے پردگی سے بچانے اور عزت وعصمت قائم رکھنے کیلئے بانس کی ٹٹی کی بنی کشادہ سرنگ بناتے ہیں جس کا تعلق زنانہ مکان سے تالاب تک ہوتا ہے۔ عورتیں اس سرنگ کے اندر سے بے تکلف تالاب میں آکر غسل کرتی ہیں کہیں سے سامنا نہیں پڑتا۔ دین کی اہمیت ومحبت نے اس مشکل کام کو کتنا آرام دہ اور آسان بنادیا۔ مسلمانانِ نواکھالی کا یہ طریقہ نمونۂ عمل ہے۔ اس ضلع کے بچہ بچہ تک السلام علیکم جیسی بڑی سنت کے پابند ہیں۔ علماء وفضلاء اور طلباء کی تعداد بھی اس ضلع میں نسبتاً اور اضلاع کے بہت زیادہ ہے بنگال اور آسام کے اضلاع میں نواکھالی کے مبلغین ومدرسین دینی خدمت انجام دے رہے ہیں اور حضرت مولانا کی ہدایت کی توسیع میں لگے ہوئے ہیں۔

احقر نے متعدد بار اضلاع بنگال اور اضلاع آسام کے دیہاتوں میں سیاحت کی تو سب جگہ نواکھالی کے مولوی صاحبان کو دینی خدمت میں تن دہی وانہماک سے کام کرتے ہوئے پایا۔ دیہاتوں میں ان لوگوں نے مدرسے، مکتب قائم کئے، مسجدوں میں جمعہ وجماعت سے رونق بخشی، بچوں کو قرآن پاک وضروری مسائل دینیہ سے واقف کرایا، قرأت کی مشق کرائی۔ یہ سب حضرت مولانا کی تعلیم ودعا کی برکت کا اثر ہے۔ اس ضلع میں سمندر کے وسط میں ایک جزیرہ ہے جسکا نام سندیپ ہے، جس زمانہ میں احقر کا سندیپ جانا ہوا تھا تو معلوم ہوا کہ اس جزیرہ میں سات سو علماء موجود ہیں۔ اسی جزیرہ میں والد محترم مولانا حافظ عبدالاول رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔ اس جزیرہ کے علماء اور ان کی علمی ترقی عوام اور ان کی اخلاقی ترقی ومہمان نوازی کا کچھ حال حضرت والد مرحوم نے اپنے عربی کے ایک رسالہ "المجلۃ الادیب لرحلۃ التہذیب" میں تحریر فرمایا ہے جو لائق دید ہے۔"

اس زمانہ میں بنگال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کیلئے کشتی کا استعمال ناگزیر تھا۔ مولانا کے ساتھ اہل وعیال اور طلبائے علوم دینیہ کا بھی ایک جم غفیر رہتا تھا۔ ان سب کے لئے کشتی کا انتظام کرنا پڑتا تھا اس پر مولانا کو روزانہ سیکڑوں روپئے خرچ کرنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے بسا اوقات مقروض ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی سخت عسرت وتنگدستی کا سامنا ہو جاتا تھا، کئی جگہ مولانا نے اپنی کتابوں میں ان دقتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اب کی بار سفر میں چند روز کچھ تکلیف ظاہری ایسی ہوئی تھی کہ بعضے ہمراہیوں کو کچھ وسواس آگیا تھا مگر ہم کو اللہ تعالیٰ نے استقامت کے ساتھ رکھا تھا۔" (مراد المریدین) دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اس فقیر کے ساتھ کئی بوٹ ہیں اور ایک سو روپیہ ہر روز کا خرچ ہے اور بعضے مقام سے لوگ دعوت کرکے فقیر کو لے گئے اور دس روز میں ہزار روپیہ خرچ کرنا پڑا اور ان لوگوں نے نہ سمجھا اور فقیر مقروض ہوگیا۔" (مراد المریدین)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انکے اندر کتنی دینی غیرت تھی ان کی دینی غیرت اور توکل نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے داعیوں سے ضروریات کے لئے زبان کھول دیتے، حالانکہ مقروض ہو گئے تھے۔ اس وقت کا ایک ہزار اس وقت کے پچاس ہزار کے برابر ہے۔ مولانا نے بنگال و آسام میں کتنی دقتوں اور مشکلات سے دعوت دین کا کام انجام دیا اسکی پوری تفصیل تو ہمارے سامنے نہیں ہے مگر مولانا کے پوتے مولانا کے سوانح حیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جس وقت مولانا کی تشریف آوری بنگال میں ہوئی تو آپ نے دیکھا اور سنا کہ بہت سے مقاموں میں اسلام صرف نام کا رہ گیا ہے اور وہاں تبلیغ کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت مولانا نے ان مقامات کا دورہ خصوصیت کے ساتھ فرمایا اور جو جو مشکلیں پیش آئیں ان سب کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے ہدایت فرماتے۔ وعظ سناتے اور احکام شریعت بتلاتے رہتے، سخت سے سخت تکلیف نے بھی آپ کو ارادہ و عزم سے ہٹنے نہ دیا مصائب و مشکلات کے پہاڑ نے آپ سے ٹکر لی مگر آپ کے قدم ہمیشہ ثابت قدم رہے بلکہ دین کیلئے سرفروشانہ رفتار اور بھی تیز تر ہو گئی، مولانا کے پرانے خدام سے سنا گیا کہ بعض مقاموں میں مولانا کو سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں کہیں کہیں فاقے کرنے پڑے کسی مقام پر صرف کدو جوش دے کر فاقہ توڑا گیا، ایک مقام پر کئی دن تک صرف کدو اُبال کر گذر کی گئی۔ حضرت مولانا اور انکے مخلص ہمراہیوں کو ان حالات میں برکات اخروی کا مشاہدہ ہوا بعض جگہ دشمنانِ دین اور خلاف شرع پیروں نے مولانا کو ہلاک کرنیکی ناپاک کوشش کی، آپ بطور احتیاط اعداءِ دین کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے بوٹ کو ساحل دریا سے دور لنگر انداز کرتے اور بنگلہ ترجمان کے ذریعہ بنگلہ زبان میں مسائل دینیہ لوگوں کو بتلاتے، جہلاء اور پابندِ رسوم عوام ان دینی احکام و مسائل کو دینی بات اور اپنی رسومات اور اپنے عقیدے کے خلاف تصور کر کے دشمنی اور ایذا رسانی کیلئے کمر بستہ ہو جاتے اور کنارۂ دریا سے بوٹ پر پتھر اور ڈھیلے مارتے۔ طرح طرح کی ایذا پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اسی طرح کے واقعے مولانا کو سفر بنگال میں متعدد مقاموں میں پیش آتے رہے۔ جب اہل بنگال دو چار روز ان دینی باتوں کو دور سے سنتے اور مولانا کے استقلال اور اسلامی جاہ و جلال کو دیکھتے تو یہ سمجھ کر کہ یہ شخص بے غرض ہم لوگوں کو ایسی ہی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جسمیں ہمارا فائدہ اور خیر خواہی ہے، یک یک دو دو کر کے بوٹ پر آتے اور توبہ کرتے، داخل بیعت ہوتے اور تابع فرمانِ شریعت بن جاتے، اس وقت مولانا نے اصلاح کا صرف ایک ہی پہلو پیش نظر رکھا تھا کہ لوگوں کو نرمی کے ساتھ سمجھا کر شرک سے توبہ کراتے، کلمہ پڑھوا کر سنتے اور اسکی تصحیح فرماتے اسکے معنی سمجھاتے اور درستگیٔ اعتقاد کی پوری کوشش فرماتے کہ دین کی بنیاد اسی پر قائم ہے، اسطرح ارکانِ اربعہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر بیعت لیتے اور اس پر پابندی کا اقرار لیتے جب اسطرح اصلاح و ہدایت ہو چکتی تو پھر رسومات جہالت اور بدعتوں کی تردید فرما کر سنت کی حقیقی شاہراہ پر لا کر کھڑا کرتے، اس مقام پر پہنچ کر وہ صحیح العقیدہ اور پختہ مسلمان بن جاتا۔

اسی سلسلۂ ہدایت میں آپ کا گزر ایک ایسی بستی میں ہوا جہاں ایک مسلمان زمیندار بڑا ظالم اور عالموں کا دشمن رہتا تھا۔ اس نے بعض عالموں کو بے قصور مروا ڈالا تھا۔ جب اسکو آپ کے پہنچنے کی خبر ہوئی تو اس نے مولانا کو بلوا بھیجا، آپ کے معتقدین میں کہرام مچ گیا اور اکثر لوگ مولانا کو یہ مشورہ دینے لگے کہ کسی صورت سے اسکے آدمی کو ٹال دیا جائے اور موقع پاکر کسی وقت یہاں سے چلے جائیے، لیکن مولانا کچھ ہراساں نہیں ہوئے اور ان لوگوں کو تسلی و تشفی دے کر اس زمیندار کے مکان پر تشریف لے گئے، وہ زمیندار معمولاً کسی کو زمین پر بھی بیٹھنے کا اشارہ نہیں کرتا آپ کو دیکھتے ہی ایک کرسی بیٹھنے کو دی اور آپ سے خدا کی وحدانیت پر تکرار شروع کر دیا مولانا ہرچند اسکو سمجھاتے اور بہت نرمی سے دلائل عقلی و نقلی بیان فرماتے لیکن وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتا تھا، پھر کہنے لگا کہ آپکی تقریر سے اگر میں نہ سمجھوں تو آپ کیا کیجیئے گا، تو آپ نے فرمایا ایک بار دوبار تین بار سمجھاؤنگا۔ تب اس نے کہا اگر جب بھی نہ سمجھوں؟ اس وقت آپنے مجاہدانہ انداز میں میان سے تلوار کھینچ لی اور فرمایا کہ اس سے تمکو سمجھاؤنگا۔ مولانا کے اس جوش اسلام اور جرأتِ ایمانی کو دیکھ کر وہ ڈر گیا اور کہنے لگا کہ میں نے اس مسئلہ کو کئی بار اور مولویوں سے بھی دریافت کیا لیکن وہ لوگ میری ایسی کہتے اور حضور حضور کہنے لگتے تب میں نے غصہ ہو کر ان کے قتل کا حکم دیا کہ ان کے ذریعہ دین کی بربادی ہوتی ہے۔ بیشک آپ سچے ہادی ہیں آپ کی ذات سے دین اسلام کی تازگی اور رونق ہوگی۔ پھر اس زمیندار نے آپکے ہاتھ پر بیعت کی اور سچا معتقد ہو گیا۔

اعلان حق اور بعض باطل عقیدوں کی اصلاح

مولانا ابتداء میں بدعت و رسومات کے بارے میں زیادہ سخت انداز اختیار نہ فرماتے بلکہ حکمت و موعظت سے سمجھاتے مگر جو لوگ کسی درجہ میں مولانا سے مانوس ہو جاتے انکو بدعات و رسومات سے ضرور روکتے آپکی ان اصلاحی کوششوں کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا گیا اہل بدعت اور دوسرے لوگوں نے آپکی مخالفت شروع کردی اسی کے ساتھ انگریزوں کے کارندوں اور ان کے ہمنوا علماء نے سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو اور ان کی تحریک دعوت وجہاد کو پورے ہندوستان میں بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا جسکا اثر بنگال کے جہلا میں بھی تھا۔ جب ان مخالفین کو معلوم ہوا کہ مولانا جونپوریؒ بھی اس سلسلۂ طلائے ناب کی ایک زریں کڑی ہیں تو انکی اور مخالفت بڑھ گئی۔ روزانہ سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل شہید کے بارے میں اور ان کی کتاب تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم کے بارے میں مولانا سے استفسار کرتے، ایک طرف مولانا کی اصلاحی کوششوں کی مخالفت تھی ہی ادھر سید صاحب کی نسبت نے اس مخالفت کو دو آتشہ کر دیا مگر مولانا نے ایکدن کیلئے بھی مداہنت سے کام نہیں لیا بلکہ نہایت صفائی سے جواب دیا بلکہ بعض سوالوں کے جواب میں پورا پورا رسالہ لکھ ڈالا۔ "ذخیرۂ کرامت"، "قامع المبتدعین" اور "استقامت" وغیرہ اسی سلسلہ کی باقی حصہ پر

دوسری اور آخری قسط

کیا چین میں نئے دور کا آغاز ہے؟

چین میں آج مسلمانوں کی حالت

سرزمین اسرار، چین کے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وہاں کے مسلمانوں کے صحیح اعداد وشمار کا پتہ لگانا بہت دشوار کام ہے جس کا بڑا سبب شاید یہ ہے کہ وہاں مردم شماری مذہب سے صرف نظر کرکے کی جاتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں کیمونسٹ انقلاب سے پہلے وہاں کی مردم شماری کی رو سے مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تھی مگر اب جن چینی ذمہ داروں سے ہماری ملاقات ہوئی ان کا کہنا ہے کہ آج کل مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔

لندن سے شائع ہونے والے میگزین "اریبیا" (ARABIA) ستمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں چینی مسلمانوں کی صحیح تعداد کی دشواریوں پر بحث کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ادارہ "ٹائم آف امریکہ کی طرف سے شائع ہونے والے عالمی اٹلس کا کہنا ہے کہ چینی مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ ہے۔ ورلڈ فیکٹ بک ۱۹۷۴ء کے مطابق یہ تعداد ۱۰ کروڑ ۸۰ لاکھ پہنچتی ہے۔ میگزین اریبیا کا مزید بیان ہے کہ امریکہ کی مشہور عالمی جغرافیائی تنظیم کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والے اٹلس میں بتایا گیا ہے کہ چینی مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ مذکورہ میگزین اپنی بحث وتحقیق ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کیمونسٹ انقلاب سے پہلے کی مردم شماری کو سامنے رکھتے ہوئے اگر سالانہ صرف ۲ فیصد کا بھی اضافہ مان لیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶ کروڑ سے دس کروڑ ہونی چاہئے۔ چینی مسلمانوں کی تعداد کی دشواریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے انھیں استاذ عنایت ترکستانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق دو بڑی قومیتوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ **ترکستانی مسلمان:۔** ان کی اصل وہ ترکی عنصر ہے جس سے الیغور، قازاق، قرگیز، ازبک، تاتار اور تاجک قبائل نکلے ہیں۔ ان کا مغربی ترکستان کے لوگوں سے خونی، لسانی، تاریخی اور دینی رشتہ ہے اور یہ لوگ چینیوں میں دستار بند مسلمان کے نام سے مشہور ہیں کیونکہ ہمیشہ پگڑی باندھے رہتے ہیں۔

۲۔ **چینی مسلمان:۔** جو "ہان ہوی" کے نام سے مشہور ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اصل ترکستان کے قبیلہ الیغور اور عرب و ایران کے ان لوگوں سے ہے جو خاندان "تانگ" کی حکومت (۶۱۸ ـــ ۹۰۷ء) کے دوران چین میں داخل ہوئے اور چینیوں سے شادیوں کے ذریعہ ان میں گھل مل گئے مگر پھر اسلامی عقائد اور خاص روایات کی وجہ سے یہ لوگ الگ قومی اقلیت بن گئے۔

ترکستانی مسلمان الیغوری زبان بولتے ہیں۔ مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں بستے ہیں۔ یہ علاقہ شمال مغربی چین میں ۱۸۱۴ و ۸۲۸ را کم² کی مساحت پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۶۷ء سے جب سے کہ چینیوں کے زیر حکومت یہ علاقہ آیا "سنکیانگ" کے نام سے مشہور ہوا۔ "سنکیانگ" چینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "نئی زمین" کے ہیں۔

کیونسٹ انقلاب کے بعد چینی حکومت نے مشرقی ترکستان کو چین کا ایک ایسا علاقہ شمار کیا جس کی اپنی ذاتی حکومت ہو اور اسے "ذاتی حکومت کی حامل الیغوری سنکیانگ ریاست" کا نام دیا۔ اس اسکیم کے بعد مسلمان مقامی سرکاری عہدوں پر فائز ہونے لگے مگر تمام کلیدی عہدے چینیوں کے ہاتھوں میں رہے۔

"ہان ہوی" مسلمان، چین کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً دو ہزار مسلمان "تونگ ہچیان" "باوان" اور "سالار" خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو "قانصو" اور "شنگائی" کے علاقوں میں آباد ہیں۔

چہار جاعتی گٹھ جوڑ کے زوال کے بعد

ظالم ماؤتسی تانگ کی وفات ۱۹۷۶ء کے بعد چینی سماج میں ایک اہم انقلاب یہ آیا کہ نئے سیاست دانوں نے ان لوگوں پر مقدمہ دائر کیا جو ماؤ کے برپا کردہ ثقافتی انقلاب میں شریک رہے اور ملک کو تباہ و برباد کرنے کی مہم میں خبیث ماؤ کے دست راست بنے رہے۔ ماؤ کے انہی پٹھوؤں کو چہار جاعتی گٹھ جوڑ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

باہر سے آنے والا ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ نئی تحریک کی چینی عوام میں بڑی مقبولیت ہے۔ ماؤ کے عہد میں بے چارے عوام پورے دس سال آہنی پردے کے پیچھے عزلت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ چینی عوام ایسے لوگوں سے بہت خوش رہتے ہیں جو چہار جماعتی گٹھ جوڑ کے عہد پر سخت تنقید کریں۔ یہاں تک کہ یہ گٹھ جوڑ ایک ایسی الگنی بن گیا ہے جس پر ہر قصور اور ہر خطا کو لٹکا دیا جاتا ہے۔

زندگی کے مکمل انجماد و تعطل کے بعد اب چینیوں نے رواداری اور لچک کا نیا راستہ اختیار کیا ہے اور آج انھیں اچھی طرح اس تخریب و بربادی کا شعور ہے جو ہلاکت خیز انقلاب اور خوفناک عزلت نے چھوڑے ہیں۔

لیکن مسلمان سرد آہیں بھر رہے ہیں

آج بھی مسلمان سرد آہیں بھر رہے ہیں اور وہ کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ دَورِ بربریت ختم ہوا۔ آج بھی وہ اپنے زخموں کو تازہ پا رہے ہیں اور اپنے مذہب، تمدن اور روایات کو باقی رکھنے کے لئے جہاد جاری رکھنے پر مجبور ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ظلم، بربریت، قہر اور جبر کے سامنے چٹان ثابت ہوئے ہیں ان کے خون سے ہولناک ہولیاں کھیلی گئیں لیکن انھوں نے مذہب کو ہاتھوں سے نہ چھوڑا جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تمثیلاً فرمایا ہے "انگارے کو مٹھی میں لینے والے کی طرح"۔ (کَالْقَابِضِ علیٰ الْجَمْرِ)

اسلام ہر دور اور ہر ملک میں کوہِ گراں کی طرح عالی مرتبت، پُروقار راسخ اور ہر دلعزیز رہا ہے۔ کوئی بھی قوت، خواہ کیسی ہی قہر و جبروت کی مالک رہی ہو، اسلام کی جڑوں کو اکھاڑ نہ سکی۔ اسلام کا یہ ایسا معجزہ ہے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات مرتسم ہوگئی ہے کہ ان کا مذہب حق ہے۔ حق بہر حال غالب رہے گا، مغلوب بن کر نہیں رہ سکتا۔ انجام کار غلبہ ہمیشہ حق کے ساتھ رہا ہے۔

کوتاہ بین نگاہوں کو اگر باطل اور دجل و فریب کا استعلاء نظر آتا ہے تو یہ "فریب نظر" ہے۔ سمندر کا جھاگ بہت تیز بڑھتا ہے لیکن موجوں کی قوت اور ہواؤں کی تندی کے آگے ٹک نہیں سکتا، ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ، وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔

وہ جو جھاگ ہے، سو جاتا ہے سوکھ کر، اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے، سو رہتا ہے زمین میں۔

سورۃ رعد، آیت ۱۷

ہم نے چینی مسلمانوں میں دینی بیداری دیکھی، وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مذہب وروایات پر سختی سے گامزن ہیں۔ مسجدیں دوبارہ تعمیر کی جارہی ہیں، قرآن مجید کے نسخے تقسیم ہو رہے ہیں اور چین کی فضائیں پنج وقتہ اذانوں سے گونج اٹھتی ہیں۔ چین کے مختلف علاقوں میں ۲۲ ہزار سے زیادہ مسجدیں ہیں۔

ظالم ماؤ کی موت کے بعد مختلف قراردادوں کے ذریعے مذہبی معلات میں حکومت رواداری سے کام لے رہی ہے جس سے مسلمانوں کا وثوق بحال ہو رہا ہے۔ ان قراردادوں میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ۱۹۷۸ء میں چینی قانون میں سدھار کا اعلان ہوا جس کی رو سے ملک کے تمام لوگوں کو مذہبی عقائد کی آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں تعزیرات میں دفعہ ۱۴۷ کے تحت ایک نئے مادے کا اضافہ ہو جس کی رو سے ان سرکاری افسروں کو جو مذہبی امور میں بے جا مداخلت یا اقلیت کے عادات ورسوم کی غیر قانونی طور پر توہین کے مرتکب ہوں گے دو سال قید کی سزا ہوگی۔

ان اصلاحات کی رو سے مسلمانوں کے معاملے میں بعض ایجابی پہلو کے ساتھ بہت سے سلبی پہلو بھی نکلتے ہیں مثلاً تمام اہل وطن کے لئے حریت اعتقاد کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرسکتا، جب کہ دستور لامذہبیت یا الحاد کی دعوت کی کھلی چھوٹ دیتا ہے۔

تعزیری قانون کی یہ دو عبارتیں بڑی خطرناک ہیں: "افسروں کی بے جا مداخلت" اور "غیر قانونی طور پر توہین"۔

بڑی آسانی سے ان عبارتوں کی تفسیر مسلم مصالح کے خلاف بھی کی جاسکتی ہے۔

۲۔ بند مساجد کو وا کرنے اور منہدمہ مساجد کی دوبارہ تعمیر یا مرمت کرنے کی اجازت۔ بلکہ بعض مساجد کی مرمت اور ائمہ کے تقرر میں حکومت بطور خود دلچسپی لے رہی ہے۔ نماز اور وعظ ودرس کی پوری ظاہراً آزادی ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو خارجی روابط کی اجازت مثلاً حج اور بعض خارجی اسلامی کانفرنسوں میں چینی مسلمانوں کی شرکت، اسی طرح باہری مسلم وفود کو بھی چین آنے کی اور اپنے مسلم بھائیوں سے ملنے کی اجازت۔

چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے ۱۹۸۰ء میں شیخ محمد جحجوم کی قیادت میں اور ۱۹۸۴ء میں رابطہ کے سب سکریٹری شیخ محمد ناصر عبودی کی قیادت میں دو سعودی وفدوں کی چین میں آمد اسی

سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ان دونوں وفدوں کی چین میں آمد سے خارجی مسلمانوں کو چینی مسلمانوں کے احوال وکوائف سے بڑی حد تک واقفیت ہوئی، اور "رابطۂ عالم اسلامی" اور "چینی اسلامی جمعیت" کے باہمی تعاون کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔

۴۔ مسلمانوں کے لئے دینی تعلیمی سہولتوں کی فراہمی مثلاً ترجمۂ قرآن مجید اور بعض دینی اور اسلامی تاریخی کتابوں کی طباعت، مجلہ "چینی مسلمان" کا چینی اور الیغوری زبانوں میں دوبارہ اجراء، دارالسلطنت میں واقع "بکین اسلامی درسگاہ" کی پھر دوسالوں سے سرگرمی، اس وقت درسگاہ میں ۸۶ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ۱۵ طالب علم مشرقی ترکستان (سنکیانگ) کے ہیں اور باقی چین کے مختلف حصوں کے ہیں۔

اس درسگاہ میں ہائی اسکول پاس طلبہ کے داخلے لئے جاتے ہیں۔ دینی علوم اور عربی زبان وادب پر مشتمل ۴ سالہ کورس سے فراغت حاصل کرنے کے بعد طلبہ امامت اور وعظ وارشاد کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔

"چینی اسلامی جمعیت" کے بیان کے مطابق درس گاہ کے دس فارغین مزید اعلیٰ دینی اور عربی تعلیم کے لئے ازہر شریف بھیجے گئے ہیں۔ "چینی اسلامی جمعیت" جس کی زیر نگرانی یہ درس گاہ چل رہی ہے، سنکیانگ (مشرقی ترکستان) کے صدر مقام "آرامچی" میں اسی طرح کی ایک اور دینی درسگاہ کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسی علاقے میں آباد ہے۔ درسگاہ کی تاسیس کے تمام منصوبے مکمل ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب نفاذ بھی عمل میں آجائے گا۔

۵۔ "چینی اسلامی جمعیت" کی دوبارہ سرگرمیاں:۔ یہ جمعیت ۱۹۵۲ء میں حضرت برہان شہیدی کی سرپرستی میں قائم کی گئی تھی پھر ۱۹۵۹ء میں معطل کر دی گئی تھی۔ اب جمعیت پھر پوری تندہی اور دلچسپی سے مسلمانوں کے حالات بہتر بنانے کے سلسلے میں کام کر رہی ہے۔ یہ جمعیت چینی کیمونسٹ پارٹی کے ماتحت ایک سرکاری ادارہ ہے جو مذہبی امور کو پارٹی کی سیاست کے مطابق نافذ کرتا ہے؟!! (جیسا کہ جمعیت کے بعض ذمہ داروں نے ہمیں بتایا)

اس وقت جمعیت کے دو سو ارکان اور حاجی علی جان جی امیر ہیں جن کے ۱۵ نائب ہیں، چار نائب واحد صافی بکین میں اور باقی مختلف علاقوں میں رہ کر کام کر رہے ہیں۔ چین کے مختلف

حصتوں میں جمیعت کی ۵۰ شاخیں ہیں۔ سنکیانگ (مشرقی ترکستان) میں صرف دو شاخیں ہیں جن کا مرکز "آرامچی" میں ہے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت سنکیانگ ہی میں آباد ہے۔
جمعیت کے ذمہ داروں نے بتایا کہ عنقریب سنکیانگ میں کچھ اور شاخیں کھولی جائیں گی۔

مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل کو حل کئے بغیر "چینی رواداری" کا نعرہ لفظِ بے معنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مسلمانوں کے سامنے رکاوٹوں پر رکاوٹیں

آج چین اور سنکیانگ میں مسلمان کئی ایسی مشکلات سے دوچار ہیں جو ان کی پسماندگی اور بگاڑ کی اصلاح میں روڑا بنی ہوئی ہیں۔ یہ مشکلات دراصل ماؤتسی تانگ اور اسکے چہار جماعتی گٹھ جوڑ کی گندہ سیاست کی پیداوار ہیں جس کی مشق کیمونسٹ اقتدار، خاص کر مسلمانوں پر کرتا رہا ہے۔
ان مشکلات کو درج ذیل میدانوں میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ سیاسی میدان

مسلمان چینی سماج کے ایک بڑے حصّے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ رواداری اور مساوات کا تقاضا ہے کہ انھیں سیاست و قیادت کے میدانوں میں بھرپور موقع ملے۔ سنکیانگ میں اسطرح کے اقدام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ مسلمان کم از کم اپنے علاقے میں قائدانہ مناصب پر فائز ہو سکیں اور "ذاتی حکومت" کا نعرہ صرف دلاسانہ رہے بلکہ اپنے حقیقی معنی میں جلوہ گر ہو نیز اس علاقے کے مسلمانوں کو خارجی مسلمانوں سے روابط بڑھانے کی مزید آزادی ملنی چاہئے تاکہ ان کے اندر تعمیر و استقرار کا شعور پروان چڑھے۔

۲۔ اقتصادی میدان

باہر سے چین میں داخل ہونے والے کو مسلم علاقوں کی پسماندگی اور سابق حکومت کی مسلم علاقوں میں بے توجہی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اقتصادی پیداوار کے لحاظ سے سنکیانگ سب سے زیادہ مالدار علاقہ ہے مگر یہ عجیب تماشہ ہے کہ اسکا معاشی، اقتصادی اور عمرانی معیار کسی طرح بھی بیسویں صدی سے مناسبت نہیں رکھتا، یہ علاقہ اپنی تہوں میں پٹرول، سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ اور رانگا جیسی قیمتی دھاتوں کو لئے ہوئے ہے۔ علاقے کے بعض حصّوں میں وافر مقدار میں الیورانیم کی بہترین قسم بھی نکلتی ہے۔ اس علاقے کی زمین بہت زرخیز بھی ہے اور زراعت کیلئے ہر طرح سے موزوں ترین، بالخصوص دریائے تاریم کی وادی۔ یہ دریا ۱۶۰۰ کم لمبا ہے۔

باقی صــ پر

کوائف جامعۃ الرشاد

جامعۃ الرشاد نے تعلیم و تربیت کے میدان میں ماضی سے مضبوط رشتہ قائم رکھتے ہوئے، جدید حالات و رجحانات اور نئے تعلیمی تقاضوں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا ہے، عربی و فارسی کے اعلیٰ درجات و نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمری اور نرسری درجات و مراتب کا بھی نظم کیا ہے، چنانچہ اس کے تحت کئی پرائمری اسکول اور چار نرسری اسکول چل رہے ہیں، ایک پرائمری اسکول "اسلامیہ مکتب" کے نام سے اور ایک نرسری اسکول "رشاد نرسری اسکول" کے نام سے جامعہ کے کیمپس ہی میں چل رہے ہیں بقیہ دور و قریب کے دیگر مقامات پر۔

ماہ گذشتہ ۲۰ رفروری ۱۹۸۳ء کو پرائمری سیکشن کا ایک تعلیمی ٹور ہوا ضلع جونپور کے تاریخی و تعلیمی مراکز کی سیر کرائی گئی تاکہ طلبہ میں تحصیل علم کا شوق بڑھے اور ایک دوسرے سے استفادہ و افادہ کا ذوق پیدا ہو، یہ ٹور جامعہ کے پرائمری سیکشن کے لائق و تجربہ کار استاذ مولوی عبدالرحمٰن صاحب سلفی اور محمد سجاد صاحب قاسمی کی نگرانی و سرپرستی میں بحسن و خوبی انجام پایا۔

جامعہ کے تحت چلنے والے چار نرسری اسکولوں کا ۲۸ رفروری ۱۹۸۳ء کو یکروزہ پروگرام بعنوان "اسلامک کلچرل پروگرام" بمقام مسلم مسافر خانہ اعظم گڈھ منعقد ہوا، یہ پروگرام جناب ابو طالب اعظمی صدر اور جناب ڈاکٹر عبداللہ عمار صاحب سکریٹری ایبوم سوسائٹی اترپردیش کی کوششوں کے نتیجہ میں زیر عمل آیا شہر کے عمائدین اور طلبہ کے سرپرست بھی شریک ہوئے۔

پروگرام کے مطابق قرأت، نظم خوانی، تقریر اور مکالمہ کا انعامی مقابلہ ہوا، مرزا اعجاز بیگ ایڈوکیٹ شمیم احمد صاحب محمد آبادی اور ابو طالب صاحب اعظمی نے تحکیم (ججی) کے فرائض انجام دیئے، رشاد نرسری اسکول فرسٹ آیا، ایبوم نرسری اسکول یوسف پور، مدرسہ تعلیم و تربیت کسمی خورد اور ایبوم نرسری اسکول غازیپور بالترتیب دوسرے، تیسرے اور چوتھے نمبر پر رہے۔

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعہ نے اپنے دست مبارک سے فرسٹ آنیوالے رشاد نرسری اسکول کو بطور اعزاز و انعام ایک پیتل کی شیلڈ اور بقیہ تینوں کو ایک ایک اسٹیل کپ عنایت فرمایا۔

پروگرام کے اخیر میں بعنوان "نئی تعلیمی پالیسی" ایک بزم مباحثہ بھی منعقد ہوئی جس میں متعدد اہل علم اور دانشوروں نے اظہار خیال کیا۔ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے نئی تعلیمی پالیسی کے خدوخال اور اس کے مضر اثرات کو شرح و بسط کے ساتھ اجاگر فرمایا، پھر دعا کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

جامعۃ الرشاد ایک معیاری عربی درسگاہ، جدید و قدیم علوم کا سنگم اور ملی کاموں کا مرکز ہی نہیں ہے بلکہ یہاں طلبہ کی علمی و معاشی زندگی کو باوقار و خود کفیل بنانے کے لئے دستکاری۔ مثلاً کتابت، جلد سازی، موم بتی سازی وغیرہ کے شعبے بھی شروع ہی سے قائم ہیں اور بحمد اللہ اب تک بہت سے طلبہ اور نوجوانوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ امسال مارچ ۱۹۸۵ء سے جامعہ کی نگرانی میں جناب وکیل احمد صاحب انصاری جوائنٹ سکریٹری جامعۃ الرشاد کی مخلصانہ کوششوں کے نتیجہ میں، شعبہ ترقی اردو بیورو دہلی (B. P. U.) کی طرف سے فن کتابت کا باضابطہ مرکز قائم ہوگیا ہے۔ اس کا مدرسہ سے کوئی قانونی تعلق نہیں ہے، البتہ نگرانی مدرسہ کی ہے۔

ترقی بیورو کے قواعد و ضوابط اور پروگرام کے مطابق ۱۳،۱۴ مارچ ۱۹۸۵ء کو اسٹاف اور طلبہ کا انٹرویو لیا گیا اور حسب ذیل جگہوں کے لئے تقرر عمل میں آیا:-

(۱) ہیڈ کاتب: جناب ابوالحسنات صاحب فاضل دیوبند بمشاہرہ ایک ہزار (۱۰۰۰) روپئے۔

(۲) اسسٹنٹ کاتب: جناب عبدالرحیم صاحب اعظمی بمشاہرہ آٹھ سو (۸۰۰) روپئے۔

(۳) پارٹ ٹائم سپروائزر: جناب منور علی صاحب اعظمی بمشاہرہ تین سو (۳۰۰) روپئے۔

(۴) فل ٹائم پیون: جناب شکیل احمد صاحب بمشاہرہ چار سو پچاس (۴۵۰) روپئے۔

(۵) کتابت کے لئے منتخب شدہ ہر طالب علم کو ایک سو تیس (۱۳۰) روپئے ماہوار وظیفہ ملے گا۔

تحریری و زبانی امتحان کے بعد پچیس (۲۵) طلبہ کا داخلہ منظور ہوا ہے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۸۵ء سے باقاعدہ کتابت کی کلاسوں (مشق و تمرین) کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔

اسٹاف کی تقرری اور طلبہ کے داخلہ کی منظوری وغیرہ جملہ کارروائیاں، ترقی اردو بیورو گورنمنٹ آف انڈیا (B. P. U.) کے نمائندے محترم جناب محمد ندیم خاں صاحب غوری کی موجودگی میں انھیں کی ہدایت کے بموجب انجام پائیں۔

اس مرکز کتابت کے قیام سے توقع ہے کہ نونہالان ملت، بالخصوص طالبانِ علومِ دینیہ بیش از بیش فائدہ اٹھائیں گے۔ (ع۔م)

بابری مسجد کی فریاد

مولوی انصار اظہر معروفی ——— استاذ جامعۃ الرشاد۔ اعظم گڑھ

فکرِ دیں کر مسلماں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

بے بسی سے گھٹن میں پڑی زندگی — کوئی کرتا نہیں صحن میں بندگی
کیسی ہے یا خدا مجھ پہ یہ بے کسی — کب تلک میں گوارا کروں بے رخی

غفلتیں چھوڑ انساں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

میرے دامن میں کتنی تمنائیں ہوئیں — مجھ پہ لاکھوں نے اپنی جھکائی جبیں
سو زمینوں سے افضل ہے میری زمیں — گرچہ نا اہل اس پہ کریں نہ یقیں

یوں نہ اجڑے گلستاں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

پڑھ لو اسلاف کے کارنامے ذرا — جاں نثاری نظر آئے گی جا بجا
آرزو بس تھی آئے انھیں جب قضا — دین کی سربلندی میں آئے خدا

سوچ انجام ناداں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

کیا نہیں آج تم میں عمرؓ اور علیؓ — کھو گئے خالدؓ و سعدؓ جیسے جری
مٹ گئی تیری دنیا سے کیوں برتری — اٹھ پڑو وقت ہے کارآمد ابھی

جیت لے آج میداں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

خواب غفلت سے بیدار ہو جا بشر — خستہ حالی پہ میری کرو کچھ نظر
یہ منادی کرادو شہر در شہر — ورنہ ذلت اٹھاؤ گے تم در بدر....

چھوڑ دنیا کا ساماں خدا کے لئے
جان و تن کر دے قرباں خدا کے لئے

جامعۃ الرشاد کے اساتذہ کے کچھ فرائض و حقوق

اساتذہ اور دیگر متعلقین جامعۃ الرشاد کے لیے کچھ اخلاقی اور قانونی ضوابط مقرر ہیں، یہاں صرف اخلاقی ہدایتوں کا اور ان کے حقوق میں تنخواہوں کے معیار کا ذکر کیا جا رہا ہے، پورے قانونی فرائض و حقوق کا ذکر کسی دوسرے موقع پر آجائے گا :

(۱) حضرات اساتذہ اور دیگر متعلقین ادارہ اپنے فکر و عمل میں اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں ان باتوں کو اپنا مطمح نظر بنائیں جو ادارہ کے مقاصد و عزائم اور طریقۂ تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں نصاب تعلیم والے پمفلٹ کے اندر اور "دینی مدارس اور ان کی ذمہ داریاں" والی کتاب میں اور مختلف رودادوں میں درج ہیں

(۲) اعلیٰ علمی ذوق کے ساتھ اساتذہ حضرات کی خصوصیت سے یہ اخلاقی اور دینی ذمہ داری ہے کہ وہ حقیقی معنی میں متبع سنت اور اذا رأوا ذکر اللہ کی تصویر بنیں، اور یہی جذبہ اور کیفیت طلبہ کے اندر بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں، اساتذۂ کرام یہ حقیقت کسی وقت فراموش نہ کریں کہ ان کا منصب نیابتِ رسول ہے، ان کو خود اپنے فکر و عمل میں اس منصب کا نمونہ بننا ہے، اور تعلیم و تدریس کے ساتھ اس منصب کی عملی ذمہ داری کا احساس طلبہ میں پیدا کرنا اور اس کے لیے فکر مند رہنا ان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے، آپ غرور نفس اور علم کے پندار سے بچتے رہیے، تواضع و خاکساری کو اپنا شیوہ بنائیے، اگر آپ ایسا کریں گے تو ان شاء اللہ من تواضع للہ رفعہ اللہ (جو خدا کی غرض سے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا کرتے ہیں) کے مصداق بن جائیں گے۔

(۳) اساتذہ حضرات کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آپ کے اندر جتنا علم کا رسوخ اور تحقیق و مطالعہ کا ذوق اور محنت و لگن ہوگی اور فرض نماز و روزہ کے ساتھ ذکر و اذکار اور ادائے نوافل کا جتنا اہتمام ہوگا اسی اعتبار سے طلبہ کے اندر یہ چیزیں پیدا ہوں گی، یہ مدرسہ تعلیم گاہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی ہے، اس لیے آپ تعلیم گاہ اور تربیت گاہ کے حقوق اس طرح ادا کیجیے جو ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

اساتذہ کا معیار تنخواہ عربی درجات میں اساتذہ کی تنخواہوں کے تین معیار ہوں گے (ابتدائی اور ثانوی اور اعلیٰ، ابتدائی معیار تین سو پچاس روپے ماہوار سے

شروع ہوکر چھ سو تک جائے گا، اور ترقی بیس روپیہ سالانہ ہوگی، ثانوی معیار چار سو روپیہ ماہوار سے شروع ہوکر آٹھ سو روپے تک جائے گا، ترقی ۲۵ روپیہ سالانہ ہوگی، نئے فارغ طلبہ سے اگر درس و تدریس کا کام لیا جائے گا تو ایک سال تک ان کو ضروری اخراجات کے بقدر رقم دی جائے گی، اس کے بعد پھر ترقی دی جائے گی، خصوصی حالت میں ابتدائی یا ثانوی معیار کے اساتذہ کو دو تین سال کی ترقی ابتدا میں بھی دی جاسکتی ہے، مگر پھر اتنے سال ان کو ترقی نہ دی جائے گی. ان دونوں معیاری گریڈوں کے علاوہ کسی فن کے مخصوص اور ممتاز اساتذہ کو ایک ہزار سے بارہ سو یا اس سے کچھ زیادہ تنخواہ دی جاسکتی ہے، ابتدائی معیار کے اساتذہ کا کام اگر خاطر خواہ رہا تو ان کو دوسرے معیار میں بھی لیا جاسکتا ہے، اور دوسرے معیار کے اساتذہ کو اعلیٰ معیار میں بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن اس کا فیصلہ ناظم کی رپورٹ کی روشنی میں مجلس تعلیمی کرے گی، ادارہ کے اندر رہنے والے کسی استاذ کو ٹیوشن کی اجازت بالکل نہ ہوگی اور عربی اور حفظ کے اساتذہ کو ادارہ سے باہر رہنے کی صورت میں بھی ٹیوشن کی اجازت نہیں ہوگی۔

حافظہ کے درجہ کا ابتدائی معیار دو سو پچاس روپیہ سے چار سو روپیہ تک اور ثانوی معیار تین سو سے پانچ سو روپیہ تک ہوگا، اور مکتب کے اساتذہ کا ابتدائی معیار ڈھائی سو روپیہ سے تین سو پچاس روپیہ تک ہوگا، اور ثانوی تین سو پچاس سے پانچ سو تک ہوگا۔

اگر اساتذہ کو کھانے کی رعایت دی گئی تو ناشتہ اور بجلی کا خرچ اور چارپائی کا کرایہ ادا کرنا ہوگا جو اساتذہ مدرسہ کے احاطہ کے اندر رہیں گے ان کو روزانہ بعد مغرب عربی، حفظ اور مکتب کے اقامتی بچوں کی تعلیم اور تعلیم کی نگرانی کے لیے وقت دینا ضروری ہوگا، اسی طرح بعد عشاء ان کے مطالعہ اور مذاکرہ کی نگرانی بھی کرنی ہوگی شہر کے اساتذہ عصر کی نماز پڑھ کر یہاں سے جائیں اور صبح کو وقت سے ۱۵ منٹ پہلے آجائیں۔

حفظ کے درجہ میں جو حضرات کام کریں گے ان کی ذمہ داری ہوگی کہ درجہ کے علاوہ صبح کو نماز فجر سے آدھ گھنٹہ پہلے سے لیکر بعد نماز فجر کم سے کم آدھا گھنٹہ اور بعد نماز مغرب سے عشاء تک اور عشاء کے بعد ایک گھنٹہ اپنی نگرانی میں بچوں کو پڑھائیں اور یاد کرائیں، فجر کی اذان سے کچھ پہلے خود بھی اٹھیں اور بچوں کو اٹھا کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔

الرشاد کی ڈاک

۲۹ر جنوری ۸۸ء

مکرمی و محترمی جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب، دامت فیوضکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دسمبر ۱۹۸۷ء کا "الرشاد" ملا، اس کا شکریہ ! اکتوبر میں اس پرچہ کو مولانا عباس ندوی صاحب جو میرے بڑے مخلص اور گہرے دوستوں میں ہیں انکے گھر دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا ندوی صاحب نے آپ کا غائبانہ تعارف بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا اور پھر "رشحات" پڑھنے کو کہا۔ جس وقت میں آپ کی تحریر پڑھ رہا تھا سچ پوچھئے تو کھو سا گیا۔ اس کی تشنگی اس قدر بڑھی کہ "الرشا" کا خریدار بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ تو آپ کے جادوئی قلم کے اثر کا نتیجہ تھا

مولانا ندوی سے کہہ رکھا ہے کہ آپ جب بھی جامعۃ الرشاد چلیں تو میں بھی ساتھ ہولوں گا۔ وعدہ تو کر لیا گیا ہے دیکھیئے اس کی تکمیل کب تک ہوتی ہے۔

الرشاد میں پروفیسر اسلم صاحب (پنجاب یونیورسٹی لاہور) کا معلوماتی مضمون "محمد بن عبدالوہاب" بہت پسند آیا۔ حالانکہ یہ بات عوام میں مشہور ہے کہ وہابی مسلک والے کسی امام کی تقلید نہیں کرتے ہیں مگر سعودی عرب کے وہابی امام حنبلؒ کے مقلد بھی ہیں، یہ ایک نئی بات معلوم ہوئی اس مضمون سے۔

فرقہ نصیری، دروزی، علوی وغیرہ عقائد کے لوگ جو بکثرت شام، عراق، اردن، مصر اور لیبیا ملکوں میں آباد ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ کلیدی عہدے پر بھی فائز ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں ان کے عقیدے و مذہبی خیالات سے متعلق تاریخی و معلوماتی مضمون شائع کئے جائیں نیز مذہب اسلام میں ان فرقوں کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اس نئے معلوماتی موضوع پر آپ کی تحریر آنی چاہئے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ویسے میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں، میرے لئے دعا فرماتے رہیں۔ مجھ ناکارہ سے جس طرح کی خدمت لینا چاہیں حاضر ہوں۔

محمد رفیع الدین ساتھوی، اسسٹنٹ ٹیچر ہائی اسکول میگرا، پوسٹ میگرا، ضلع گیا، بہار۔

مورخہ ۱۵؍ فروری ۱۹۸۸ء

مولانائے محترم ! السلام علیکم

عرصۂ دراز سے "ارشاد" پڑھتا آرہا ہوں جو میرے مکان پر رام پور میں آتا ہے۔
اس مرتبہ آپ کا ایک پیغام تمام مسلمانوں کے نام پڑھا جو دل میں جاں گزیں ہو گیا اس لئے آپ کو خط لکھنے کی ہمت کی۔ میر بساط ہی کیا ہے کہ آپ جیسے عالم دین اور لائق احترام ہستی کی شان میں کچھ کہہ سکوں مگر آپ کا درج ذیل پیام صفحہ ۳۰ پر پڑھ کر میں آپ کو مبارک باد دینے کے لئے مجبور ہو گیا۔

صفحہ ۳۰: "لیکن یہ بات بھی عرض کرنا ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت ساری دنیا کے اور خصوصیت سے ہندوستان کے مسلمان دو دھڑوں میں بٹ گئے ہیں، ایک دھڑا سعودی حکومت کا حامی ہے، دوسرا ایران کا۔ ہمیں اس میں احتیاط کرنی چاہئے ایسا نہ ہو کہ ہمارے وہ مشترکہ مسائل جن پر ہماری ملی زندگی کی بقا و فنا کا دارو مدار ہے اس بے فائدہ اختلاف سے متاثر ہو جائیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ ۷۰ ــ ۷۵ برس سے کمزوری رہی ہے کہ وہ اپنے مسائل سے زیادہ عالم اسلام کے مسائل سے دلچسپی لیتے رہے ہیں، لیکن یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ اپنی گٹھری گنوا کر ہم دوسروں کی گٹھری بچانے کی فکر میں گھلتے رہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے اردو زبان کا مسئلہ ہے، دینی تعلیم کا مسئلہ ہے مسلم پرسنل لا اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کا مسئلہ، مساجد و مقابر اور خاص طور پر بابری مسجد کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے راقم الحروف کی دردمندانہ اپیل ہے کہ اگر آپ سعودی حکومت کی حمایت کر رہے ہیں تو ضرور کریں اور اگر آپ ایران کے حامی ہیں تو اس کی حمایت کریں مگر خدارا اس خلیج کو اتنا نہ بڑھائیں کہ ہمارے مشترکہ مسائل پس پشت پڑ جائیں اور ہم آپس میں دست و گریباں ہو جائیں اور فرقہ پرور دشمن طاقتیں اس سے فائدہ اٹھائیں۔"

آپ لائق صد تحسین ہیں۔ خداوند کریم آپ کے اس پیام پر سب مسلمانوں کو بلا تفریق عقیدہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ب تک بڑے سے بڑے اخبار یا رسالہ نے یا بڑے سے بڑے عالم دین نے بھی ایران عراق تنازعہ میں جو کچھ شائع کیا یا فرمایا ہے، اس میں جانب داری ضرور شامل رہی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ

کچھ لوگ ایران کے نقیب بن گئے تو کچھ سعودی عرب (عراق) کے ماؤتھ پیس۔ بہرحال۔
آپ سے گزارش ہے کہ "الرشاد" کی کسی قریبی اشاعت میں اپنے متذکرہ بالا پیام کو اور ELABORATE کرنے کی مہربانی فرمائیں۔ والسّلام
فقط سیّد محمد ماجد رضوی، پی۔ڈبلو۔ڈی انجینیئر، گجرولا، ضلع مرادآباد

۱۶ر فروری ۸۸ء

محترم المقام جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب

محترمی۔ مکرمی! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ "الرشاد" کے پرچے ملے۔ جی ہاں! میں نے مولانا علی میاں مدظلہ کو دارالمصنفین کے سلسلہ میں آنجناب کے نام کی سفارش کی تھی مگر مولانا افسوس ہے کہ موصوف کی طرف سے اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ہم نے حیدرآباد میں تدوین تاریخ مسلمانان ہند کی غرض سے ایک اکیڈمی قائم کی ہے اس غرض کے لئے ایک جامع خاکہ SYNOPSIS بھی مرتب کیا ہے اور اسکا وسیع پیمانہ پر ہم نے ملک بھر میں تعارف کرایا ہے لوگوں نے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ۱۵، اگست ۱۹۸۷ء کو ایک ہسٹری کانفرنس بھی منعقد کر چکے ہیں جو بہت کامیاب رہی۔ اس کی روداد بھی شائع ہو چکی ہے۔ ہسٹری اکیڈمی کا محرک یہ بنا کہ انگریزوں کے دور سے ایک سازش کے طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے اور اس دور میں دانستہ طور پر یہ کوششیں اور تیز ہو گئی ہیں۔ تاریخ کے من مانے شگوفے چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو اور خاص طور سے مسلمانوں کی نئی نسل کو گمراہ کرنا اور ان کو احساس کمتری اور احساس ندامت میں مبتلا کرنا ہے۔ اس کی پشت پر فرقہ پرست عناصر ہیں۔ تاریخ کے سلسلہ میں ہمارا نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ تاریخ حکمرانوں اور سلاطین کے کارناموں اور ان کے واقعات پر مشتمل بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ تاریخ قوموں اور ملّتوں کی ہوتی ہے۔ اس پہلو سے ہمارے یہاں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس دور میں اس کی ضرورت اور شدید ہو گئی ہے۔ اس کام کے بارے میں جہاں دوسرے دانشوروں سے ہماری خط و کتابت رہی ہے وہیں مرحوم جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

سے بھی خط وکتابت تھی اور مرحوم ہماری بات کو پسند فرما رہے تھے اور ان کے اندر اس کام کو اور اس نہج پر کرنے کی آمادگی پیدا ہو رہی تھی اور وہ ہر ممکن تعاون اور ہماری مدد کرنے پر آمادہ تھے۔ اسی دوران ان کے انتقال کے حادثہ کی خبر اچانک ملی۔ اس سے قلب بہت متاثر تھا۔ رات کو یہی سوچتے کرمیں سو گیا۔ نصف رات کو اچانک آنکھ کھل گئی اور دماغ کے پردہ پر دو نام مرتسم تھے۔ ایک آنجناب محترم کا نام اور دوسرے خلیق نظامی صاحب کا نام۔ دارالمصنفین کی خدمات قابل قدر رہی ہیں، اس کے کام کا معیار اور مقام بھی ہے۔ ہندوستان کے آج کے دور میں دارالمصنفین کے کام کو مزید مستحکم اور منظم کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً تاریخ کے اس پہلو کے لحاظ سے جس کا میں نے ادھر تذکرہ کیا ہے۔

کاش۔ اللہ کا کوئی باصلاحیت بندہ اس کام کو اٹھائے تو یہ بڑی خدمت کا کام ہے۔ موجودہ دور کے لئے بھی اور آئندہ نسلیں بھی مرہون منت ہوں گی، اجر کا کام بھی ہے۔ اس سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ ہند کی نشأۃ ثانیہ اور احیائے اسلام کی کوششیں وابستہ ہیں۔ بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ تاریخ پر کام جوڑنے کے لئے کرنا ہے نہ کہ توڑنے کے لئے۔ آج فرقہ پرستوں کی کوششیں جس رخ پر جا رہی ہیں اس کام کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ علمی، تحقیقی اور معیاری انداز سے تاریخ کی تدوین کا کام کیا جائے تاکہ غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔

ان احساسات و جذبات کے تحت ہی آنجناب کا نام اچانک ابھرا اور اسی سے متاثر ہو کر مولانا علی میاں کو میں نے ایک خط لکھا تھا۔

"رہگزر" کے بارے میں آپ کے گرانقدر مشوروں کا شکریہ۔ انشاءاللہ روانہ کرتا رہونگا مگر ایک شرط آپکے اوپر عائد کرونگا وہ یہ کہ آپ کے مشوروں اور رہنمائی کا میں محتاج ہوں، آپ اس سے مجھے نوازتے رہیں رہگزر کے ذریعہ میں ایک فکری تحریک چلا رہا ہوں اس کی جھلک اس کے ہر مضمون میں آپ پائیں گے۔ اس سلسلہ میں آپ کی مدد اور تعاون کی مجھے ضرورت ہے۔ اکیڈمی کا مزید لٹریچر بھی روانہ کر رہا ہوں۔

امید ہے کہ آنمحترم کا مزاج بعافیت ہوگا اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی عافیت میں رکھے اور دین وملت کی خدمت سے لگائے۔۔۔ دعاؤں کا طالب، خاکسار عبدالحفیظ خاں حیدرآباد

۲۲ر فروری ۱۹۸۸ء

الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وخاتم النبیین وعلیٰ اٰلہ واصحابہ ومن تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔ امابعد

محترم المقام صاحب الفضیلۃ والمعالی استاذی الموقر المحترم۔ حفظکم اللہ ورعاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ بفضلہ تعالیٰ اور موصوف کی دعاؤں سے بعافیت ہے۔ امید کہ عزت مآب کے بھی مزاج معلّٰی بعافیت ہوں گے۔

دعوت دین کے شمارہ میں "بابری مسجد کی بازیابی کا طریقۂ کار" پڑھا اور آپ کی جرأت وحوصلہ سے ازحد متاثر ہوا یوں تو آپ کی کتابیں، رسالہ، مضامین ایک زمانہ سے پڑھتا رہا ہوں اور ہمیشہ عقیدت واحترام کی نگاہ سے آپ کو دیکھتا رہا ہوں۔ بارہا آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔ اور آپ کے مشفقانہ و ہمدردانہ رویے اور حسن سلوک سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بلاشبہ آپ ہمارے بزرگ ہیں، محترم ہیں اور اسلاف کا نمونہ ہیں۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب حضرت والا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں میرے داخلہ کے لئے سفارش فرماکر احسان عظیم کیا تھا حالانکہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مسئلہ پر آپ کی تحریر سے ندوہ میں کھلبلی کا ماحول تھا۔ بہرصورت۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا بیان نہایت بزدلانہ اور مفاد پرستانہ ہے۔ موصوف کے بیان پر گرفت فرماکر آپ نے برمحل ایک اہم کام کیا ہے جس کی سخت ضرورت تھی۔ قوم وملّت کی ہمدردی وبہی خواہی کا لبادہ پہن کر ملت میں افتراق وانتشار ڈالنے کی سعی کرنے لگتے ہیں اور انجام وعاقبت سے آنکھیں موند لیتے ہیں مادیت اتنی غالب آگئی ہے کہ اسلام کے نام لیوا ہی مسلمانوں کا سودا کرنے لگتے ہیں تاکہ اپنا مفاد حاصل کرسکیں۔ حضرت والا نے بروقت جواب دے کر ایک مصلح کا فرض ادا کیا ہے جس پر مبارکباد کا ہدیۂ حقیر لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ خداوند آپ کے سایہ کو تادیر قوم کے سر پر باقی رکھے، آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہر مرد مومن کو جرأت وہمت، بے باکی وبے لوثی نصیب فرمائے آمین ثم آمین۔

آج کل بندہ ایک ہائی اسکول میں (جو آئندہ کالج ہو رہا ہے) عربی ادب کی خدمات پر مامور ہے

دعا فرمائیں کہ خدائے تعالیٰ اپنی مرضی ومنشا کے مطابق کام لے لے اور ہر طرح کی خیانت سے بچائے۔ آمین۔اب اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ پاک آپ کے سایہ کو ہمیشہ ہمارے سروں پر باقی رکھے۔آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے اور خدمات کا اجرعظیم دے۔آمین ثم آمین۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خاکستر۔ صابر اعظمی۔ مقیم ابوظبی

۲۲ر دسمبر ۱۹۸۷ء

مکرمی مجیب اللہ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"الرشاد" مطالعہ میں آتا رہتا ہے۔ ماشاء اللہ خوب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے۔ "الرشاد" بابت اکتوبر،نومبر ۱۹۸۷ء کے تعلق سے چند باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب نے اپنے مضمون "افتاء اور اس کی ذمہ داری" میں صہ۳۶ پر سورۂ نمل کی آیت ۳۱ کا ترجمہ واوین میں ان الفاظ میں دیا ہے "میرے مقابلہ میں زورآزمائی سے کچھ نہ ہوگا، خیریت اس میں ہے کہ اسلام قبول کرلو اور حکم بردار ہوکر حاضر ہوجاؤ، تمہاری شیخی اور تکبر میرے آگے کچھ نہ چلے گی"۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ صاحب مضمون نے "خط یہ تھا" کے الفاظ کے بعد یہ ترجمہ لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خط کی کل عبارت بس یہی ہے جس کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، حالانکہ یہ صرف خط کے آخری فقرہ (آیت ۳۲) کا ترجمہ ہے اور خط کی ابتدائی عبارت آیت ۳۰ میں آئی ہے۔ اس لئے مناسب ہوتا اگر (مثلاً) یوں لکھا جاتا کہ "خط کا ایک فقرہ یہ تھا"۔

دوسری عرض یہ ہے کہ اس ترجمہ میں الفاظ" اسلام قبول کرلو" اور" تمہاری شیخی اور تکبر میرے آگے کچھ نہ چلے گی" متن قرآن سے زائد ہیں اور انھیں قوسین میں بھی نہیں دیا گیا ہے۔ جس سے اشارہ ہے کہ یہ توضیحی الفاظ ہیں۔ بحالت موجودہ پوری عبارت واوین میں دینے سے تو یہی اظہار ہوگا کہ یہ پوری عبارت اصل عربی عبارت کا ترجمہ ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔ مناسب ہوتا اگر ایڈیٹنگ کے دوران اس کا خیال کرلیا جاتا۔

ایک اور عرض یہ ہے کہ اس مضمون کے اخیر میں جو صاحب مضمون نے فرمایا ہے کہ "واضح ہو کہ قرآن میں رجم کا حکم نازل ہوا تھا، بعد میں آیت رجم کی تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم بدستور باقی رہا..... الخ" اس فقرہ کو بھی آپ ایڈیٹنگ میں حذف فرما دیتے تو مناسب تھا اس لئے کہ آنجناب کے علم میں یہ بات ہے کہ یہ ادعا نزاعی ہے اور باوجود اس کے کہ یہ روایت حضرت عمرؓ کے حوالہ سے صحیح بخاری میں آئی ہے، ہر دور میں علماء کی اکثریت نے اس کی صحت میں کلام کیا ہے، مزید یہ کہ اس بات کے کہنے کی اور وہ بھی اس حتمی انداز میں، یہاں ضرورت ہی نہیں جب کہ اس کے بغیر بھی جو بات صاحب مضمون نے کہنا چاہا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

ایک اور عرض یہ ہے کہ آیات قرآنی کے حوالوں میں سورہ کے نام کے بعد رکوع کا نمبر دیا جاتا ہے یہ طریقہ اب بالعموم متروک ہے۔ اب تو آیات کا نمبر دیا جاتا ہے جو متعلقہ آیت کے تلاش کرنے کے لئے زیادہ آسان ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے آج کل جو قرآن شریف شائع ہو رہے ہیں ان میں ہر آیت کا نمبر دینے کا رواج عام ہو چلا ہے۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

امین الحسن رضوی

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ہمدرد نگر، نئی دلی ۶۲

بقیہ: مولانا کرامت علی جونپوریؒ......

کتابیں ہیں، اسمیں سب سے پیش پیش کوئی مخلص الرحمٰن نام کا ایک غیر مخلص آدمی تھا جو کلمہ میں اپنا نام شامل کر کے اپنے ماننے والوں سے بیعت لیتا تھا کئی بار مولانا نے مناظرہ سے اسے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا، اسیطرح میلاد، ۶ ِ س فاتحہ رسمیہ وغیرہ کے بارے میں لوگ آپ سے استفسار کرتے اور الجھتے رہے مگر تمام حجت کے طور پر ان مسائل پر گفتگو فرماتے اور اپنے کام میں لگے رہتے۔

بنگال میں ایک فرقہ "منکرین جمعہ" کا پیدا ہوگیا تھا جو اپنے کو لاجمعہ کہتا تھا۔ اسکا سرگروہ مولوی عبدالجبار نامی ایک شخص تھا مولانا نے گو اپنے دلائل سے اس کے سرگروہ عبدالجبار کو خاموش کر دیا تھا اور اس نے مولانا کے ہاتھ پر توبہ بھی کی مگر پھر بھی اپنی سازشوں سے باز نہیں آیا اور مولانا کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ڈالیں مگر بفضلہ تعالیٰ آپ کے مخلصانہ کام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور تمام اہل مکر کو منہ کی کھانی پڑی۔

نئی کتابیں

(۱) چالیس سالہ دورِ آزادیٔ ہند اور مسلمان کیا کھویا کیا پایا؟

یہ کتاب دراصل مجموعہ ہے ان مقالات و تقاریر کا جو دو روزہ ہسٹری کانفرنس منعقدہ ۱۵ ار ۱۶ ار اگست ۱۹۸۷ء حیدر آباد کے موقع پر پڑھے گئے، موضوع سے متعلق ممتاز علما و مشاہیر نے اپنے بہترین نتائج افکار و تجربات پیش کئے ہیں۔ آزادی سے لے کر اب تک پورے چالیس برسوں میں، مسلمانانِ ہند کے سامنے کیا مسائل و مشکلات آئے اور کن مراحل و مناظر سے گزرنا پڑا۔ یہ ساری داستان اس مختصر سے مجموعہ میں سمیٹ دی گئی ہے، مختصر یہ کہ یہ مجموعہ معلومات کا گنجینہ ہے اور اس قابل ہے کہ ہر شخص اس کا مطالعہ کرے۔

آل انڈیا ہسٹری کانفرنس کا یہ پہلا قدم تھا اس اہم اور طویل المیعاد پروجیکٹ کا جو "دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا، ہمایوں نگر، حیدر آباد" کی طرف سے جناب عبدالحفیظ خاں صاحب نے بحیثیت صدر اکیڈمی مرتب فرمایا ہے۔ اکیڈمی کے مکمل پروگرام کا خاکہ اردو، انگریزی وغیرہ میں طبع ہو کر کافی مشتہر ہو چکا ہے۔ اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کی ایک دفعہ یہ ہے:

"اس کا منفی پہلو یا وقتی مقصد یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے ماضی کے خلاف جو منظم پروپگنڈا اور سازش کی جا رہی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور ہزار سالہ تاریخ کے خلاف اسکولوں میں بچوں کا جو زہر آلود ذہن بنایا جا رہا ہے، اس کو ناکام بنانا، بچوں کو اور نئی نسل کو حقیقت کی روشنی میں صحیح حقائق سے آگاہی دینا، پھر تازہ ترین تاریخ مکمل اعداد و شمار کے ساتھ لکھنے کا اہتمام کیا جانا تاکہ اس کے ذریعہ تعمیری منصوبوں کیلئے بنیادی مواد فراہم کیا جا سکے۔"

اکیڈمی کے صدر جناب عبدالحفیظ خاں صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، آپ نے ہمیشہ ملی مسائل میں مخلصانہ و درد مندانہ طور پر علمی و عملی حصہ لیا ہے اور نمایاں خدمات انجام دی ہیں، موصوف کا یہ پروجیکٹ بھی ملت کی ایک ناگزیر ضرورت اور بڑی خدمت ہے۔

بیس برس سے زائد عرصہ پہلے حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی مد ظلہ العالی نے اپنی بیش قیمت

تصنیف "تبع تابعین" کے مقدمہ میں اس ضرورت کا ذکر کیا ہے اور ابھی کچھ زمانہ پہلے جبکہ یہ اکیڈمی قائم نہیں ہوئی تھی ہماری ایک مجلس میں بڑے درد کے ساتھ اسی ضرورت کا احساس و اظہار فرمایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کار عظیم کی توفیق اس نے ایک اہل تر شخصیت جناب عبدالحفیظ خاں صاحب (حیدرآباد) کو بخشی۔ واللہ ولی التوفیق۔

۲۵۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت مجلد مع پلاسٹک کوٹیڈ سرورق مبلغ پچیس روپئے ہے۔ کتابت و طباعت اور کاغذ غنیمت ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا، ہمایوں نگر حیدرآباد نمبر ۵۰۰۰۲۸ ہے۔

(۲) ہندوستان اور نظام قضا | تالیف مولانا عتیق احمد صاحب بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ناشر امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر، سرورق خوشرنگ تقطیع خورد، قیمت پانچ روپئے، ملنے کے پتے :(۱) مکتبہ امارات شرعیہ بہار و اڑیسہ پٹنہ (۲) مکتبہ مجلس صحافت و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

زیر نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پوری کرتی ہے، واقعہ ہے کہ موجودہ حالات میں نظام قضا کے قیام کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ شدت اختیار کر گئی ہے۔ کتاب و سنت میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ غیر مسلم اقتدار میں قضا سے متعلق احکام و مسائل پر عمل سے چھوٹ مل گئی ہو، مولانا مجاہدالاسلام صاحب قاسمی قاضی شریعت دارالقضاء مرکزی (پٹنہ) نے کتاب پر پیش لفظ اور تعارف لکھا ہے اور بجا طور پر فرمایا ہے:

> "ہندوستانی مسلمان مغل اقتدار کے زوال کے بعد کئی مشکلات سے دوچار ہوئے اور آزادی کے بعد خصوصاً پچھلے چند برسوں میں مسلم پرسنل لا کو درپیش چیلنج کی وجہ سے پیچیدگیاں اور بڑھ گئی ہیں اگر مسلمان مضبوط شرعی تنظیم اور منضبط نظام قضا پورے ملک کے پیمانے پر منطقی موشگافیوں سے بلند ہوکر قواعد شرعیہ کی روشنی میں قائم نہیں کر لیتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور دینی معاشرت کو شدید خطرہ پیش آسکتا ہے۔"

فقہاء اسلام کی تصریحات کے مطابق چونکہ نظام قضا یا تقرر قاضی اصلاً امیرالمومنین یا سلطان مسلم کی جانب سے کیا جانا چاہیئے اس لئے عموماً یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ عامۃ المسلمین اس فریضہ کو کیونکر انجام دے سکتے ہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ اس صورت حال کا ہے جب امیرالمومنین یا مسلم سلطان یا مسلم حاکم موجود ہو اور بر محل اقدام پر قادر ہو ورنہ جہاں کوئی مسلمان حاکم نہیں ہے بلکہ غیر مسلم اقتدار ہے اور حاکم بھی غیر مسلم ہیں

...وہاں جماعۃ المسلمین کے نمائندے یعنی ارباب حل وعقد ہی کی طرف سے نصب قاضی کا فریضہ انجام دیا جائیگا اور یہ بالکل جائز ہوگا، اسی بات کو فقہی تصریحات و دلائل کے ساتھ واضح کرنے اور اس شرعی ضرورت کا احساس دلانے کی خاطر یہ کتاب لکھی گئی ہے، کتاب مستند و معتبر حوالوں سے مزین ایک مفید کوشش ہے اور تمام اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(۴) گنبد خضرا | کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ، تقطیع خورد، ضخامت ۴۳ صفحات قیمت پانچ روپیے
ناشر قاسمی پبلشنگ کمپنی، محلہ قاسمیہ، کوئل بھار ضلع بستی (یوپی)

زیر نظر کتابچہ جناب مولانا عبداللہ آزاد بستوی ثم قاسمی معلم زبان فارسی جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کی بہترین نعتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ زبان صاف شستہ اور پروقار ہے البتہ بعض اشعار دینی فکر و نظر کی خامی کے غماز ہیں مثلاً ع کعبہ جھکتا ہے روضۂ اطہر کے سامنے

آپ پر اے عرش کے مسند نشیں لاکھوں سلام

خضرا کا املا خضریٰ یعنی یائے ممدودہ کی بجائے یائے مقصورہ سے لکھنا صحیح نہیں ہے، کتاب کی قیمت بھی کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ (ع۔م)

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی اے میں اور فضیلت پاس کرنیکے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کرلیا ہے، کئی طلبہ داخل ہوکر فارغ ہوچکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے

اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں:

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ وقرآت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت وجلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر واشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دو درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ

تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے

ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درس گاہ، ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ لاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط وکتابت کرنا چاہیئے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ جون سے شروع ہوجاتا ہے اور عربی اور حفظ میں ۱۰ شوال سے داخلہ شروع ہوجاتا ہے اور ۲۰ شوال تک ختم ہوجاتا ہے۔

سدا شوبھا
ہمارے برنرز کا ایک بار تجربہ کریں
ہمارے برنرز آپ کا صحیح انتخاب
• فائر اینڈ فائر
• مونو پیکس
• ٹارگیٹ اور موگرا برنرز
• سبھی اسٹو کیلئے موزوں • قابل اعتماد
• دھوئیں کے بغیر نیلہ شعلہ • ایندھن
کے خرچ میں غیر معمولی کفالت کی خوبیاں
• لمبی مدت تک بغیر شکایت کے کام
اعلیٰ معیار اور مناسب دام.
آپ کے اپنے شہر کے ہر اسٹور میں
دستیاب ہے
RP
تیار کردہ :- ایم - آر - پروڈکٹس بمبئی ۸

JUNE
1988
ماہنامہ
جامعۃ
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دار التالیف و الترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ، یوپی

اسلامی فقہ (اول و دوم)

مرتبہ:۔ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب !

دو برس سے اصلی اسلامی فقہ بازار سے غائب تھی۔ بحمداللہ اب اسلامی فقہ کا پانچواں شاندار ایڈیشن تاج کمپنی نئی دلی سے شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے۔

مصنف موصوف نے اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس سے اب یہ بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ شروع میں اسلامی عقائد کے باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح معاشرتی و معاملاتی مسائل والے حصہ میں سیکڑوں جدید مسائل مثلاً خون چڑھانا، پوسٹ مارٹم، نسبندی اور نلکی زادہ، مصنوعی اعضاء وغیرہ کے احکام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں دیوانی اور فوجداری کے بقیہ ابواب مثلاً دعویٰ، قضاء و شہادت، حدود و قصاص، احکام سلطانیہ اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے، گویا شریعت اسلامی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ پڑ گئی ہو، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں اس سے زیادہ مفصل کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ تمام اہم مسائل میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بھی متن یا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ شریعت اسلامی کی وسعت کا پورا اندازہ ہو سکے اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اسلئے دو حصے میں کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف عام پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مفید ہے بلکہ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بھی ایک نادر تحفہ ہے، یہ کتاب ہر گھر اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے پہلے اسلامی فقہ کے چار ایڈیشن مکتبۃ الحسنات سے شائع ہو چکے ہیں، مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے مکتبۃ الحسنات کے موجودہ مالک کی بدمعاملگی کی وجہ سے ان سے دو برس پہلے اسلامی فقہ کا معاملہ ختم کر لیا گیا تھا، اس عرصہ میں انہوں نے عبارت کا تھوڑا ردو بدل کر کے قانون و اخلاق کے سارے حدود توڑ کر مولانا موصوف کی اسلامی فقہ اسی نام سے ایک غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کر لیا، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ بالکل نمایاں۔ بمصداق مثل "نقل را چہ عقل" کے تحت مسائل میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر بیٹھے ہیں،

بہر حال جس اصلی اسلامی فقہ کا لوگوں کو انتظار تھا اب وہ چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔

ملنے کے پتے } تاج کمپنی، ۱۵۱ ۳۱، ترکمان گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱، یوپی } منیجر دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد،

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ جامعۃ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۳۰/-
خصوصی معاون ۱۰۰/-
قیمت فی پرچہ ۲/-

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
چندہ ڈالر اجرنگ
$ 15/-

جلد نمبر ۱۵ | جون ۱۹۸۸ء مطابق شوال ۱۴۰۸ھ | شمارہ نمبر ۸۳

فہرست مضامین

مجلس ادارت

• مجیب اللہ ندوی (مرتب)
• ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مقیم ابوظبی
• عامر مجیب رشادی، مدینہ منورہ

• عبد المجید ندوی (شریک مرتب)
• ڈاکٹر مشیر الحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کشمیر
• احمد کمال عبد الرحمٰن رشادی ندوی

[illegible]
[illegible] صاحب ندوی

خط و کتابت
[illegible] - شاہ [illegible] - [illegible] اعظم گڑھ

[illegible] پریس [illegible] (یو۔ پی)

آزادی کے بعد ایک طرف ہماری صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے مسلمانوں کے سامنے نہ جانے کتنے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور تعلیمی مسائل کھڑے کر دیئے تاکہ مسلمان ان منفی کاموں میں الجھ کر رہ جائیں اور ان کی ساری طاقت و صلاحیت انہی منفی کاموں کی نذر ہو جائے۔ دوسری طرف حکومت نے ہندو فرقہ پرست جماعتوں کو پوری آزادی دی کہ وہ پولیس اور پی۔ اے۔ سی کی مدد سے مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو سے جب چاہیں اور جہاں چاہیں کھیل کرتی رہیں۔ آزادی کے بعد اب تک پندرہ ہزار فسادات ہو چکے ہیں۔ سرکاری اخبار "قومی آواز" کی رپورٹ کے مطابق صرف ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں نو سو سے زیادہ فسادات ہوئے۔ (قومی آواز ۹ مارچ ۱۹۸۴ء) جس میں اربوں روپئے کی مسلمانوں کی جائدادوں، مکانوں اور دوکانوں کا نقصان ہوا ہے اور پچاسوں ہزار مسلمان شہید کئے گئے۔

دو سال پہلے بارہ بنکی میں جو کچھ ہوا اور دو سال سے گاندھی جی کے اہنسا دیش گجرات میں جو کچھ ہو رہا ہے اور پچھلے سال میرٹھ میں فوج اور چیف منسٹر کی موجودگی میں حکومت یو پی کی پولیس اور پی۔ اے۔ سی نے ہندو غنڈوں کو ساتھ لے کر جس درندگی اور بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اس نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ اس بربریت کے ثبوت کے لئے صرف ملیانہ کی بربادی اور فتح گڑھ جیل میں لائے جانے والے چھ سو قیدیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ کافی ہے۔

جب سے ویر بہادر صاحب یو پی کے چیف منسٹر بنے ہیں انھوں نے طے کر لیا ہے کہ مختلف طریقے سے یو پی کے مسلمانوں کو اتنا دبا دیا جائے کہ وہ بہت دنوں تک ابھر سکیں۔ یا ہمیشہ کے

حالانکہ اس حکومت میں کئی بار [illegible] ان کے [illegible] سے حکومت [illegible]
حکم [illegible] ہوگیا ہے کہ اب ان کی [illegible] سے ظلم و ستم [illegible]
ہیں اس لئے ہندو ووٹ بٹورنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر
فرقہ پرستوں کو خوش کیا جائے۔ اب تک یوپی کے کسی چیف منسٹر نے اتنا کھل کر فرقہ پرستی کا
مظاہرہ نہیں کیا ہے کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ مرادآباد میں بے گناہ مسلمانوں پر پولیس نے
بے سبب گولی چلائی لیکن جب پولیس کے خلاف ایکشن کا مطالبہ کیا گیا تو حکومت نے اور فرقہ
پرستوں کے کتنے ذمہ دار یہ کہہ کر پولیس کی حمایت کرتے رہے کہ اگر اس کے خلاف کوئی
کارروائی کی گئی تو پولیس کا مورال گر جائے گا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے خلاف
کوئی کارروائی کی گئی تو آئندہ فسادات میں مسلمانوں پر گولیاں چلانے میں پولیس اور پی۔ اے
سی کے بہادر نوجوان ہچکچاہٹ محسوس کریں گے اس لئے انھیں جنگل کے قانون پر عمل کرتے
رہنے دینا چاہئے۔

اب یہی آواز میرٹھ کے گاؤں ملیانہ کی بربادی اور ہاشم پورہ کے اجتماعی قتل کے بعد اٹھ رہی ہے
کتنی شرمناک بات ہے کہ یوپی کے ہوم سکریٹری ماتا پرشاد صاحب اور آئی جی بشٹ صاحب یہ کہیں
کہ ہم کو اپنی پی۔ اے۔ سی اور پولیس پر فخر ہے۔ (انڈیا ٹوڈے) یعنی ان کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ
انھوں نے اتنے بے قصور مسلمانوں کا خون بہایا۔

یہ صرف مسلمانوں کی جان و مال کو غیر محفوظ کر دینے کا مسئلہ نہیں بلکہ آزادی کے بعد ان کی تہذیب
ان کی تعلیم، ان کی زبان، ان کے پرسنل لا اور ان کے مذہبی مقامات سب کو مجروح کر دیا گیا ہے
اور یہ کوشش برابر جاری ہے۔ مثال کے طور پر اردو زبان کو لیجئے جو اسی ہندوستان میں پیدا ہوئی
اور پھلی پھولی بلکہ یہ کہنے میں [illegible] مبالغہ نہ ہوگا کہ آزادی کی لڑائی میں عوام کے [illegible] بات کو ابھارنے
میں جتنا کام اردو سے لیا گیا اتنا ہندی یا ہندوستان کی کسی زبان سے نہیں لیا گیا۔ مگر چونکہ [illegible]
کی تہذیب سے قریب تر ہے اس لئے اس کے ساتھ غیر ملکی زبان سے بھی زیادہ
سوتیلے پن کا معاملہ کیا گیا۔

کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے [illegible] اور حکومت [illegible]
مقامات اور تاریخی عمارات کے سارے حصہ کو [illegible] سے [illegible]
ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اور جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اس صورت حال سے ہم کو گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ پوری ہمت اور قوت کے ساتھ نہ صرف منفی طور پر ان حالات کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ مثبت طور پر ہمیں پوری سنجیدگی سے یہ بھی سوچنا ہے کہ ہم کو اپنے اندر وہ کیا تبدیلی کرنی ہے اور کیا اقدامات کرنے ہیں جن سے آئندہ ہمارے دین، ہماری زبان، ہماری تہذیب اور ہمارے مذہبی مقامات کو مجروح کرنے کی کسی طبقہ یا اشخاص یا حکومت کو جرأت نہ ہو۔

ا۔ اس کے لئے ہمیں سب سے پہلے منفی تدبیر تو یہ اختیار کرنی ہے کہ ہم ہر محاذ پر فرقہ پرست اور جارحیت پسند طاقتوں کا پُرامن طریقے سے مقابلہ کریں، ان کے خلاف جلسے کریں، مظاہرے کریں اور ضرورت کے وقت گرفتاری دیں اور اگر کوئی طبقہ تشدد پر آمادہ ہو تو کسی قیمت پر تشدد نہ کرنے دیں اور قانونی تدبیریں جو ممکن ہوں انھیں اختیار کریں۔ اگر فرقہ پرستوں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز جلوس نکلے اور وہ مسلمانوں کو گالی بکیں تو حتی الامکان اشتعال میں نہ آئیں اور افہام و تفہیم سے کام لیں۔ لیکن اس سے ان کو باز رکھنے کی عملی کوششوں سے لاپرواہی نہ کریں۔ اس میں سنجیدہ ہندوؤں سے بھی مدد لیں۔

ب۔ دوسرے یہ کہ تمام مسلمان جماعتوں کو مل کر اپنی علیحدہ مضبوط سیاسی وحدت قائم کرنی چاہئے اپنی سیاسی وحدت میں حکمراں جماعت اور فرقہ پرست جماعتوں کو چھوڑ کر ساری مخالف پارٹیوں سے مدد لیں اور ان کو اپنا تعاون دیں مگر اس وقت آپ کی سیاسی وحدت کا واحد پروگرام یہ ہو کہ ایسی ظالم حکومت کو تخت و تاراج سے محروم کر دیں جس سے ہمارے دین، ہماری جان، مال اور عزت و آبرو سب کو خطرہ لاحق ہے۔ خاص طور پر حکمراں جماعت کے مسلمان ایم ایل اے اور ایم پی کو اپنے ماحول میں تنہا کرنے کی کوشش کریں اور ان کی مذمت کریں اور قائد جماعتوں کے سید شہاب الدین جیسے جری ایم پی یا [illegible] خان اور [illegible]
[illegible] کریں۔ [illegible]

ان منفی تدبیروں کے ساتھ ہم کو کچھ مثبت تدبیریں بھی اختیار کرنی ہوں گی۔

۱۔ سب سے پہلے ہم کو اپنے ایمان ویقین کو درست کرنا ہوگا اور فرض عبادات کی پابندی کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھانی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی مدد ہمارے ایمان ویقین کے اعتبار ہی سے ہوگی۔ گو ہمارے اندر ان ظالموں سے نمٹنے کی طاقت نہیں ہے لیکن خدا کی طاقت بہت بڑی ہے۔ وہ اپنے پرندوں مچھروں اور مکھیوں سے وہ کام لے لیتا ہے جو بڑے بڑے ایٹم بم سے نہیں ہو پاتا اسلئے اس کی نصرت کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہیں۔

۲۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ موت وحیات اور عزت وذلت سب اسی کے ہاتھ میں ہے وہ دینا چاہے تو کوئی چھین نہیں سکتا اور اگر وہ لینا چاہے تو کوئی دے نہیں سکتا۔ اس لئے خدائے بزرگ وبرتر کی ذات واحد ہی سے خوف و امید رکھئے۔ دنیا کے تھوڑے سے فائدہ کی امید میں دوسروں کے سامنے اپنے کو ذلیل نہ کیجئے اور نہ ملت کے وقار کو مجروح کیجئے۔

۳۔ ایمان ویقین کی درستگی اور عبادت کی پابندی کے ساتھ ہم کو آپس میں ایک مضبوط اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات آتارنی ہوگی کہ جو کلمہ گو مسلمان بھی خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت کا قائل ہے اور قرآن پاک کو خدا کی کتاب مانتا ہے ہم کو اس کے ساتھ ایک دینی بھائی جیسا معاملہ کرنا چاہئے۔ فقہی مسلک یا دینی مسائل کی تعبیر میں ہمارے اندر جو اختلافات ہیں ان سب کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو نہ ہم اب بدل سکتے ہیں اور نہ نفرت وحقارت کے ذریعہ اس کی اصلاح کر سکتے ہیں اس لئے مزید انتشار واختلاف سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اجتماعی مفاد کی خاطر انھیں برداشت کریں۔ اپنے اپنے مسلک پر مضبوطی سے عمل کریں مگر دوسروں کے مسلک اور عقیدہ کے معاملہ میں کوئی جارحانہ طرز عمل اختیار نہ کریں۔ خاص طور پر اس وقت ہمارے علماء اور راہنما حضرات اپنی ذاتی شخصیت اور مسلکی عصبیت اور سیاسی ومعاشی مفاد کے مقابلہ میں ملی مفاد کو ترجیح دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں تو عوام کا شعور ہمیں آتا بیدار کر دینا ہے کہ وہ ان کی شخصی راہنمائی کے منصب کو چھین لیں اور ملی حمیت وغیرت رکھنے والی ایک اجتماعی قیادت

اور راہنمائی کو وجود میں لائیں۔ ان کو پوپ پال ششم کی اس بات سے سبق لینا چاہئے " چند سال پہلے بحیثیت کرنڈ کیتھولک عیسائیوں کے راہنما پوپ پال ششم نے ویٹیکن سٹی اٹلی میں عیسائی اتحاد کے لئے ایک کانفرنس بلائی تھی جس میں دونوں فرقوں کے علماء سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ اگر عیسائی اتحاد کے لئے پوپ پال کے عہدے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا پڑے تو میں اس کے لئے تیار ہوں " ہم بھی اپنے مذہبی اور سیاسی راہنماؤں سے اجتماعیت میں گم کر دینے والی یہی آواز سننا چاہتے ہیں۔

۴۔ چوتھی بات یہ ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی جائے کہ چالیس برس تک ہم سیکولر جماعتوں میں اپنے زخموں کا مداوا ڈھونڈتے رہے۔ مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اس لئے اب ہم کو اس ملک میں مستقل طور پر اپنے سیاسی امتیاز کی صورتوں پر غور کرنا چاہئے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ مخالف سیاسی جماعتوں کا ہم تعاون بھی کریں اور ان سے تعاون لیں بھی۔ خاص طور پر ہریجن طبقہ میں جو نئی سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے اس سے ہم پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں مگر ذاتی مفاد یا چند سیٹوں کے لالچ میں ملت کے وسیع مفاد کا سودا نہ کریں۔ ہم کو ڈاکٹر مورلے کے واقعہ سے سبق لینا چاہئے۔ ڈاکٹر مورلے کی قیادت میں ایک وفد مغل بادشاہ فرخ سیر کے دربار میں بنگال کے گورنر کی یہ شکایت لے کر آیا تھا کہ انھوں نے کمپنی کی تجارت میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ جب یہ وفد دلی پہنچا تو فرخ سیر بیمار تھا۔ ڈاکٹر مورلے نے دربار شاہی سے علاج کی اجازت چاہی اور ان کو اجازت مل گئی اور بادشاہ چند دنوں میں ان کے علاج سے اچھا ہو گیا۔ خوش ہو کر بادشاہ نے ڈاکٹر مورلے سے کہا کہ آپ جو کچھ مانگنا چاہیں مانگ لیں میں اسے پورا کروں گا۔ ڈاکٹر مورلے اگر چاہتے تو ذاتی طور پر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے مگر انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ "میری اتنی خواہش ہے کہ بنگال میں کمپنی کی تجارت میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور کر دی جائیں" چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ان کو تمام تجارتی سہولتیں مل گئیں اور یہی سہولتیں ایک صدی کے اندر پورے ملک پر انگریزوں کے تسلط کا سبب بن گئیں۔ کاش ہم بھی ذاتی مفاد کے معاملہ میں ملی مفاد کو ترجیح دینے میں اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کرتے۔

۵۔ آپ حکمراں اور مخالف جماعتوں کے ان مسلمان ممبران اسمبلی اور پارلیمنٹ کی لسٹ تیار

[illegible] آپ کے مسائل میں فرقہ پرستوں کے ہم آہنگ رہے ہیں یا گونگے بہرے بنے تماشائی بنے رہے ہیں اور ان کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کریں۔ اگر آپ یہ کرلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے دنوں میں حالات بدل جائیں گے، قوموں کی زندگی میں چار پانچ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہوتی اس لئے اگر اس صورت میں اسمبلی اور پارلیمنٹ میں آپ کے ممبروں کی تعداد چاہے کم ہو جائے مگر اس سے آپ کا ملی وزن بڑھ جائے گا اور پھر ممکن ہے کہ پانچ برس کے بعد آپ اس سے زیادہ سیٹیں حاصل کرلیں اور باکردار ممبروں کی ایک کھیپ آپ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں پہنچا سکیں۔

۶۔ چھٹی چیز جسے ہمیں جلد سے جلد کرلینا ضروری ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس ایک ایسا سکریٹریٹ ہو جس میں پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہونے والے علمی و عملی کاموں اور قابل ذکر اداروں کا رڈ موجود ہو اور ساتھ ہی اگر ممکن ہو تو بیواؤں اور یتیموں کا کارڈ بھی مہیا کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ ہم ایک ایسا ٹرسٹ قائم کریں جو ان غریب اور بے سہارا طلبہ کو وظیفہ دے جو ممتاز نمبروں سے پاس ہوئے ہوں اور اپنی غربت کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کرسکتے ہوں خاص طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے طلبہ کیلئے یا عربی کے جو فارغ لائق طلبہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ عربی مدارس کے ان غریب طلبہ کو بھی وظیفہ دے جو کسی خاص فن مثلاً قرآن پاک، حدیث یا فقہ یا صرف و نحو میں اعلیٰ درجہ کی تیاری کرنا چاہتے ہوں اور اسکے لئے مدارس کے منتظمین سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے۔

۳۔ یہ سکریٹریٹ ان بستیوں کے مسلمان بچوں کا ایک علیحدہ ریکارڈ رکھیگا جو کسی غیر مسلم آبادی میں دو دو چار چار کی صورت میں آباد ہیں اور انکے بچوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ یہ ایک بہت ہی بنیادی کام ہے۔

۴۔ یہ سکریٹریٹ ایک چار صفحے پر مشتمل معلوماتی پندرہ روزہ یا ماہانہ بلوٹن شائع کرے گا جس میں پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ہونے والے کاموں کا اجمالی ذکر ہوگا اور ساتھ ہی گورنمنٹ کے چھوٹی چھوٹی معاشی اسکیموں سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کرے گا۔

۵۔ یہ سکریٹریٹ فرقہ پرست جماعتوں کی جارحانہ سرگرمیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرتا رہے گا، ان کے دفاع کی تدبیریں سوچے گا۔ گزشتہ الکشن میں آر۔ ایس۔ ایس کی طرف سے کانگریس آئی کی حمایت اور حکومت کے اندر اس کے نفوذ نے ایک بڑی سنگین صورت پیدا کر دی ہے۔

۶۔ آخر میں ایک بات اور ہم مسلمانوں کے ذہن میں اچھی طرح بٹھا دینا چاہتے ہیں کہ فرقہ پرست جماعتیں اور حکومت کے اندر جو فرقہ پرست افراد ہیں وہ مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ اقدامات کرتے رہتے ہیں ان میں بعض سیاسی اور معاشی اسباب و محرکات کے ساتھ ایک بڑا محرک اور سبب یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں سے نہیں لیکن اسلام کی اخلاقی قوت سے خوفزدہ ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ نفرت اور منفی جذبات کے ذریعہ ہندوؤں کو اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں سے دور نہ رکھا گیا تو ہندوؤں کا اچھا خاصا طبقہ اسلام کی اخلاقی قوت سے متاثر ہو جائے گا ۔ اسی لئے وہ اسلام کی اور مسلمانوں کی تصویر کو خراب کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت رامائن اور مہابھارت کے سیریل ٹی وی پر اسی لئے چلائے جا رہے ہیں۔

اس صورتحال میں ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر اسلام کی اخلاقی قوت کے ساتھ ہمارے معاشرہ کی اخلاقی قوت بھی شامل ہو جائے تو ان کی جارحانہ سرگرمیوں کے باوجود ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کو اسلام کے حلقہ بگوش ہونے سے کوئی نہ روک سکے گا جیسا کہ ہماری اور ہمارے معاشرہ کی اخلاقی حالت کی پستی کے باوجود اسلام کی روشنی لوگوں کے دلوں کو برابر منور کرتی جا رہی ہے۔

اس لئے مذکورہ بالا منفی اور مثبت تدبیروں کے ساتھ ہم کو اپنی اخلاقی حیثیت کی اصلاح پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ ہم دوسروں سے ظلم اور حق تلفی کی شکایت کرتے ہیں مگر ہم خود اپنے بھائیوں پر غیروں سے زیادہ ظلم کرتے رہے ہیں، ان کی حق تلفی کر رہے ہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کا خون بہا رہے ہیں۔ ان کو ذلیل کرنے کی ہر تدبیر اختیار کر رہے ہیں ان کی ترقی سے ہمیں خوشی کے بجائے حسد پیدا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی کوئی بستی کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں جھگڑے، لڑائی مقدمہ بازی اور قتل و خونریزی کا بازار گرم نہ ہو۔ ایسی صورت میں ہم دوسروں سے ظلم و زیادتی اور حق تلفی کی شکایت کیسے کر سکتے ہیں اور اپنے اندر کے اتنے بڑے بڑے ظلم و ستم کے ہوتے ہوئے دوسروں کے ظلم و ستم کا مقابلہ ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ اور پھر خدا کی نصرت ہمارے شامل حال کیسے ہو سکتی ہے؟

فی الحال یہ چند باتیں مفکرین ملت کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسرے دردمند اور اہل فکر حضرات مزید مفید صورتیں سامنے لا سکتے ہیں۔ ●●

افتاء اور اس کی ذمہ داری

مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب، پاکستان

موجودہ عدالتوں کی آخری کوشش

پیادے بھیج کر مدعا علیہم کے دروازوں پر اعلان چسپاں کر دینے اور اخبارات میں اشتہار نوٹس دینے میں آخری ہمت صرف کی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ کو حاضر عدالت ہو جاؤ ورنہ تمہارے خلاف یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ لیکن اس تجویز میں بھی اصل مشکل قضاء علی الغیب کے عقدے کا حل نہیں ہے۔ قاضی خان میں ہے:

ولو کان رجلا جاء بکتاب بالقاضی فقیل ان یسمع القاضی شهادة الشهود علی الکتاب توارى الخصم فی البلد قیل علی قول ابی یوسف یبعث القاضی منادی ینادی علی بابه ثلثة ایام اخرج وان لم تخرج نصبت منك وكيلا وقضيت على الوكيل وعامة المشائخ لم يصححوا هذ القول۔ (ج ۲ - ص ۵۶۰)

اگر ایک قاضی کا دوسرے کے پاس فیصلہ آجائے، فیصلے پر سماع شہادت سے پہلے مدعا علیہ چھپ جائے تو امام ابو یوسفؒ کے قول پر قاضی ایک منادی بھیجے گا جو تین دن اس کے دروازے پر "حاضر ہو جاؤ ورنہ میں تیری طرف سے ایک وکیل مقرر کر کے اس پر اپنا فیصلہ صادر کر دوں گا" کا اعلان کرے گا۔ اکثر مشائخ (اہل فتویٰ) نے اس قول کو صحیح نہیں سمجھا۔

غور فرمائیے۔ ایک طے شدہ کارروائی زیر سماعت ہے اس میں بھی اگر مدعا علیہ چھپ جائے، قصداً حاضرِ عدالت نہ ہو تو بھی حاکم مجبور ہے پہلی سماعت پر یا اس کی غیر موجودگی میں شہادت لے کر فیصلہ نہیں کر سکتا۔

طلاق ثلاثہ

طرفہ یہ کہ عدالت میں عرضی نویس جب سے طلاق نویسی کا کام لیا جاتا ہے ان کا مبلغ علم یہ ہے وہ سہ طلاق ایک دو تین کر دیتے ہیں اس کے ساتھ ہر قسم کے [illegible] الفاظ "حرام" "تو میری ماں بہن ہے" وغیرہ ملا دیتے ہیں۔ تحریر طلاق کے [illegible]

جب مفتی سے یا شرعی قاضی سے رجوع کرتے ہیں اور حقیقت حال کا پتہ چلتا ہے تو پھر دم بخود ہو جاتے ہیں۔ خیال فرمائیں، نص کے خلاف مفتی یا قاضی انھیں اس مخمصہ سے کیسے نکال سکتا ہے پھر خاوند کو یا تو دانستہ حرام کاری کا راستہ دکھائی دیتا ہے یا مذہب کی تبدیلی پر بھٹکنا پڑتا ہے۔

اعاذنا اللہ تعالی عن تبدیل المذھب لاتباع الھوی۔

ان عرضی نویس حضرات سے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ارے پڑھے لکھے شاطرو! تمہاری کیا سزا ہونی چاہئے کہ تمہارے ہاتھوں کی لکیر سے چند ٹکوں کی خاطر کتنے بھائیوں کی جان و مال کی تباہی و بربادی آخر کس کی بھینٹ چڑھے گی۔

فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ آپ خاموش ہو گئے حتیٰ کہ میں نے خیال کیا آپ اسے اس کی بیوی واپس کرنے کا حکم دے دیں گے۔ تو آپ نے فرمایا ایک شخص اپنے مرضی کرتا ہے حماقت پر سوار ہو جاتا ہے اور (بدحواس ہو کر) اے ابن عباس، ابن عباس کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا۔ "جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے لئے خلاصی پیدا کر دیتے ہیں۔"

اے شخص! تو نے تو اللہ کا خوف نہیں کیا، مجھے تیرے حق میں خلاصی کا علم نہیں ہے۔ عصیت ربک وبانت منک امرأتک تو نے رب کی نافرمانی کی اور تیری عورت تجھ سے بائن ہو گئی۔ یعنی مطلقہ پر تینوں طلاقیں واقع ہو گئی ہیں اور وہ اپنے خاوند پر مغلظ طور پر حرام ہو گئی ہے اور یہ حکم نافذ العمل ہے۔ اس سے کوئی خلاصی نہیں ہے اور اس کی کوئی تلافی ممکن نہیں ہے۔ طلاق دینے سے قبل اس مشکل میں اہل علم سے مشورہ کیوں نہیں کر لیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ دیکھئے کہ نکاح تو صرف ایک دفعہ ایجاب و قبول سے مکمل طور پر منعقد ہو جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے درجات نہیں رکھے لیکن انعقاد کے بعد نکاح سے انقطاع اور انخلاع کے درجات مقرر کئے گئے ہیں۔

(۱) رجعت۔ جس میں [illegible] رجوع کر سکتا ہے۔ (۲) بائن۔ جس میں دوبارہ تجدید نکاح ہو سکتی ہے

(۳) [illegible] نکاح نہیں ہو سکتی سو احلالہ شرعیہ کے مطلقہ کو اپنے عقد میں لانے کے [illegible] شیخ ابوالفرج ابن جوزیؒ فرماتے ہیں:

قال ویل العامی قلیل العلم لا یهتم نفسه فی واقعة ولا یذاکر من هو اعلم منه بل یقلد بظنه ویقدم وهذا اصل ینبغی تامله فقد هلك فی اهماله خلق لا تحصی وقد رأینا خلقا من العوام اذا وقع لهم واقعة لم یقبلوا فتوی " وجوه یومئذ عاملة ناصبة تصلی نارا حامیة"[1]

افسوس تو ان کم علم عوام پر ہے جو شرعی واقعہ کا اہتمام نہیں کرتے اور اپنے سے زیادہ عالم سے مذاکرہ تک نہیں کرتے بلکہ اپنے خیال میں ایک فیصلہ کر کے اقدام کرتے ہیں یہ ایک بنیادی بات ہے جس میں غور و فکر کرنا چاہئے۔ اسے مہمل چھوڑ کر بہت سی مخلوق ہلاک ہو گئی۔ ہم نے بہت سے عوام کو دیکھا کہ... جب انہیں کوئی مہم پیش آتی تو وہ لوگ فتویٰ کو قبول نہیں کرتے۔ "کئی چہرے اس روز مشقت میں پڑے تھکے ماندے گرم آگ میں داخل ہوں گے"

سبق آموز فتویٰ

مفتی کو مستفتی کے مناسب حال کہ جس سے اس کی اصلاح ہو اور اللہ تعالیٰ کی [illegible] کی عظمت دعوت ہیبت اور حشمت اس کے دل میں قائم ہو، اپنے فتویٰ میں وہی قول اختیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں امام یحییٰ مصمودیؒ کا سبق آموز فتویٰ جو تواریخ میں نقل کیا گیا ہے نہایت ہی اہم ہے:

" علامہ مقری نے امام یحییٰ کے ایک فیصلہ (فتویٰ) کی مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں: عبدالرحمٰن ثانی نے جو اس وقت کی دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا رمضان کا ایک روزہ قضا کیا نیک نفس بادشاہ نے اپنی اس کوتاہی کی [illegible] کے سامنے پیش کی، حضرت امام یحییٰ نے جو علماء کے بورڈ کے صدر تھے، فتویٰ دیا کہ بادشاہ اس قصور و کوتاہی پر ساٹھ روزے رکھے۔ ایک اور عالم نے جو اس موقع پر موجود تھے باہر آکر امام یحییٰ سے کہا، حضور! شریعت کی طرف سے اس بات کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ روزہ قضا کرنے کے جرم میں ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جاتا۔ آپ نے بادشاہ سے روزے رکھوانے کے حکم کے بجائے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا فتویٰ کیوں نہیں دیا۔ امام یحییٰ نے [illegible] کو دیکھا اور فرمایا بادشاہوں کیلئے ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلا دینا کوئی سزا نہیں ہے۔ [illegible] امام یحییٰ کے فتویٰ کی بنا پر پے در پے ساٹھ روزے رکھے اور پیشانی پر بل نہیں لایا اور امام یحییٰ کے حکم و فتویٰ کا [illegible]

---

[1] صید الخاطر، ص ۵   [2] حکمران مسلمان، ص ۲۱۵ بحوالہ نفح الطیب جزء اول، ۱۹۲-۳۹۸

تساہل پر مبنی ایک فتویٰ پر شیخ امام ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی کا رد

رأیت بعض المتقدمین سئل عمن یکتسب حلالا وحراما من السلاطین والامراء ثم یبنی المساجد والاربطۃ، هل له فیها ثواب، فافتی بما یوجب طیب قلب المنفق۔ وان له فی انفاق مالا یملکه نوع سمسرۃ لانه لا یعرف اعیان المغصوبین فیرد۔

متقدمین علماء میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ بادشاہ یا امراء حلال اور حرام مال کی کمائی سے مساجد اور خانقاہ تعمیر کراتے ہیں کیا انہیں ان کو ثواب ملے گا۔ ان کے فتویٰ میں مذکورہ بالا تعمیر پر خرچ کرنے والے کی طیب خاطر کو ملحوظ رکھا گیا۔ جواب یہ تھا کہ چونکہ یہ شخص غاصب ہے مالک نہیں ہے اور مخصوص مالکوں کو پہچانتا بھی نہیں ہے یہ مال مالکوں کو رد کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی دلالت علی الخیر ہے۔

فقلت واعجبا۔ امن متصدین للفتویٰ لا یعرفون اصول الشریعۃ ینبغی ان ینظر فی حال المنفق اولا۔

میں نے کہا۔ کیا عجیب ہے۔ ایسے مفتی حضرات۔ جو اصول شریعت سے ہی ناواقف ہیں۔ سب سے پہلے ایسی تعمیر پر خرچ کرنے والوں کے حال کو دیکھا جانا چاہیئے۔

اس کے بعد شیخ نے کہا ہے۔ اس سلسلہ میں تین چیزیں اصولی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک ان کی تنقیح نہ کی جائے اس وقت تک علی الاطلاق فتویٰ دینا اسی طرح گناہ ہے جس طرح مسلمانوں کے مال میں ناحق بغیر معاوضہ عمل کے اپنے لئے کچھ مال مخصوص کرنے والا گنہگار ہے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

۱۔ [illegible] سے حاصل ہوا۔

۲۔ [illegible] بالواسطہ اختیارات کا دائرہ محدود کیا ہے۔

۳۔ مصارف [illegible] بیت المال میں مقررہ معروف مصارف کیا ہیں۔ فرماتے ہیں:

اگر [illegible] کی تعمیر کرنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں یہ مال بیت المال کا

ہوگا۔ بیت المال کے مصارف معروف ہیں۔ مستحقین کی موجودگی میں یہ مال غیر ضروری مدات مدرسہ اضافہ علم کیلئے خرچ کیا جاسکے گا۔

اور اگر یہ لوگ امراء اور نواب ہوں تو اس مال کا اُن کے پاس سرکاری طور پر جمع ہو وہی مصرف ہوگا جو بیت المال کا مصرف ہے۔ ان کو صرف مقررہ وظیفہ بطور تنخواہ ملے گا ان کا اس مال کو دوسرے مدات میں خرچ کرنا بے جا اور غیر محل میں ہوگا۔ البتہ بشرط اجازت بقدر اجازت تصرف جائز ہوگا۔ لیکن جو شخص بغیر معاوضہ عمل مقررہ تنخواہ کے علاوہ اپنے لئے کچھ مال مخصوص کرے گا تو یہ مسلمانوں کا مال ہوگا۔ جس میں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔

جو مفتی یا قاضی علی الاطلاق ان لوگوں کو اس کی اجازت دے گا وہ بھی ویسا ہی گنہگار ہوگا۔ بیت المال میں تصرف کرنے کی مذکورہ بالا تفصیل اس وقت ہے جب کہ یہ مال شک و شبہ سے پاک اور اس میں تصرف کرنا جائز ہو۔

لیکن حرام یا غصب کے مال میں تو ہر قسم کا تصرف بھی حرام ہے۔ اصل مالکوں یا ان کے وارثوں کو اس مال کا واپس کرنا واجب ہے اور اگر واپس کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آئے تو یہ مال مسلمانوں کے مال میں جمع کیا جائے گا۔ اسے عام مصلحتوں میں اور صدقہ کی مدات میں خرچ کیا جائے گا۔ اس سے نفع اٹھانے والا اور اس کو حاصل کرنے والا بھی اسکی نحوست سے متاثر ہوگا۔

حرام اور غصب مال کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیل کے الفاظ یہ ہیں:

فاما اذا کان حراما او غصبا فکل تصرف فیہ حرام والواجب ردہ علی من اخذ منہ او علی ورثتھم۔ فان لم یعرف طریق الرد کان فی بیت مال المسلمین، یصرف فی مصالحھم، او یصرف فی الصدقۃ ولم یحظ اخذہ بغیر الاثم۔

استشہاد اور استناد میں شیخ نے اپنی سند سے ایک حدیث بیان کی ہے اس کا متن یہ ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اکتسب مالا من ماثم، فوصل رحما، او تصدق بہ، او انفقہ فی سبیل اللہ، جمع ذلک جمیعا فقذف بہ فی جہنم۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص گناہ سے مال حاصل کرے اس سے صلہ رحمی کرے یا صدقہ کرے یا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اس سب مال کو جمع کر کے اس شخص کے ساتھ اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔"

اس تفصیل کے بعد شیخ نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہے اور حلال کمائی کا صحیح مصرف بھی بتلایا ہے۔

فاما اذا کان البانی تاجرا مکتسبا للحلال فبنی مسجدا او وقف وقفا للمتفقه فهذا مما یثاب علیه۔ ؎۱	لیکن جب (مسجد یا مدرسہ کا) بانی تاجر اور حلال کمائی کرنے والا ہو وہ مسجد تعمیر کرے یا کسی فقیہ کے لئے وقف کرے تو یہ کار ثواب ہے۔

اصل ششم ــــ فتویٰ میں تشدد اور سختی نہ ہو

فتویٰ میں تشدد بھی ایسا ہی مضر ہے جیسا کہ تکاسل، تساہل اور رواداری مضر ہے۔ مفتی کسی سے کد رکھتا ہو نہ شخصی نفرت سے متہم ہو ورنہ اس کا فتویٰ معتبر نہیں ہوگا۔

تشدد سے دین سے نفرت اور بیزاری پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ نفرت بغاوت تک پہنچا دیتی ہے۔ دین سے قریب کرنے کے بجائے تشدد کفر کی سرحد تک پہنچا دیتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا۔ ؎۲	(خلق خدا کے ساتھ) آسانی کرو، تنگی نہ کرو، خوشخبری سناؤ اور نفرت نہ دلاؤ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یرید اللّٰه بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ ؎۳	اللہ تعالیٰ نے (احکام میں) تمہارے حق میں آسانی کا ارادہ فرمایا ہے اور تکلیف کا ارادہ نہیں کیا۔

؎۱ صید الخاطر، ص ۲۹۹۔ ؎۲ بخاری عن انس، کتاب العلم، ج ۱، ص ۱۶۔ ؎۳ سورۃ البقرۃ، رکوع ۶

هو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ ملة ابیکم ابراهیم۔ ۱	اللہ تعالیٰ نے تمہیں (اس امت کو) چن لیا اور دین کے بارے میں تم پر کوئی مشقت اور حرج نہیں ڈالی۔ اپنے باپ ابراہیم کی ملت کا اتباع کرو۔

یعنی یہ فطری دین ہے۔ اس میں ہر طرح کی سہولت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ جس نے ننانوے قتل کئے تھے۔ وہ راہب کے پاس آیا اور اپنی توبہ کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے نفی میں جواب دیا تو قاتل نے اسے قتل کر کے سو کا عدد پورا کر لیا۔ ۱

قتل کا الیہ تشدد پر مبنی فتویٰ کی وجہ سے پیش آیا۔ یہ اس راہب کی لاعلمی اور جہالت کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ امر واقعی میں یہ تشدد خدا تعالیٰ کو پسند نہیں تھا۔

اسی طرح ایک صحابی کا واقعہ جو سفر میں زخمی ہو گئے اور احتلام کی وجہ سے انھیں غسل کرنا پڑ گیا۔ انھوں نے اپنے رفقاء سے تیمم کی رخصت کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا۔ انھوں نے کہا پانی کی موجودگی میں تیرے لئے تیمم کا جواز نہیں ہے۔ بالآخر انھوں نے غسل کیا اور مر گئے حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا:

قتلوہ قتلهم الله الا سألوا اذ لم یعلموا فانما شفاء العی السوال انما کان یکفیه ان یتیمم ویعصب علی جرحه خرقة ثم یمسح علیها ویغسل سائر جسدہ۔ ۲	جب وہ علم نہیں رکھتے تھے تو انھوں نے علماء سے دریافت کیوں نہیں کیا۔ اللہ انھیں مارے انھوں نے تو اسے قتل کر دیا۔ سوال کر لینا ناواقفیت کی دوا ہے۔ اسے اتنی بات کافی تھی کہ تیمم کر لیتا اور زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کر کے باقی جسم کو دھو لیتا۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

عابهم علیه الصلاة والسلام بالافتاء	آنحضرت صلے اللہ علیہ نے ان پر گرفت فرمائی کہ بغیر علم کے

---

۱ مشکوٰۃ شریف۔ بروایت بخاری و مسلم۔ ص ۲۰۳

۲ مشکوٰۃ بروایت ابوداؤد اور ابن ماجہ عن ابن عباسؓ۔ ج ۱۔ ص ۵۴

بتغليظهم والحق بهم الوعيد بأن دعا عليهم لكونهم مقصرين فى التامل فى النص وهو قوله تعالى ماير يد الله ليجعل عليكم فى الدين من حرج۔ [1]

انھوں نے فتویٰ دیا اور سخت وعید سنائی۔ اللہ بد دعا کی کیونکہ انھوں نے نص میں غور وفکر کے بجائے کوتاہی سے کام لیا۔ اللہ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا ارادہ نہیں فرمایا کہ تمہیں تکلیف اور مشقت میں ڈال دیں۔

اس فتویٰ کے نتیجہ میں مستفتی کی ایک قیمتی جان تلف ہو گئی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلط فتویٰ خود مفتی کی جان تلفی پر بھی منتج ہوتا ہے۔

اعاذنا الله تعالیٰ من الجرأة على الله فى التشديد والافتاء بغير علم۔

اصل ہفتم ۔ نرمی اور اعتدال

دین اور دنیا کے تمام امور کی اصلاح کا راز اس میں مضمر ہے کہ ہر شے میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ افتار کے لئے چاہیئے کہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بغور نظر کر کے وسعت کا پہلو اختیار کیا جائے جس میں خلق خدا کا نفع ہو، سہل اور آسان ہو۔ بشرطیکہ اس میں کوئی محظور نہ پایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہر ہر پہلو میں برابر پائی جائے اور اس اعتبار سے کہ وہ اپنی مخلوق پر رحیم و کریم ہے۔ نرمی اور اعتدال کو پسند فرماتا ہے۔ رخصت پر عمل کرنا زیادہ خوشنودی کا باعث ہو۔

قال صلى الله عليه وسلم ان الله يحب ان تؤتى بالرخصة كما يحب ان تؤتى عزائمه و قال صلى الله عليه وسلم بعثت بالحنفية السمحة و لم ابعث بالرهبانية الصعبة۔ [2]

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالے رخصت پر عمل کرنے کو بھی ایسا ہی پسند کرتے ہیں جیسا کہ عزیمت کے کاموں پر عمل کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ نیز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں فطری اور وسیع شریعت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔ رہبانیت جیسے شاق اور سخت اعمال کے ساتھ مبعوث نہیں ہوا۔

---

[1] مرقات۔ ج ۲ ص ۸۹

[2] المبسوط۔ ج ۳ ص ۲۸۶

[illegible] (۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک فوجی دستے کے ساتھ جہاد کے لئے بھیجا ہم سب لوگ مقابلے سے بھاگ گئے۔ ہم مدینہ آگئے اور چھپ کر رہ گئے کہا ہم تو ہلاک ہو گئے۔ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور (معذرت کے طور پر) کہا کہ ہم بھگوڑے ہیں تو آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تم پلٹ کر دشمن پر حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارا لشکر ہوں۔ ہم آپ کے قریب ہوئے اور دست بوسی کی۔[1]

اہل علم جانتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو آیت وعید کی استثنائی صورت میں داخل کر لیا یعنی آپ لوگ جنگ سے بھاگنے والوں کی فہرست میں شامل نہیں ہیں بلکہ حملہ اور مورچہ بدلنے والوں کی طرح دوبارہ لڑنے کی غرض سے لشکرِ اسلام کی طرف لوٹنے والوں میں ہیں۔ یہ تاویل حق ہے بلکہ زیادہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کفار کے مقابلے میں دوبارہ لڑائی کا اعلان ہے۔

(۲) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے ایک ماہ تک ایلاء کیا یعنی قسم کھائی کہ تم سے الگ رہوں گا۔ بالاخانہ میں تشریف لے گئے پھر انتیس (۲۹) دنوں کے بعد اتر آئے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا آپؐ نے تو ایک ماہ کا ایلاء کیا تھا۔ جواباً آپ نے فرمایا: ان الشہر یکون تسعا وعشرین۔ یعنی مہینہ کبھی انتیس کا بھی ہوتا ہے۔[2]

یہ نہیں تھا کہ آپ نے جس ماہ ایلاء کیا تھا وہ انتیس کا تھا۔ یہ تو تب ہوتا کہ چاند کی پہلی تاریخ کو ایلاء کیا ہو بلکہ آپ نے انتیس دن پورے کئے جن پر "شہر" کا عربی لفظ صادق آتا ہے۔ آپ نے اپنے احباب اور بیویوں سے اپنی جدائی کے ایک دن کو بھی شاق سمجھا۔ سہل اور آسان صورت کو اختیار فرمایا۔

تکفیر میں احتیاط طبقات امت کی اصلاح کے سلسلے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے اہل اسلام کی تکفیر کرنا ائمہ ضلالت و بدعت کا ہمیشہ شعار رہا

---

[1] مشکوٰۃ۔ ج ۲۔ ص ۳۴۲

[2] بخاری۔ ج ۲۔ ص ۷۹۷

یہ ان کا ایک اوچھا ہتھیار ہے۔ وہ ہر اس طبقہ یا شخص کے خلاف اسے استعمال کرتے ہیں جو
نو بہ نو ان کا مخالف ہو۔ بدقسمتی سے اس امت میں یہ اب بہت پھیل چکا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ [illegible] بہت پہلے اس فتنہ کی خبر امت کو دے گئے تھے
اس کے مقابلے میں آپ نے بہت سختی فرمائی اور اپنے متبعین کو احتیاط کا حکم دیا۔

آپ کے شاگرد خاص ابو مطیع بلخیؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت سے دریافت
کیا کہ فقہ اکبر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

لا تکفر احدا بذنبه ولا تنف احدا من الایمان۔ [1] — کسی کی اس کے گناہ کی وجہ سے تکفیر نہ کرو اور نہ اس کے ایمان کی نفی کرو۔

فمن عیوب اهل البدع تکفیر بعضهم بعضا ومن ممادح اهل العلم انهم یخطئون ولا یکفرون۔ [2]

جہاد کے بعد بہترین عمل حج ہے

عن ابی ھریرة قال سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم ای الاعمال افضل؟ قال ایمان بالله ورسوله، قیل ثم ماذا؟ قال الجهاد فی سبیل الله، قیل ثم ماذا؟ قال ثم حج مبرور۔ (متفق) (بخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کون سا عمل افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا اس کے بعد کون سا؟ آپؐ نے بتایا خدا کی راہ میں جہاد کرنا، پوچھا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا حج مبرور (یعنی وہ حج جس کے دوران خدا کی نافرمانی نہ کی گئی ہو)

---

[1] شرح فقہ الاکبر، ص ۸۸، طبع ... [2] منہاج السنہ، ج ۳، ص ۶۳

مولانا کرامت علی جونپوریؒ
اور
ان کا ترجمۂ شمائل ترمذی

ترجمۂ شمائل ترمذی یہاں ہم نے اختصار کے لئے صرف ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ اب ان کی تیسری کتاب ترجمہ شمائل ترمذی (جو اس مضمون کا موضوعِ خاص ہے) کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

شمائل نبوی کی اہمیت ترجمۂ شمائل نبوی پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شمائل نبوی کی دین میں اہمیت اور حیثیت پر کچھ روشنی ڈال دی جائے۔

نبی کریم خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی دو حیثیتیں عام طور پر پیش دعوتِ فکر ونظر دیتی ہیں ایک یہ کہ آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کے بنیادی امتیازات کیا ہیں؟ ان میں کتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے؟ دوسرے یہ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کے ظاہری و باطنی خد و خال کیا تھے؟ اور اس میں اور ان کی تعلیمات میں کتنی ہم آہنگی اور توازن و توافق ہے؟ پہلے حصّہ کو ہم تعلیمات نبوی اور دوسرے حصہ کو سیرت نبوی اور شمائل نبوی کہتے ہیں۔

پہلے حصّہ کے بارے میں آپ کی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرادیا کہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ. اگر تم خدا کی محبت کے دعوے دار ہو تو میری لائی ہوئی شریعت کا اتباع کرو۔ پھر اس کی مزید وضاحت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زبان مبارک سے ان الفاظ میں فرمائی۔

لا یؤمن احدکم حتی یکون هواہ تبعاً لما جئت به۔ (بخاری و مسلم)

کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔

دوسرے حصے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ بے شک حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہمارے لئے نمونہ ہے اسی اسوۂ حسنہ کی وضاحت شمائل نبوی میں ہوتی ہے۔ شمائل نبوی صلے اللہ علیہ وسلم پر دو حیثیتوں سے بحث ہوتی ہے ایک خَلقی دوسرے خُلقی۔ خَلقی سے مراد یہ ہے اللہ تعالےٰ نے فطری طور پر آپ کے جسم اطہر کے اندر کون کون سی جسمانی خوبیاں ودیعت کی تھیں یعنی آپ کے جسم مبارک کا سراپا اور قد وقامت کیسا تھا۔ چہرۂ انور کی ضوفشانی اور اس کی ساخت کیسی تھی، رنگ وروغن کیسا تھا اور اس میں کتنی کشش تھی، نشست وبرخاست کس انداز سے ہوتی تھی اور رفتار وگفتار کیسی دلنواز تھی۔ اسی طرح دوسرے اعضاء میں کیا کیا تخلیقی حسن قدرت خداوندی نے رکھ دیا تھا۔ خُلقی سے مراد یہ ہے کہ آپ کے اخلاق کریمہ کیسے تھے۔ گھر کے اندر بال بچوں میں آپ کس طرح بسر فرماتے تھے، ان کے ساتھ رحمت عالم کا سلوک کیسا تھا، گھر کے باہر دوستوں اور دشمنوں سے کیا برتاؤ تھا۔ ہر کام کے لئے آپ نے مقرر فرما رکھا تھا، اس کے تحت چوبیس گھنٹے آپ کے کس طرح گذرتے تھے، آپ کے قلب مطہر کی کیفیات کیا تھیں اور اس میں خدا کی یاد اور اس کی محبت کس طرح بسی تھی، محبوب بارگاہ الٰہی ہوتے ہوئے آخرت کا خوف کتنا دامن گیر رہتا تھا۔ پہلے حصہ یعنی خَلقی حیثیت کا ذکر ہم حصول ثواب وبرکت اور اظہار فضیلت کے لئے کرتے ہیں اور کرنا چاہئے لیکن دوسرے حصہ کا اظہار اتباع واطاعت کی غرض سے کیا جاتا ہے اور کیا جانا چاہئے۔ غرض یہ کہ شمائل نبوی کے پڑھنے کے بعد آپ کا ظاہری وباطنی سراپا مشاہدہ بن کر نظروں کے سامنے آجاتا ہے جس کے پڑھنے سے ہم ایک طرف اجر وثواب کے مستحق ہوتے ہیں تو دوسری طرف آپ کے اخلاق حسنہ کا ذکر پڑھ کر پاس کر روح کو فرحت اور عمل میں قوت ولذت محسوس ہوتی ہے اور قلب ودماغ خدا کے قرب کی روشنی سے کچھ دیر کے لئے منور ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضؓ نے شمائل نبوی کی خَلقی کیفیات ہی کو نہیں بلکہ ان کی خُلقی وباطنی کیفیات کی نازک دستیوں کو بھی اپنے سینہ ودل سے لگائے رکھا اور اس خوانۂ عامرہ کو امت کی طرف منتقل بھی کیا۔ چنانچہ ہر زمانہ میں حدیث کے درس میں اس کی اہمیت کے پیش نظر محدثین کرام اور اساتذۂ حدیث تلامذہ کو اس کی خصوصی سند عنایت کرتے تھے شمائل نبوی کے یہ آبدار موتی یوں تو حدیث وسیرت کی تمام کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں مگر ان بکھرے موتیوں کو

[illegible] ہونے کا کام سب سے پہلے امام ترمذی نے انجام دیا اور اسی وقت
[illegible] ہے شمائل النبی کی طرف سے مشغول ہو گئے [illegible]
[illegible] کے بعد بعض دوسرے حضرات بھی اس سعادت میں شریک ہوئے مگر [illegible] کو
وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو امام ترمذی کے شمائل کو ہوئی۔ امام ترمذی کے بعد [illegible]
شمائل کا مجموعہ تیار کیا مگر اب تک ان کے قلمی یا مطبوعہ نسخے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے لیکن چونکہ
کشف الظنون کے مصنف نے ان کا ذکر کیا ہے اس لئے ان کے موجود ہونے کا امکان قوی ہے۔ ان
میں ایک مجموعہ شمائل النبی کے نام سے ابو العباس جعفر بن محمد المستغفری (متوفی ۴۳۲ھ) نے مرتب کیا
تھا دوسرا مجموعہ الشمائل بالنور الساطع الکامل شیخ ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم الغزاوی (متوفی ۴۸۵ھ)
جو ابن المقری کے نام سے مشہور ہیں، مرتب کیا تھا، وہ چار جلدوں پر مشتمل تھا اور اس میں بیس باب[1]
تھے۔ تیسرا مجموعہ ابو عیسیٰ محمد بن سورہ امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ کا ہے جس کا پورا نام الشمائل النبویہ
والخصائل المصطفویہ ہے۔ اسی مجموعہ کو دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ شمائل کی ایک
ترجمانی ام معبد خزاعیہ صحابیہ سے منقول ہے۔ انھوں نے حلیہ مبارک کی جن الفاظ میں تصویر کشی کی
ہے وہ بعض الفاظ کی غرابت کے باوجود فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ اور ادبی شاہکار ہے۔ اس کو
امام بیہقی اور ابو نعیم دونوں نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے شمائل میں متعدد صحابہ و صحابیات
سے روایتیں کی ہیں جس میں سب سے زیادہ تفصیل حضرت حسنؓ و حسینؓ کی روایت میں ہے جو انھوں نے
اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ جو حضرت خدیجہ کے صاحبزادے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ربیب
تھے اس کے بعد حضرت علیؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتیں ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ کی
روایت جب حضرت حسنؓ بیان کرتے تھے تو یہ بھی فرماتے تھے کان وصافا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی
سب سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرنے والے یہی تھے۔ اب ہم ان تمام
صحابہ کا ذکر کرتے ہیں جن سے شمائل کی روایتیں آئی ہیں:

۱۔ حضرت انس، ۲۔ براء بن عازب، ۳۔ حضرت علی، ۴۔ حضرت ابوہریرہ، ۵۔ حضرت جابر [illegible]

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۵۹ مطبوعہ مکتبہ [illegible] بیروت

[illegible] ۹: حضرت ابو الطفیل، ۱۰: حضرت [illegible] ۱۱: حضرت [illegible]

بن عمرو، ۱۰: حضرت [illegible]، ۱۱: حضرت انس [illegible] الخطاب الانصاری، ۱۲: حضرت [illegible]

ابو سعید خدری، ۱۴: حضرت عائشہ، ۱۵: حضرت ام ہانی، ۱۶: حضرت عبداللہ بن مغفل، [illegible]

ابوبکر صدیق، ۱۸: عن ابی جحیفہ، ۱۹: حضرت ابو رمثہ، ۲۰: حضرت ام سلیم، ۲۱: [illegible]

الخصاصیہ، ۲۲: حضرت ابن عمر، ۲۳: حضرت اسماء بنت یزید، ۲۴: حضرت معاویہ بن قرہ،

۲۵: حضرت ابو جحیفہ، ۲۶: حضرت قیلہ بنت مخرمہ، ۲۷: حضرت سمرہ بن جندب، ۲۸: حضرت عروۃ

بن المغیرہ عن ابیہ، ۲۹: عن ابی بریدہ، ۳۰: حضرت مغیرہ بن شعبہ، ۳۱: حضرت عمرو بن حریث

۳۲: حضرت عبداللہ بن جعفر، ۳۳: حضرت عباد بن تمیم عن عمر، ۳۴: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی

بکرۃ، ۳۵: حضرت اشعث بن سلیم، ۳۶: حضرت عثمان غنی، ۳۷: حضرت ابو جحیفہ، ۳۸: حضرت

کعب بن مالک، ۳۹: حضرت ابو امامہ باہلی، ۴۰: حضرت سہل بن سعد، ۴۱: حضرت ابو اسید،

۴۲: حضرت زید بن اسلم عن ابیہ، ۴۳: حضرت ابو موسیٰ اشعری، ۴۴: حضرت عمرو بن شعیب عن

ابیہ عن جدہ، ۴۵: حضرت جابر بن طارق، ۴۶: حضرت ام سلمہ، ۴۷: حضرت مغیرہ بن شعبہ

۴۸: حضرت عبداللہ بن مسعود، ۴۹: حضرت عبداللہ بن جعفر، ۵۰: حضرت ام المنذر، ۵۱:

حضرت یوسف بن عبداللہ بن سلام، ۵۲: حضرت سلمان فارسی، ۵۳: حضرت ابو ایوب انصاری،

۵۴: عمرو بن ابی سلمہ، ۵۵: ربیع بنت معوذ بن عفراء، ۵۶: حضرت عمرو بن ابی حرملہ، ۵۷: حضرت

کبشہ، ۵۸: حضرت ام سلیم، ۵۹: حضرت ابو عثمان الہندی، ۶۰: حضرت حسن بن علی عن ہند

بن ابی ہالہ، ۶۱: حضرت عبیداللہ بن حارث، ۶۲: حضرت ابوذر غفاری، ۶۳: حضرت جریر

بن عبداللہ، ۶۴: حضرت سعید بن ابی وقاص، ۶۵: حضرت زاہر، ۶۶: حضرت جندب بن

سفیان البجلی ۶۷: حضرت جندب بن عبداللہ، ۶۸: حضرت ابو سفیان بن الحارث، ۶۹: حضرت

عمرو بن الشرید عن ابیہ، ۷۰: حضرت حذیفۃ الیمان، ۷۱: حضرت ابو قتادہ، ۷۲:

، ۷۳: حضرت ابو سلمہ، ۷۴: حضرت عبداللہ بن ابی بکر، ۷۵: حضرت زید بن خالد الجہنی،

۷۶: حضرت حفصہ، ۷۷: حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، ۷۸: حضرت ابو ایوب انصاری،

۷۹: حضرت عبداللہ بن سائب، ۸۰: حضرت عوف بن مالک، ۸۱: حضرت عبداللہ بن مغفل،

۸۲: حضرت عبداللہ بن الزبیر، ۸۳: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، ۸۴: حضرت زید بن ثابت، ۸۵: حضرت عمرو بن العاص، ۸۶: حضرت جبیر بن مطعم، ۸۷: حضرت ابوطلحہ، ۸۸: حضرت عقبہ بن فرقدان، ۸۹: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، ۹۰: حضرت معاویہ، ۹۱: حنظلہ بن حنظلہ، ۹۲: حضرت سالم بن عبید ۹۳: حضرت عمرو بن الحارث، ۹۴: حضرت طارق بن اشیم، ۹۵: حضرت ابوطیبان الانصاری۔ اگر حضرت حسین اور حضرت حسن کے ناموں کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ تعداد ۹۷ ہو جاتی ہے۔

شمائل نبوی کی اسی اہمیت کے پیش نظر متعدد حضرات نے شمائل کے مجموعے تیار کئے لیکن جو مقبولیت امام ترمذی کے مجموعہ شمائل ترمذی کو حاصل ہے وہ دوسروں کو نہیں ہوئی۔

حسب ذیل حضرات نے شمائل ترمذی کی شرحیں لکھی ہیں یا ان پر حواشی لکھے ہیں۔ اس پر سب سے پہلا حاشیہ شیخ عفیف الدین محمد بن السید محمد بن عبداللہ الحسنی التبریزی متوفی ۸۵۵ھ نے لکھا۔ یہ تبریز سے مدینہ منورہ گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔[۱] (۲) اس کے بعد سب سے مفصل شرح حافظ شہاب الدین ابن حجر مکی ہیثمی متوفی ۹۷۳ھ نے اشرف الوسائل الی فہم الشمائل کے نام سے ۹۴۹ھ میں لکھی۔ (۳) ان کی شرح پر ایک حاشیہ علی بن علی نور الدین مصری شافعی متوفی ۱۰۸۷ھ نے لکھا جو حاشیہ علی شرح ابن حجر علی الشمائل کے نام سے مشہور ہے۔[۲] (۴) بالکل اسی سن یعنی ۹۴۹ھ میں ایک دوسری شرح شیخ مصلح الدین بن صلاح بن جلال الاری متوفی ۹۷۹ھ نے عربی دوسری فارسی میں لکھی۔ (۵) اس کے بعد ایک شرح امام سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے زہر الخمائل علی الشمائل لکھی۔ (۶) ایک شرح ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ نے جمع الوسائل کے نام سے لکھی۔ (۷) جس کی تہذیب شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطاکی نے کی (۸) ایک شرح شیخ عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائینی متوفی ۹۴۳ھ نے لکھی (۹) ایک شرح شیخ محمد الحنفی نے ۹۴۶ھ میں لکھی (۱۱) ایک شرح محمد عاشق بن عمر الحنفی نے ۱۰۱۲ھ میں لکھنی شروع کی اور اس کا تبیضہ ۱۱۲۲ھ میں تیار ہوا (۱۲) ایک شرح شیخ

---

[۱] کشف الظنون ج ۲، مرتبہ اسمٰعیل بن محمد امین ص ۵۴
[۲] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۵۹ و ذیل ج ۲ ص ۵۴

عبدالرؤف المناوی نے لکھی جس میں انھوں نے اسفرائینی اور ابن حجر ہیتمی دونوں کی شرحوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱۳) علامہ مناوی کی شرح کا ترجمہ ترکی زبان میں احمد بن خیرالابن الایدی متوفی ۱۱۲۰ھ جو خواجہ اسحاق آفندی کے نام سے مشہور ہیں، نے کیا۔ اس کو پھر مصطفیٰ بن الحسین الحلبی نے ۱۱۵۸ھ میں ترکی زبان میں نظم کیا۔

ان شرحوں کا ذکر صاحب کشف الظنون نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ ذیل کشف الظنون میں دس گیارہ شرحوں کا ذکر ہے ان میں سب سے زیادہ مقبول علامہ ابن حجر کی شرح ہوئی جس پر متعدد لوگوں نے حاشیے لکھے جن میں سب سے مشہور حاشیہ شیخ شبراملسی علی بن علی نورالدین شامی متوفی ۱۰۸۷ھ کا ہے۔

حال کے علماء میں ڈاکٹر عزت عبدالدعاس کی تحقیق کے ساتھ شمائل کا ایک ایڈیشن ۱۳۹۶ھ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد علامہ ناصرالدین البانی نے احادیث کی تخریج اور رواۃ کی تحقیق کے ساتھ مختصر الشمائل المحمدیہ کے نام سے شائع کی۔ اس میں انھوں نے سند کو حذف کر دیا ہے اور صحابی یا مرسل روایت میں تابعی کا نام رہنے دیا ہے۔ غالباً یہ شمائل کا سب سے محقق اختصار ہے۔ اس میں انھوں نے عزت الدعاس کی تحقیق کی خامیوں کو بھی دکھایا ہے جس میں کہیں کہیں ان کی انتہا پسندی نمایاں ہے۔

شمائل کے منظوم ترجمے

اوپر شمائل ترمذی کی شرحوں اور حواشی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ شمائل نبوی سے جو تعلق اور شغف امت کو رہا ہے اس کی بنا پر نثر کے ساتھ نظم میں بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ شمائل نبوی کے ایک ترکی منظوم ترجمے کا ذکر آ چکا ہے۔ ایک قدیم عربی منظوم ترجمہ کا بھی بعض حضرات نے ذکر کیا ہے جس کا ذکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مضطر ہسوری کے منظوم ترجمہ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ ہندوستان میں بھی اسکے متعدد عربی، فارسی اور اردو منظوم ترجمے مختلف حضرات نے کئے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلا اس کا منظوم عربی ترجمہ مولوی محمد حسن ولد مولوی محمد علی ملیح آبادی نے والی ٹونک نواب محمد علی خاں صاحب کی فرمائش پر کیا جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک ترجمہ مثلث ہے اور دوسرا مسلسل نظم کی صورت میں۔ مثلث میں شمائل نبوی کی حضرت علی کی مفصل روایت کو منظوم کیا ہے اور مسلسل میں

شمائل نبوی کی دوسرے صحابہ کرام کی روایتوں کو نظم کیا ہے اس بنا پر بعض مضامین کی تکرار ہو گئے ہے۔ یہ ترجمہ جو سب سے پہلی بار ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوا جس کا پہلا شلث یہ ہے ؎

قرن الملاحۃ طینۃ والحسن صار قرینہ

پوری نظم اسی طرح رواں صلی علیہ اللہ ثنا عربی میں ہے جس سے مترجم کی عربی زبان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ مترجم موصوف نے آسانی کے لئے بین السطور میں فارسی میں عربی عبارت کا ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ مسلسل نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

ان خیر الوریٰ رسول اللہ ، کان فخماً مفخماً ذا الجاہ

وتمیا وربعۃً فی الناس لا طویلاً ولا قصیر ناس

اس نظم کا انھوں نے بین السطور میں اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ نواب محمد علی والی ٹونک ہی کی فرمائش پر شمائل کا دوسرا ترجمہ عارف نام کے کسی شاعر نے کیا جس کے ابتدائی چند اشعار یہ ہیں: ؎

رخش رخشائی چو ماہ چاردہ بود بخدی آفتابش خاک رہ بود

زہے زاں روئے گندم گوں وروشن مخالف را ازوی آتش بخرمن

جبینِ دلکشائے او کشادہ نشاں از صفحۂ خورشید دادہ

یہ نظم ۱۲۲۵ھ میں کہی گئی اور اس کی طباعت ۱۲۹۱ھ میں ہوئی۔

شمائل نبوی کے اس عربی و فارسی منظوم ترجموں کے ساتھ ایک اردو کا منظوم ترجمہ شمیم نام کے کسی شاعر نے کیا ہے۔ افسوس ہے کہ فارسی و اردو کے مترجمین کے بارے میں نام کے علاوہ مزید تفصیل نہ مل سکی۔ اردو منظوم ترجمہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ پہلے شمائل کے نظم کرنے کی دقت کا ذکر کرتے ہیں:

ایک مدت سے تھا خیال شمیم کہ لکھے حلیۂ رسولِ کریمؐ

لیک خامیِ نظم عائق تھی اور طبیعت نہ اوس کے لائق تھی

پھر ترجمہ سے پہلے شمائل کی عربی عبارت نقل کرتے ہیں پھر اردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے نام کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

نہ کیوں بالیدہ ہو میرا نہال مدعا ہردم | کہ ذکر قامت زیبائے حضرت مجھکو بھاتا ہے

پھر عربی عبارت نقل کر کے ترجمہ کرتے ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بالطویل البائن ولا بالقصیر۔

تھے رسولِ خدا میانہ قد | رحمتِ حق ہو ان پہ بے حد و عد
یعنی ایسا تھا قد پاک رسول | کہ نہ رکھتا تھا اس میں ظاہر طول
اور نہ کوتہ تھے اور تھے نہ دراز | بلکہ تھا قد پاک خوش انداز

یہ پوری نظم تقریباً ۹۰ صفحات پہ پھیلی ہوئی ہے۔

کتاب کا نام، سنہ، ترجمہ وطباعت

شمائل نبوی کی حیثیت اور اہمیت، اس کے رواۃ اور شروح کی تفصیل کے بعد اب اصل کتاب کے ترجمہ کی خوبی کے بارے میں کچھ تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ ترجمہ کا نام "انوار محمدی" ہے۔ مولانا جونپوری دیباچہ میں لکھتے ہیں "اور اس شرح کا نام انوار محمدی رکھا" مولانا نے اس کا ترجمہ کب شروع کیا اس کی وضاحت تو نہیں ملتی مگر اس کے اختتام کی تاریخ کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے یہ ترجمہ مکمل ہو چکا تھا۔ اختتام پہ اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الحمد للہ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۴ء ہجری نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مہینہ شوال سے سولہویں میں اس کتاب شریف کے ترجمے سے فراغت ہوئی اور دستاویز نجات کی ہاتھ آگئی۔"

کتاب چھپ کر اسی سال لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف مولانا لکھتے جاتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی طباعت بھی ہوتی جاتی تھی اس لئے کہ مولانا نے اختتام ترجمہ کی تاریخ ماہ شوال ۱۲۵۲ھ بتائی اور کتاب کے ٹائیٹل پر بھی یہی سن طباعت اور مہینہ درج ہے۔

خاکسار علی جونپوری مشہور کرامت علی نے ترجمہ شرح ہندی زبان میں کر کے محمدی چھاپہ خانے میں چھپوایا شہر شوال ۱۲۵۲ھ یہ محض ترجمہ نہیں ہے بلکہ شمائل کی مختصر شرح بھی ہے" اور ترجمہ اور شرح کے لکھنے میں مولانا نے اس سلسلہ کی تمام ہی معتبر کتابوں سے استفادہ کیا تھا۔ خود

صاحب ترجمہ پہ کفایت نہ کیا بلکہ شرح بھی ضروری مقامات کی کر دیا۔ اگرچہ استاد کامل سے پڑھا تھا پہ اپنی یاد پہ بھروسہ نہ کر کے شرحیں معتبر مدد کے واسطے ترجمہ کے وقت سامنے دھر لیاں۔ (دیباچہ)

مطبع اور ناشر کا نام یہ کتاب جیسا کہ مولانا نے ذکر کیا ہے پہلی بار مطبع محمدی کلکتہ میں چھپی۔ اس مطبع کے مالک کا نام خادم الدین ارادت اللہ جو ضلع جہانگیر نگر قصبہ رستم آباد کے رہنے والے تھے انھوں نے اسی نام کی ایک مہر بنوائی تھی جو کتاب کے ٹائیٹل پر ثبت ہے۔ کتاب کی اشاعت مضاربت کے اصول پر ہوئی یعنی محنت کسی کی اور سرمایہ کسی کا۔ اس کی صراحت تو نہیں ملتی کہ کیا شرائط طے ہوئے تھے مولانا نے آخر میں لکھا ہے کہ،

الحمدللہ کی شرح شمائل مضاربت موماں دیندار مولوی عبدالستار و حاجی عبدالقادر و منشی حسن و منشی غلام الرحمٰن و نور علی خاں شیخ عبداللہ دبیر پانچوں صاحبان۔

ترجمہ کا مقصد ہندوستان کے علماء و صوفیہ نے اپنی دعوت و اصلاح کی آواز کو عوام تک پہنچانے کے لئے ہمیشہ ان کی زبان میں گفتگو کی۔ انھوں نے ہندوستان کی کسی زبان کے ساتھ نہ تو تعصب برتا اور نہ اس کو مذہبی حیثیت دی: چنانچہ ہندوستان میں جس وقت دربار شاہی سے لے کر عدالتوں تک میں فارسی کا عام چلن تھا، یہ علماء و صوفیہ ہندوستان کی مختلف بولیوں ہندی، دکنی، پنجابی وغیرہ میں اپنا پیغام عوام تک پہنچا رہے تھے اس لئے کہ سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی فارسی زبان خواص تک محدود تھی اور عوام اپنی مقامی بولیوں ہی سے کام لیتے تھے۔ ان علاقائی زبانوں میں ان کے سیکڑوں دوہے، ہزاروں فقرے اور جملے اور درجنوں کتابیں اس پر شاہد عدل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے صوفیہ کی اردو خدمات کے سلسلہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کو ہاتھ میں لینے کے لئے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ سب کے لئے کھلا تھا بلا امتیاز ہر

قوم وملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت و صحبت کو موجب برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے اس لئے تلقین کے لئے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کئے۔ ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطہ کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انہی کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے یہ بڑا گر تھا اور صوفیہ اسے خوب سمجھتے تھے۔ (ص ۵)

ملک محمد جائسی نے بھی اپنی کتاب میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

د توہم نہ کند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بود صبر کس ملکے کہ بودہ زبان آں ملک بکار بردہ و گمان نہ کند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی نظم نہ کردہ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق و الملۃ والدین قدس اللہ سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ بعد ازاں حضرت خواجہ گنج شکر قدس اللہ سرہ در زبان ہندی و پنجابی بعضے اشعار نظم فرمودہ۔

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اولیاء اللہ نے زبان عربی کے علاوہ دوسری زبان میں بات نہیں کی، اس لئے کہ یہ عرب تک محدود نہیں تھے۔ تو وہ جس ملک میں رہے اس زبان سے کام لیا۔ اور یہ بھی گمان نہ ہونا چاہئے کہ اولیاء اللہ نے ہندی زبان میں کلام نہیں کیا، اس لئے کہ سب سے بڑی بزرگ ہستی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی انھوں نے ہندی میں بات چیت کی ہے۔ اس کے بعد خواجہ گنج شکر قدس سرہ نے ہندی اور پنجابی میں بعض اشعار لکھے ہیں۔

سید صاحب کے سلسلہ کے تمام بزرگوں نے اسی مقصد کے پیش نظر زیادہ تر فارسی[1] کے بجائے عوامی بولی اردو یا ہندی میں کتابیں اور نظمیں لکھیں اور اسی میں انھوں نے وعظ و تلقین کی۔ مولانا کرامت علی صاحبؒ نے مفتاح الجنۃ کے دیباچہ میں جو لکھا ہے اس کے کچھ حصے ہم نقل کر چکے ہیں

---

[1] سید صاحبؒ اور اسمٰعیل شہید اور دوسرے بزرگوں کی کئی کتابیں فارسی اور عربی میں ہیں مگر وہ خواص کے لئے ہیں، عوام کے لئے انھوں نے اردو ہی کو ذریعۂ اصلاح بنایا۔ ۱۲

مزید چند فقرے ملاحظہ ہوں:

"فائدہ اس رسالہ کے تئیں ہندی سیدھی زبان میں جو عورت مرد کی سمجھ میں آوے بیان کیا اور کچھ فقیر کو غرض ریختہ اور رنگینی سے نہیں ہے اور نہ فقیر شاعروں کے زمرہ میں ہے اس واسطے فقیر نے اپنے شہر کی زبان میں لکھا جس میں کسی کو مشکل نہ معلوم ہو۔ (ص ۷)

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو یا ہندی زبان میں اس کتاب کو لکھنے کا مقصد عوام تک اپنی آواز کو پہنچانا تھا۔ شمائل ترمذی جس پر ہمیں آگے گفتگو کرنی ہے اس کے ترجمہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اکثر لوگ علم تو پڑھتے ہیں مگر حدیث کا ذکر بھی نہیں کرتے اور پیغمبر صاحب کی حدیث اور ان کی صورت شکل، دین، کھانے پینے، چلن، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے وضو، غسل روزہ نماز وغیرہ اخلاق وعادات کا احوال لوگوں کے نزدیک خواب وخیال ہو گیا۔ بلکہ خواب بھی بھول گیا اور اس شیرینی کی لذت لوگ بھول گئے اور عشق دنیاوی کے قصے کہانی میں مشغول ہو رہے، تب بموجب حدیث نبوی الدین النصیحۃ کے یعنی دین کیا ہے خیر خواہی مسلمان بھائی کی ارادہ کیا کہ کچھ حدیث کی لذت مسلمان بھائیوں کو چکھا دیں اور ہندی زبان کے پیالہ میں اس آب حیات کو بھر کر پلا دیں، تب فکر اور غور کے بعد یہی مناسب دیکھا کہ شمائل ترمذی جو مشہور اور صحیح کتاب حدیث کی ہے اس کا ترجمہ کریں۔ کیونکہ کتاب مختصر ہے۔ (دیباچہ)

دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں:

اب مسلمان بھائیوں کو مناسب ہے کہ جب اپنے کام سے فراغت پا کر بیٹھیں تب اپنے یا آشنا پڑوسی کو اور اپنے گھر کے لوگوں کو اس کتاب کو پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور قصہ کہانی کی جگہ اس حدیث نبوی کا بیان کریں کیونکہ قصہ کہانی میں بادشاہ یا شہزادوں کے عاشق معشوقوں کا حال سن[1] کے آدمی کا دل بہکتا ہے اور حضرت کی صورت شکل اور سب احوال باکمال کے بیان سے آدمی دین کی راہ پا جاتا ہے اور یہ کتاب جب کسی کو سنانا چاہیں تو پہلے متن حدیث کا پڑھ جاویں اور اسکے بعد

---

[1] شمائل کے دیباچہ میں "سُن" کے "ک" کو یائے معروف سے لکھا ہے لیکن ہم نے نقل میں اس املے کی پابندی نہیں کی ہے۔ ۱۲

معنی اور شرح پڑھیں۔"

اس عبارت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ عام طور سے عوام علماء اور خواص میں بھی حدیث نبوی کا علمی و عملی اعتبار سے چرچا نہیں تھا۔

۲۔ عام طور پر اردو زبان میں قصہ کہانی کی کتابیں ملتی تھیں اور اسی کا لوگ مطالعہ کرتے تھے۔

۳۔ عمومی خیر خواہی کے جذبہ سے انھوں نے اس مستند کتاب کا سیدھی ہندی میں ترجمہ کیا تاکہ لوگوں کا سطحی ذوق بھی بدلے اور حدیث نبوی کا رواج ہو وے۔

۴۔ مولانا نے اردو کو جو اس وقت عام طور پر ہندی کہی جاتی تھی ہندی ہی کہا ہے البتہ مفتاح الجنہ کے ناشر نے اسے اردوئے معلیٰ کہا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں نام رواج پذیر تھے مگر عام طور پر جو زبان بول چال کے لئے استعمال ہوتی تھی اسے ہندی کہتے تھے اور تحریر کے لئے اردوئے معلیٰ استعمال ہوتی تھی یا عوام اسے ہندی کہتے تھے اور خواص اردوئے معلیٰ لقب سے اسے یاد کرتے تھے۔

ترجمہ کی زبان کسی زبان کے لٹریچر یا معیاری کتابوں کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بذات خود ایک دشوار کام ہے پھر ایسی زبان میں اس کا ترجمہ کرنا اور زیادہ دشوار ہے جس کی ابھی نشو و نما ہو رہی ہو۔ نہ تو وہ ابھی علمی زبان بن سکی ہو اور نہ اس میں نثر کا کوئی ادبی سرمایہ ہو۔ آج سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے اردو زبان کا سارا سرمایہ شاعری تھا یا نثر کی چند کتابیں جو زیادہ تر صحافتی یا جذباتی انداز کی تھیں یا پھر قصہ کہانی کی نثر کے اعتبار سے اردو زبان نہ تو ابھی تک علمی زبان بنی تھی اور نہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہوئی تھیں اس لئے اس زبان میں شمائل ترمذی کا ترجمہ کرنا پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ صحابۂ کرام نے شمائل نبوی اور سراپائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جن جامع الفاظ اور فقروں میں تصویر کشی کی ہے وہ عربی ادب کا شاہکار ہیں۔ ان کے ایک ایک فقرے پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے گئے ہیں اس لئے اردو زبان میں جو نثر کے اعتبار سے ابتدائی دور میں تھی ان کا بامحاورہ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ خود مولانا کو اس وقت کا احساس تھا۔ لکھتے ہیں:

"اور اس ترجمہ کو اپنی طاقت اور فہم کے موافق بہت سیدھی اور آسان ہندی زبان میں

اور لغت کی تحقیق بہت بڑی محنت کے ساتھ کر کے ترجمہ ٹھیک ٹھیک کر دیا اور بعض مقام میں ہندی کا محاورہ درست ہونے کے لئے معنی میں تقدیم تاخیر کرنا ضروری پڑا، نہیں تو مضمون ہی سمجھنا مشکل ہو جاتا کیونکہ ہر ملک کا محاورہ اپنے اپنے ڈول پر ہوتا ہے۔" (دیباچہ)

اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے شمائل کی ترویج ہوئی بلکہ اس سے اردو زبان کو بھی غیر معمولی فائدہ پہنچایا۔ سرورِ کائنات کی ذات سے مسلمانوں کو جو محبت اور شیفتگی ہے اس کے نتیجہ میں کتاب عوام اور خواص دونوں میں بار بار پڑھی گئی۔ خود مولانا کے متوسلین کا حلقہ سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا اور جن کی تعداد ہزاروں سے نکل کر لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے اسے گھر گھر پہنچایا ہوگا۔ مولانا خود بھی اس کے پڑھنے کی تاکید بار بار کرتے تھے اوپر ان کی عبارت نقل کی جا چکی ہے۔ کتاب کے آخر میں عام مسلمانوں اور اپنے متوسلین کو ان الفاظ میں اس کے پڑھنے اور پڑھانے کی ہدایت کرتے ہیں:

ان سب مسلمان بھائیوں کی خدمت میں التماس اور اپنی اولاد اور مریدین کو وصیت ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کو دوسرے کاموں پر مقدم جانیں اور جب کوئی مشکل پیش آئے اس کتاب کو تمام پڑھ جائیں انشاء اللہ مشکل آسان ہو جائے گی۔" (ص ۴۷۷)

اس طرح اس کے ذریعے حدیث نبوی اور اردو زبان دونوں کا ذوق ہندوستان میں عام ہوا خود ہندو شعراء نے حمد و نعت میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر اسی طرح کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔

اب مولانا کے ترجمے اور ان کی شرح کے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا نے مشکل ترین الفاظ اور فقروں اور محاوروں کا کتنا سلیس، شستہ اور معنی خیز ترجمہ کیا ہے اور کتنی آسان زبان میں اس کی شرح کی ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ کے قد مبارک، چہرۂ انور کے رنگ وروغن کا ذکر دو چار لفظوں میں کیا ہے مگر ان سے آپ کا پورا سراپا نظر کے سامنے آجاتا ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس بالطویل البائن ولا بالقصیر ولا بالابیض الامہق ولا بالادم۔	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نہ تھے بہت لمبے اور نہ بہت چھوٹے اور نہ بہت گورے چٹے اور نہ تھے گندم رنگ سیاہی مائل۔

بائن کو اگر بیان بمعنی ظاہر سے مشتق مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آپ کا قد لانبا تھا مگر لمبائی بے ڈول نہیں تھی یا بون بمعنی بعد سے مشتق مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ لمبائی حد اعتدال سے آگے بڑھی ہوئی نہ تھی۔ مولانا نے اپنے ترجمہ میں اس کی پوری رعایت کی ہے اسی طرح امہق اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ گورا چٹا ہو مگر اس کے چہرے پر سرخی اور رونق نہ ہو۔ مگر آپ کی گورائی ایسی نہ تھی بلکہ اس میں ہلکی سی سرخی اور رونق تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: کان شدید البیاض "خوب گورے، چٹے تھے"۔ اور حضرت ابوالطفیل کی روایت میں ما انسی شدۃ بیاض وجہہ۔ "آپ کے چہرے کے گورے پن کی زیادتی کو میں بھول نہیں سکتا" کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

محدثین نے شدۃ بیاض کی تشریح بریق ولمعان کے لفظ سے کی ہے چنانچہ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:

کان الشمس تجری فی وجہہ — گویا آپ کے چہرے پر سورج جیسی روشنی یا رونق تھی۔

اسی طرح لفظ ادم ہے۔ اسے سیاہی مائل گندم گوں رنگ کے لئے بولتے ہیں، تو آپ کا رنگ گندم گوں تھا مگر سیاہی کے بجائے سفیدی مائل تھا اور اسی کو اسمر اللون بھی کہتے ہیں۔

کان ابیض بیاضہ الی السمرۃ — آپ گورے تھے اور گورائی گندم گونی کی طرف مائل تھے۔

یعنی آپ کا رنگ سرخی مائل پختہ گندم گوں تھا۔ اس تفصیل کو سامنے رکھ کر پھر مولانا کے ترجمے کی وضاحت پر غور کیجئے انھوں نے اپنے ترجمہ میں سب کی رعایت رکھی ہے۔ گورا چٹا ہونا خوبی ہے مگر بہت زیادہ گورا چٹا ہونا قدرے عیب ہے اس لئے "ولا الامہق" کے ترجمہ میں مولانا نے "نہ تھے بہت گورے چٹے اور نہ تھے گندم رنگ سیاہی مائل" لکھا ہے جو بہترین ترجمانی ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ربعۃ ولیس بالطویل ولا بالقصیر حسن الجسم وکان شعرہ لیس الجعد وسبط اسمر اللون اذا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک بلندی مائل تھا نہ بہت لانبے تھے اور نہ بہت چھوٹے بہت پیارا جسم حضرت کا اور تھا حضرت کا بال ایسا کہ نہ تو بہت پیچ تھے اور نہ بہت سیدھا سفید سرخی مائل رنگ تھا حضرت کا اور جب چلتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ آگے کو جھکا چلتے ہیں۔

اس میں اسیل الخد کی تشریح تو آچکی ہے بقیہ الفاظ ربعۃ ، جعد ، سبط اور یتکفا کا ترجمہ مولانا نے جو کیا ہے اس سے بہتر ترجمہ کرنا مشکل ہے خاص طور پر حسن الجسم کا ترجمہ "بہت پیارا جسم تھا حضرت کا" صحیح ترین ترجمہ ہے۔ اس کے مفہوم میں اعضاء کا تناسب اور جسم کی معتدل اور متوازن ساخت سب شامل ہے جسے مولانا نے دو جملوں میں ادا کر دیا اسی طرح یتکفا کی تشریح حضرت علی نے یہ فرمائی:

اذا مشی تکفأ تکفواً کأنما ینحط من صبب ۔ — جب راہ چلتے تو آگے کو جھکے لگتے، بھلا لگتا وہ جھکنا گویا کہ اونچے سے نیچے کو اترتے تھے۔

مولانا نے اپنے ترجمہ میں اس پوری تشریح کی رعایت رکھی ہے پھر تکفواً مفعول مطلق ہے اس کا ترجمہ "بھلا لگتا وہ جھکنا" بھی لاجواب ترجمہ ہے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً مربوعاً بعید ما بین المنکبین ۔ — اور تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایسے کہ ان کے بال میں انداز کی شکن تھی، قد بلندی مائل تھا اور تھوڑا ہی سا فرق تھا دونوں مونڈھوں کے بیچ ۔

لفظ "رَجُلا" ج پر پیش، زبر اور زیر تینوں حرکتوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس لفظ سے آپ کے بال کی صفت بیان کی گئی ہے۔ جس کے بال نہ بالکل کھڑے ہوں اور نہ گھونگھرالے بلکہ ہلکی ہلکی شکن ہو اس کو شعر رجل بولتے ہیں۔ اس کا کتنا اچھا ترجمہ مولانا نے "انداز کی شکن تھی" کیا ہے۔ ربعۃ کا لفظ پہلے آچکا ہے اس معنی میں مربوعاً بھی ہے۔ آخری جملہ "بعید ما بین المنکبین" پر مولانا نے ایک حاشیہ لکھا ہے جس سے ان کے ذہن اور قلم دونوں کی صفائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"یعنی پر گوشت بدن تھا اس لئے پیٹھ کی نالی کم تھی"

یہ معنی جب ہیں جب بُعید (بائے مضموم عین مفتوح پڑھیں اور بعید کی با مفتوح اور عین مکسور پڑھیں گے تب یہ معنی ہوں گے) فرق تھا درمیان دونوں مونڈھوں کے، یعنی سینہ مبارک چوڑا تھا، اور یہ صحیح ہے۔

اسی طرح بعض راویوں نے وفات کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر ساٹھ برس

اور بعض نے ۶۵ برس اور اکثر نے ۶۳ بتائی ہے۔ کتاب میں ساٹھ والی روایت نقل کرنے کے بعد عام روایتوں میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں۔ دوسری حدیث میں جو ترسٹھ برس کی روایت ہے اور اس میں ساٹھ ہے۔ سو یہ وجہ ہے کہ حضرت ربیع الاول میں پیدا ہوئے اور اسی میں ہجرت کی اور اسی ماہ میں وفات پائی۔ سو راوی نے پورے برس کو شامل کیا ہے اور کھوٹے برس کو چھوڑ دیا اور جس میں ۶۵ برس کی روایت ہے سو اس میں راوی نے ترسٹھ کو اصل سمجھ کر دو برس ولادت اور وفات کے بھی ملا دیئے اور حقیقت میں حضرت کی عمر ترسٹھ برس کی تھی۔ (ص ۴)

مثالوں کو طول دینا مناسب نہیں ہے مگر ان کے تحریر میں قدیم اردو کا ایک اچھا نمونہ بھی ہے اور ان میں مولانا نے جس محققانہ اور عالمانہ انداز میں مختلف احادیث نبوی کی تطبیق دی ہے اور ان میں جو متوازن رائے دی ہے وہ افادیت سے خالی نہیں ہے۔ ان کی تحریر کے دو تین نمونے پیش کئے جاتے ہیں:

مہر نبوت کا ذکر کرتے ہوئے ایک صحابی نے بیان کیا کہ میں نے مہر نبوت کی جگہ مثل جُمع کے دیکھا مولانا نے جُمع کا ترجمہ چٹکی بھر کیا ہے پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جُمع بضم جیم و سکون میم کہتے ہیں۔ اس صورت کو جو انگلیاں بٹورنے میں حاصل ہوتی ہے اس کو ہندی میں کہتے ہیں چٹکی بھر فلانی چیز چٹکی بھر ہے۔ (ص ۴۰)

آپ کے بالوں کے خضاب کے بارے میں حضرت انس رضؓ سے کسی نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ آپ خضاب کی عمر کو پہنچے ہی نہ تھے صرف کنپٹی میں چند بال سفید تھے۔ اس میں لفظ "کان شیئًا فی صدغیہ" آیا ہے۔ اس پر مولانا لکھتے ہیں:

چند بال کنپٹی میں سفید ہوئے تھے۔ صدغ اس عضو کا نام ہے جو آنکھ اور کان کے بیچ میں ہے۔ اس کی ہندی کنپٹی ہے۔ (ص ۵۳)

پھر اس بیان کے سلسلہ میں یہ بھی ذکر آیا ہے کہ جب آپ تیل استعمال فرماتے تھے تو آپ کے سفید بال نظر نہیں آتے تھے اور جب آپ تیل استعمال نہیں فرماتے تھے تو وہ نظر آتے تھے واذا دھن رأسہ لم یرمنہ شیب فاذا لم یدھن رأی منہ۔ مولانا اس کی توجیہ

کہتے ہوئے لکھتے ہیں
اس کی وجہ یہ ہے کہ تیل لگانے میں سب بال بتر جاتے ہیں بکھرے نہیں رہتے تو سفید بال جن کے تھوڑا ہوتا ہے سیاہی میں چھپ جاتا ہے اور بعضوں نے کہا کہ تیل لگانے سے بال چمکتا ہے سو چمک کے سبب سے سفید بال نظر نہیں آتے۔"

آخر میں ہم مولانا کی تحریر کا ایک لمبا اقتباس نقل کرنے کے بعد اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مطالبۂ میراث پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا نورث ما ترکنا صدقۃ کی روشنی میں جواب دیا تھا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی نبی لوگ کے مرنے کے بعد میراث نہیں تقسیم ہوتی ہے اور نبی لوگ کی میراث تقسیم نہ ہونے میں یہ حکمت ہے کہ ان کے وارث لوگ ان کے مرنے کی کہیں آرزو نہ کریں تو ہلاک ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ آدمی یہ شبہ انبیاء کے حق میں نہ کریں کہ ان کو دنیا کے مال کی خواہش تھی۔ ان کا سب مال اللہ کا ہے دنیا کا ہوتا تو تقسیم ہوتا اور جو قرآن میں بعضے نبیوں کے وارث ہونے کا ذکر جس طرح سے مذکور ہے کہ وارث ہوئے داؤد کے سلیمان تو وہاں مراد علم اور نبوت کی میراث ہے۔ چنانچہ حضرت نے اس کی تفسیر بخوبی فرمایا ہے مشکوٰۃ میں کتاب العلم کی دوسری فصل میں کثیر بن قیس سے جو حدیث بہت طویل روایت سے ہے اس حدیث میں یہ مضمون بھی ہے کہ بے شک نبی لوگوں نے وارث نہیں کیا ہے کسی کو دینار اور درہم کا اور میراث نہیں چھوڑا نبیوں نے سوائے علم کے، سو جس نے علم حاصل کیا ہے اس نے پورا حصہ پایا۔ حضرت صدیق رضؓ نے جو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا وہ عرض کر دیا پھر حضرت فاطمہ نے کچھ عذر کیا ان لوگوں کا دستور تھا کہ جب حضرت کے فرمان سنتے بلا عذر مان لیتے اور پھر حجت و تکرار نہ کرتے اب جو لوگ حضرت صدیق اور حضرت فاطمہ سے فدک کے معاملہ میں کچھ جھگڑا کریں وہ حضرت فاطمہ کی بندگی اور علم سے منکر ہیں اس طرح حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ حضرت عمرؓ کے پاس بحث کرتے ہوئے

لہ اردو میں اس لفظ کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے، تتر بتر اور تربتر، یہاں دوسرے معنی میں مستعمل ہے۔ ۱۲

تشریف لائے۔ انھوں نے حدیث سنا دیا بس فراغت ہوگئی۔ اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ (ص ۱۹۴ سے ۲۶۲)

انیسویں صدی کا اسلوب تحریر

انیسویں صدی کے نصف آخر کے کچھ بعد کے مصنفین کے زمانے کو نثر اردو کا چوتھا دور قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی ۱۸۳۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کا زمانہ۔ اسی دور میں غالب، امام بخش صہبائی، امانت لکھنوی، ماسٹر رام چندر، مفتی صدر الدین آزردہ وغیرہ پیدا ہوئے اور اس دور سے پہلے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۳۰ء تک فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مظہر علی خاں ولا، نہال چند لاہوری، ان شار اللہ خاں، مرزا رجب علی بیگ، سرور مصنف فسانۂ عجائب، مرزا کاظم علی جوان ہوئے ہیں۔ ان تمام لوگوں کا شمار اردو زبان کے ابتدائی معماروں میں ہوتا ہے۔ اور ہونا بھی چاہئے مگر ان میں سے دو چار مصنفین کو چھوڑ کر ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اردو زبان کو کوئی سنجیدہ لٹریچر اور اچھا ادب دیا ہو۔ زیادہ تر لوگوں نے قصہ کہانی کی کتابیں لکھیں یا ترجمہ کیں۔ اس سے اردو زبان کو اس حیثیت سے فرور فائدہ ہوا کہ اردو زبان عام ہوگئی مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی سنجیدہ لٹریچر پیدا نہیں ہوا پھر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ناول نگاری اور قصہ کہانی لکھنے میں قلم آزاد ہوتا ہے اس لئے اس میں لفاظی، مبالغہ آمیزی، سخن طرازی اور دوسرے طریقوں سے عبارت میں زور پیدا کرنا آسان ہوتا ہے مگر خالص علمی اور مذہبی موضوعات میں قلم کو بہت سنبھالنا اور پابند رکھنا پڑتا ہے حتیٰ کہ تذکرہ جس میں معمولی زبان و بیان سے کام چل جاتا ہے اس دور تک جتنے شعراء کے تذکرے لکھے گئے وہ فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ اردو شاعری نے تو کافی ترقی کر لی تھی مگر انیسویں صدی کے نصف اول تک اردو نثر شعراء کے تذکرے کے قابل بھی نہ تھی۔

مقصد یہ ہے کہ اس ساٹھ ستر برس کی مدت کے اردو زبان کے جتنے نمونے موجود ہیں ان کو اگر سامنے رکھا جائے تو مولانا کرامت علیؒ کی زبان و بیان کی داد دینی پڑے گی۔ ان کی مذہبی کتابوں اور خاص طور پر شمائل ترمذی کے ترجمہ اور اس کی شرح میں سلاست و روانی اور زبان کی صفائی کی جو خوبیاں موجود ہیں اس عہد کے ناول اور افسانہ اور طوطا مینا کی کہانی

گئے۔ ان کی کتابوں میں اس سے زیادہ خوبیاں نہیں ہیں بلکہ بعض بہت گھٹیا نمونے ہیں، مگر افسوس ہے مولانا اور ان کے دوسرے معاصر علماء کی اردو نثر کی خدمات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ان کا شمار نثر کے معماروں میں نہیں کیا گیا۔ ہم اس دور کے تمام قابل ذکر مصنفین کی تحریروں کے بہت سے نمونے ان کی کتابوں سے جمع کر کے مولانا کی تحریروں سے ان کا موازنہ کرنا چاہتے تھے مگر افسوس ہے کہ اس کا پورا موقع نہ مل سکا اسلئے اسے کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

کچھ غلطیاں اور استدراکات

راقم نے مولانا جونپوریؒ کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے اس میں کچھ فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن کی تصحیح اور کچھ نئی باتیں سامنے آگئی ہیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں:

مضمون کی پہلی قسط میں لکھا گیا تھا کہ "مولانا اپنے والد کی تنہا اولاد تھے" اس غلطی پر ان کے اہل خاندان مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا عبد الباطن صاحب وغیرہ نے توجہ دلائی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مولانا کرامت علیؒ کے والد شیخ ابراہیم امام بخش اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے اور شیخ امام بخش کی دو شادیاں ہوئیں اور ان سے کئی اولادیں بھی ہوئیں۔ مولانا کرامت علی کے علاوہ ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ مولانا کرامت علیؒ کے ایک چھوٹے حقیقی بھائی مولانا رجب علیؒ تھے جو اپنے وقت کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ یہ حضرت احمد شہیدؒ سے بیعت اور ان کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے سیرت سید احمد شہید میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا کی ایک حقیقی بہن اور تین سوتیلے بھائی اور سوتیلی بہن بھی تھیں۔

مولانا کے اہل خاندان نے دوسری طرف جس غلطی کی طرف توجہ دلائی وہ یہ ہے کہ "راہ نجات" کے مصنف مولانا سخاوت علی جونپوریؒ نہیں بلکہ اس کے مصنف حافظ محمد علی صاحب تھے جو مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کے ہم عصر تھے۔ "مالابدمنہ" کے آخر میں قاضی صاحب کا جو وصیت نامہ درج ہے اس میں حافظ محمد علی صاحب کا ذکر ہے اور محشی نے ان کے نام کے آگے لکھا ہے کہ یہ "راہ نجات" کے مصنف ہیں۔

یہ در اصل غلط فہمی ہے جو اس سے ہوئی ہے کہ "راہ نجات" پر مصنف کا نام درج نہیں ہے عموماً ہمارے اسلاف اپنی تصانیف پر اپنا نام درج نہیں کرتے تھے اس لئے ان کی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف منسوب ہو گئی ہیں۔ یہی صورت حال غالباً راہ نجات کے ساتھ پیش آئی ہے کہ مولانا سخاوت علی صاحب نے اس پر اپنا نام درج نہیں کیا ہے اس وجہ سے بنگال میں اسے مولانا کرامت علیؒ کی تصنیف سمجھا جاتا ہے مگر پورے شمالی ہند میں مولانا سخاوت علی صاحب ہی کو اس کا مصنف سمجھا جاتا ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اوپر جس دلیل کی بنا پر اس کو حافظ محمد علی صاحب کی تصنیف بتایا ہے اس دلیل کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حافظ محمد علی صاحب نے اس نام سے کوئی دوسری کتاب لکھی ہو۔ علاوہ ازیں "راہ نجات" کی زبان قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے وقت کی زبان معلوم نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے پچاس برس بعد کی زبان معلوم ہوتی ہے نیز ان کے دور میں اردو نثر نے اتنی عمومیت اختیار نہیں کی تھی کہ اس میں علمی کتابیں لکھی جا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب نے خود "مالابد منہ" فارسی میں لکھی حالانکہ یہ کتاب انھوں نے عوام کے لئے لکھی تھی۔

پھر مولانا سخاوت علی جونپوریؒ اردو کی اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جب کہ حافظ محمد علی صاحب کی کوئی اور دوسری کتاب سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ عربی سے اردو میں فقہ کے مسائل کو منتقل کرنا جبکہ اس کا کوئی نمونہ نہ ہو آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے بہر حال مہارت کی ضرورت تھی۔ اس لئے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کے بجائے یوپی کے کسی حصہ میں لکھی گئی ہے۔ اور زبان بھی اسی بنا پر کی استعمال ہوئی ہے۔ عام طور پر اردو کتابیں اس وقت یوپی اور بہار میں مقبول تھیں پنجاب میں ان کا رواج نہیں تھا۔

مولانا کرامت علی صاحب کے کارناموں میں ایک کارنامہ ١٨۵٧ء کی تحریک انقلاب میں شرکت بھی ہے۔ اس کی کچھ تفصیل مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے اپنی کتاب "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء" میں لکھی ہے مگر اتفاق سے یہ کتاب راقم الحروف کے سامنے نہیں ہے اس لئے اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ١٨٣١ء میں انگریزوں کے خلاف جد و جہد کرنے کے لئے فرائضی کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی تھی جس میں ٧٠٠٠٨ ہزار ہندو مسلمان شریک ہوئے تھے

مولانا محمد حسینی نے اس تحریک کی کئی مقام پر سربراہی بھی کی[1]۔ مولانا کے ایک شاگرد مولانا سرفراز علی صاحب تھے جو برابر عیسائیوں کے خلاف لوگوں کو ابھارتے اور انگریزوں سے جہاد پر اکساتے رہتے تھے[2]۔ آج بھی بنگال میں کہیں کہیں "فرائضی" کی نسبت لوگوں کے ناموں کے ساتھ ملتی ہے۔ مولانا کی اس تحریک میں شرکت کی دوسرے ذرائع سے ابھی تصدیق نہیں ہو سکی ہے اس لئے اتنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آخر میں ہم مولانا کا وہ خلافت نامہ پیش کرتے ہیں جو حضرت سید احمد بریلوی صاحب نے انھیں عطا کیا تھا۔ اس کا متن مع ترجمہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرقومہ دوم ماہ شعبان ۱۲۳۹ھ

از فقیر سید احمد بر ضمیر صفا پذیر طالبانِ راہِ حضرت حق و سالکین طریق آں ہادیٔ مطلق عموماً و کسانیکہ بایں فقیر للہ و فی اللہ حاضرانہ و یا غائبانہ محبت میدارند خصوصاً پوشیدہ نماید کہ مقصود از بیعت زبردست مشائخ طریقت ہمیں است کہ راہ رضامندی حضرت حق بدست و راہ رضامندی منحصر در اتباع شریعت غرا است ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ[3] دو امر است اول ترک شراک و ثانی ترک بدعات، اما ترک اشتراک پس بیانش آنکہ ہیچکس را زملک و جن و پیر و مرشد و استاذ و شاگرد و نبی و ولی حلال مشکلات خود نہ پندارند و حاجات خود را از کسے از ایشاں طلب نہ نماید ہیچکس را قادر بر حل مشکلات و رفع بلیات و تحصیل منافع نداند و ہمہ را مثل خود در جنب قدرت و علم حضرت حق عاجز و نادان شمارد و ہرگز بنا بر طلب حوائج

---

[1] مفتی انتظام اللہ صاحب کی کتاب میں یہ تذکرہ دیباچہ میں ہے اور اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے جس کا ذکر اس مضمون میں آ گیا البتہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں شرکت کا ذکر مفتی صاحب نے کیا ہے۔ ۱۲

[2] مفتی انتظام اللہ صاحب ہی نے مولانا سرفراز علی صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جنرل بخت خاں ان کے مرید تھے اور ان کی ہی ترغیب پر انگریزی ملازمت چھوڑ کر جہاد آزادی میں آئے تھے۔ ۱۲

[3] را طریق تحصیل رضامندی حضرت حق انگارد پس بیشک آں شخص کاذب و گمراہ است و دعوی او باطل و نا مسموع و اساس شریعت مصطفویہ

خود تدور وتیاز کسے از انبیاء و اولیاء و صلحاء و ملائکہ بجا نیار د آرے ایں قدر داند کہ
ایشاں مقبولان بارگاہ صمدیت اند وثمرہ مقبولیت ایشاں ہمیں است کہ در باب
تحصیل رضامندی پروردگار اتباع ایشاں باید کرد و ایشاں را پیشوایان در ایں
طریق باید شمرد نہ آں کہ ایشاں را قادر بر حوادث زماں و عالم السر والاعلان داند کہ
ایں امر محض کفر و شرک است ہرگز مومن پاک را ملوث باں شدن جائز نیست۔
واما ترک بدعات پس بیانش آں کہ در جمیع عبادات و معاملات و امور معاشیہ
و معادیہ طریق خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم را بکمال قوت و
علو ہمت باید گرفت و آنچہ مردماں بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم از قسم رسوم
اختراع نمودہ اند مثل رسوم شادی و ماتم و تجمل قبور و بنائے عمارات براں و اسراف
در مجالس اعراس و تعزیہ سازی و امثال ذلک ہرگز پیرامون آں نباید گرد و
حتی الوسع سعی در محو کردن آں باید کرد اول خود ترکش باید نمود بعد ازاں ہر مسلماں
را بسوئے آں دعوت باید کرد چنانکہ اتباع شریعت فرض است ہمچنیں امر بالمعروف
و نہی عن المنکر نیز فرض است چوں ایں امر ذہن نشیں شد پس جمیع طالبان حق
را باید کہ ہمیں امور را پیش نظر خود ساختہ بیگر بیعت نمایند خصوصاً مولوی
صاحب مستعد ہدایت مسلمیں چالاک میداں ارشاد و تلقین مولوی کرامت علی
صاحب جونپوری اعانہم اللہ کہ زبردست ایں فقیر بیعت نمودہ اند و ایں فقیر ایں امور
را روبروئے ایشاں کما حقہ اظہار نمودہ و ایشاں را مجاز باخذ بیعت و تعلیم اشغال
از جانب خود نمودہ پس بر ذمہ ایشاں لازم است کہ اول خود تمسک بہ امور
مذکور الصدر نمایند و قلب و قالب خود را متوجہ بسوئے حق کنند و در اتباع شریعت
غراء را ظاہراً و باطناً پیش گیرند و تمامی انجاس اشراک و الواث بدعات را از خود
دور نمایند و بعد ازاں جمیع طالبان حق را بسوئے آں ترغیب کنند و در اخذ بیعت
بدست خود از خود ساعی شوند و ترغیب وافر نمایند ہرگز انجام ازاں نہ نمایند
چہ دریں بیعت کہ بردست یاراں فقیر واقع خواہد شد فائدہ شد نیست انشاء اللہ

کہ گویاں از رسوم شرک پاک خواہند شد و تعظیم شرع شریف در دل ایشاں جا خواہد گرفت و فقیر دعاہا خواہد کرد کہ آں بیعت ثمر ثمرات جمیلہ جزیلہ گردد و در تعلیم و تفہیم طالبان سعی بدل وجاں نمایند و از ایشاں اخذ بیعت کنند و ایشاں را تعلیم اشتغال فرمایند حق جل و علی ایں فقیر را و جمیع مخلصین و محبین ما را در زمرۂ موحدین و مخلصین و متبعین شریعت غرا گرداند و آمین ۔

اسمہ احمد

ترجمہ :- فقیر سید احمد کی طرف سے حضرت حق کی راہ کے طالبوں اور طریق آں ہادئ مطلق سالکوں پر عموماً اور اس فقیر کے ساتھ للہ و فی اللہ حاضرانہ و غائبانہ محبت رکھنے والوں پر خصوصاً پوشیدہ نہ رہے کہ مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت سے مقصود یہی ہے کہ حضرت حق کی رضامندی کا طریقہ میسر ہو اور حضرت حق کے رضامندوں کا طریقہ شریعت غرا کی اتباع میں منحصر ہے ۔ جو شخص شریعت مصطفویہ کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ حضرت حق کی رضامندی کا گمان کرے بے شک وہ شخص کاذب و گمراہ ہے اور اس کا دعویٰ باطل اور ناقابل سماع ہے اور شریعت مصطفویہ کی بنیاد دو باتوں پر ہے اول ترک اشراک اور ثانی ترک بدعات، ترک اشراک کا مطلب یہ ہے کہ فرشتہ وجن، پیرومرشد، استاد و شاگرد اور نبی و ولی میں سے کسی کو اپنی مشکلات کا حل کرنے والا نہ سمجھے اور ان میں سے کسی سے اپنی مرادیں اور ضرورتیں نہ مانگے اور کسی کو بھی نفع پہنچانے اور بلا و مصیبت دور کرنے اور مشکلات کے حل کرنے پر قادر نہ سمجھے اور سب کو اپنی طرح حضرت حق کے علم و قدرت کے مقابلہ میں عاجز و ناداں جانے اور ہرگز اپنی حاجت روائی کے لئے انبیاء و اولیاء و صلحاء و ملائکہ میں سے کسی کی نذر و نیاز نہ کرے، ہاں اس قدر سمجھے کہ یہ سب جناب صمدیت کے مقبول ترین بندے ہیں ۔ ان کی مقبولیت کا ثمرہ بس یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی اتباع کریں اور پیشوائے طریق انھیں سمجھیں یہ نہیں کہ ان کو حوادث زمانہ پر قادر اور ہر غیب و شہود کا عالم سمجھا جائے اس لئے کہ یہ امر محض شرک و کفر ہے اور ہرگز مومن پاک کو اس "بداعتقادی" کے ساتھ ملوث ہونا جائز نہیں ۔

الغرض ترک بدعات کا مطلب یہ ہے کہ تمام عبادات و معاملات اور امور معاشیہ و معادیہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پوری قوت اور بلند ہمتی کے ساتھ پکڑا جائے اور جو کچھ دوسرے لوگوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد از قسم رسومات کے گڑھ لیا ہے جیسے شادی اور غمی کی رسمیں اور قبروں کا آراستہ کرنا اور اس پر عمارتیں بنانا اور عرس کی محفلوں میں اسراف کرنا اور تعزیہ سازی نیز اسی قبیل کے دوسرے مخترعات ہرگز ان کے گرد و پیش میں نہ گھومنا چاہئے اور حتی الوسع ان چیزوں کے مٹانے کی کوشش کرنا چاہئے پہلے تو خود چھوڑنا چاہئے پھر اس کے بعد ہر مسلمان کو اس کی دعوت دینی چاہئے اس لئے کہ جیسے شریعت کا اتباع فرض ہے اسی طرح اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے منع کرنا بھی فرض ہے جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو تمام طالبین حق کو چاہئے کہ انہی امور کو اپنے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بیعت کریں خصوصاً مولوی صاحب کہ ہدایت المسلمین میں چست تبلیغ و ارشاد کے شہسوار ہیں یعنی مولوی کرامت علی صاحب جونپوری (اللہ ان کا مددگار رہے) جنھوں نے کہ اس فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور فقیر نے ان امور کو ان کے روبرو کما حقہ واضح کر دیا ہے اور ان کو بیعت لینے اور اشغال کی تعلیم دینے میں اپنی جانب سے مجاز کیا ہے، ان کے ذمہ لازم ہے کہ پہلے خود امور مذکور الصدر پر مضبوطی سے عمل کریں اور اپنے قلب و جسم کو حق تعالیٰ کی جانب متوجہ کریں اور شریعت غراء کی اتباع کو ظاہراً و باطناً سامنے رکھیں اور شرک کی تمام نجاستوں اور بدعات کی گندگیوں کو اپنے سے دور کریں اور اسکے بعد طالبین حق کو اسکی طرف راغب کریں اور اپنے ہاتھ پر بیعت لینے میں اپنی جانب سے کوشش کریں اور پورے طور پر رغبت دلائیں ہرگز اس میں دریغ نہ کریں کیونکہ اس بیعت میں جو کہ فقیر کے دوستوں کے ہاتھ پر واقع ہوگی فائدہ کی کامل توقع ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کلمہ گو رسوم شرک سے پاک ہونگے اور شرع شریف کی عظمت انکے دل میں جاگزیں ہوگی اور فقیر دعائیں کرتا رہیگا کہ وہ بیعت گرانقدر نیک ثمرات کی باعث ہو۔ مریدین و طالبین کی تعلیم و تزکیہ میں دل و جان سے کوشش کریں اور ان سے بیعت لیں اور ان کو تزکیۂ نفس کے طریقے تعلیم فرمائیں حق بزرگ و برتر اس فقیر اور ہمارے سلسلے کے تمام مخلصین و محبین کو موحدین و مخلصین اور متبعین شریعت غراء کے زمرہ میں کر دے۔ آمین۔

(مہر سید احمد)

اذان کی حقیقت

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب، لاہور

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے قبا میں پھر مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی بنیاد رکھی۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا [1]

مسجد کی تعمیر کے ساتھ ہی اجتماعی عبادت کا آغاز ہوا اور نماز با جماعت قائم ہوئی۔ جب مسجد تیار ہوئی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ نمازیوں کو نماز کی اطلاع کیسے دی جائے۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی روایت ہے کہ اس موقع پر آنحضرتؐ نے صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کیا تو بعض حضرات نے یہ رائے دی کہ نماز کا وقت ہو جانے پر ناقوس بجا کر نمازیوں کو اطلاع دی جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ناقوس نصاریٰ کی چیز ہے۔ اس پر چند اصحاب نے بُوق بجانے کا مشورہ دیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ بوق یہود کا شعار ہے۔ حاضرین میں سے چند افراد نے نماز کا وقت ہونے پر دف بجانے کی تجویز پیش کی۔ آپؐ نے یہ فرماتے ہوئے کہ یہ رومیوں کا طریقہ ہے، اس تجویز کو بھی رد فرما دیا۔ اس پر چند صحابہ نے عرض کیا کہ اگر نماز کا وقت ہونے پر مسجد کی چھت پر آگ جلا دی جائے تو لوگ دھواں دیکھ کر مسجد میں جمع ہو جایا کریں گے۔ مجوسی

---

[1] اصلاً یہ آیت مسجد قبا کے بارے میں نازل ہوئی جسے آپؐ نے قیام قبا کے زمانے میں تعمیر فرمائی۔ اوپر مسجد ضرار کی مذمت آئی جسے منافقین نے مسجد قبا کے قریب بنایا تھا جسے غزوۂ تبوک کے بعد آپؐ نے گروا دیا اسلئے کہ سازش کا اڈہ تھی۔ اسکی مذمت کے بعد مسجد قبا کی مدح میں یہ آیت اتری۔ (مرتب)

چونکہ آگ کی پرستش کرتے ہیں اس لئے یہ تجویز بھی مسترد ہوگئی۔ چند حضرات نے بڑے سوچ و بچار کے بعد عرض کیا کہ نماز کی اطلاع دینے کے لئے مسجد کے اوپر جھنڈا لہرا دیا جائے۔ لیکن یہ تجویز بھی کھٹائی میں پڑ گئی۔

اسلام کا مزاج باقی ادیان کے مزاجوں سے بالکل مختلف ہے اس لئے ان تجاویز کو رد کرنے کے بعد مجلس برخاست ہوگئی۔ چند صحابہ کرامؓ اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ ایک بدری صحابی عبداللہ بن زیدؓ رات بھر اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ ابن سعد سے روایت ہے کہ انھوں نے خواب میں اذان سنی۔ اُدھر حضرت عمر فاروقؓ نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ اذان اور اقامت کہہ رہا ہے۔ اگلی صبح یہ دونوں حضرات حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق آنحضرت نے بھی خواب میں ایسا ہی ملاحظہ فرمایا تھا اور نبی کا خواب وحی ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے آنحضرت کی خدمت بابرکت میں عرض کیا کہ انھوں نے خواب میں اذان کی آواز سنی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ ان کے ساتھ بھی یہی ماجرا گزرا ہے اور انھوں نے اذان کے ساتھ اقامت بھی سنی ہے۔ دو اصحاب کی گواہی سے حضور نبی کریم کو انشراح صدر ہوا اور آپؐ نے بلالؓ کو طلب فرمایا۔ ان کی آواز بڑی گونج دار تھی۔ انھیں حکم دیا کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ سے اذان سیکھ لیں اور نماز کا وقت آنے پر اذان دیا کریں۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ آیئے اس پر دوسرے زاویے سے نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ اس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

چوبیس گھنٹے اذان

اگر آپ دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو آپ جان لیں گے کہ اسلامی ممالک میں انڈونیشیا کرۂ ارض کے عین مشرق میں واقع ہے۔ یہ ملک ہزاروں جزیروں کا مجموعہ ہے جن میں جاوا، سماٹرا، بورنیو اور سلیبز بڑے جزیرے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا گنجان آباد ہے اور اس کی آبادی اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں غیر مسلم آبادی کا تناسب آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

طلوع سحر سلیبز کے مشرق میں واقع جزائر میں ہوتی ہے۔ جس وقت وہاں صبح کے ساڑھے پانچ بجے رہے ہوتے ہیں اس وقت ڈھاکہ میں رات کے دو بج رہے ہوتے ہیں۔ طلوع سحر کے ساتھ ہی انڈونیشیا کے انتہائی مشرقی جزائر میں اذان شروع ہو جاتی ہے اور بیک وقت ہزاروں مؤذن خدائے بزرگ و برتر کی توحید اور محمد مصطفیٰ کی رسالت کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں۔ مشرقی جزائر سے یہ سلسلہ مغربی جزائر کی طرف بڑھتا ہے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد جکارتا میں مؤذنوں کے اذان دینے کی باری آتی ہے۔ جکارتا کے بعد یہ سلسلہ سماٹرا میں شروع ہو جاتا ہے اور سماٹرا کے مغربی قصبوں اور دیہاتوں میں اذانیں شروع ہونے سے پہلے ہی ملایا میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ملایا کے بعد برما کی باری آتی ہے۔ جکارتا سے اذانوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ ایک گھنٹے بعد ڈھاکہ پہنچتا ہے۔ بنگلہ دیش میں ابھی اذانوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کہ کلکتہ سے سری نگر تک اذانیں گونجنے لگتی ہیں۔ دوسری جانب یہ سلسلہ کلکتہ سے بمبئی کی طرف بڑھتا ہے۔ اور پورے ہندوستان کی فضا توحید و رسالت کے اعلان سے گونج اٹھتی ہے۔

سری نگر اور سیالکوٹ میں اذان فجر کا ایک ہی وقت ہے۔ سیالکوٹ سے کوئٹہ، کراچی اور گوادر تک چالیس منٹ کا فرق ہے اس عرصے میں فجر کی اذان پاکستان میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان میں یہ سلسلہ ختم ہونے سے پہلے افغانستان اور مسقط میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

مسقط سے بغداد تک ایک گھنٹے کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس عرصہ میں اذانیں سعودی عرب، یمن، عرب امارات، کویت اور عراق میں گونجتی رہتی ہیں۔ بغداد سے اسکندریہ تک پھر ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ اس دوران میں شام، مصر، سومالیہ اور سوڈان میں اذانیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔

اسکندریہ اور استانبول ایک ہی طول بلد پہ واقع ہیں۔ مشرقی ترکی سے مغربی ترکی تک ڈیڑھ گھنٹے کا فرق ہے اس دوران میں ترکی میں صدائے توحید و رسالت بلند ہوتی رہتی ہے اسکندریہ سے طرابلس تک ایک گھنٹے کا دورانیہ ہے اس عرصہ میں شمالی افریقہ میں لیبیا اور ٹیونس میں اذانوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

الجیریا میں اذانوں کا سلسلہ ختم ہونے تک نائیجیریا، نائیجر، مراکش، ماریطانیہ اور سینیگال تک اذانوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ فجر کی اذان جس کا آغاز انڈونیشیا کے مشرقی جزائر سے ہوا تھا ساڑھے نو گھنٹوں کا سفر طے کر کے بحر اوقیانوس کے مشرقی کنارے تک پہنچتا ہے۔

فجر کی اذان بحر اوقیانوس تک پہنچنے سے قبل ہی مشرقی انڈونیشیا میں ظہر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ڈھاکہ میں ظہر کی اذانیں شروع ہونے تک مشرقی انڈونیشیا میں عصر کی اذانیں بلند ہونے لگتی ہیں یہ سلسلہ ڈیڑھ گھنٹے میں بمشکل جکارتا تک پہنچتا ہے کہ مشرقی جزائر میں نماز مغرب کا وقت ہو جاتا ہے۔ مغرب کی اذانیں سلیبز سے بمشکل سماٹرا تک پہنچتی ہیں کہ اتنے میں عشاء کا وقت ہو جاتا ہے۔ جس وقت مشرقی انڈونیشیا میں عشاء کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس وقت مغربی افریقہ میں ہنوز فجر کی اذانیں گونج رہی ہوتی ہیں۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا ہے کہ کرۂ ارض پر ایک سیکنڈ بھی ایسا نہیں گزرتا جس وقت سینکڑوں ہزاروں مؤذن بیک وقت خدائے بزرگ و برتر کی توحید اور محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ کر رہے ہوں۔ اور یہ سلسلہ تا قیام قیامت جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالی العزیز۔

آپ حضرات نے ٹیپ ریکارڈر کی سوئی کی حرکت ملاحظہ فرمائی ہو گی جو آواز کے ارتعاش کے ساتھ گھومتی رہتی ہے اور آواز کی کمی بیشی بتلاتی ہے۔ یہ تو ایک آدمی کی آواز کا ارتعاش ہے، جب ہزاروں موذن بیک وقت، خصوصاً فجر اور مغرب کے وقت اذان بلند کرتے ہیں تو ہوا میں کتنا ارتعاش اور کیسا تموج پیدا ہوتا ہے۔ ماہرین طبیعیات کا کہنا ہے کہ آواز مرتی نہیں۔ یہ ابدی چیز ہے اور جب مؤذن اذان دیتے ہیں تو ان کی آواز ہوا کے دوش پر کائنات کے آخری سروں تک پہنچنے کے لئے پرواز شروع کر دیتی ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ جب امریکی خلا باز آرم اسٹرانگ چاند پر پہنچا تو اس نے وہاں پہلی آواز اذان کی سنی جو کرۂ ارض سے ہوا کے دوش پر چاند تک پہنچ رہی تھی۔

تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کائنات اتنی بسیط ہے کہ اس کے طول و عرض کا ابھی تک سائنسدانوں کو ادراک نہیں ہو سکا۔ جس زمانے میں راقم الحروف انگلستان میں قیام پذیر تھا

خلائی ماہرین کے انتظامات نے یہ اطلاع دی تھی کہ ایک زمینی خلائی اسٹیشن نے ایسے سگنل ریکارڈ کئے ہیں جو ایک ایسے ستارے یا سیارے سے آئے ہیں جس کا فاصلہ ہماری زمین سے بیس ملین نوری سالوں کے برابر ہے۔ یاد رہے کہ ایک نوری سال کا ایک سیکنڈ ۱۸۷۰۰۰ میلوں کے برابر ہوتا ہے۔ پہلے اسے ساٹھ کے ساتھ ضرب دے کر منٹ بنائیے۔ پھر اس مجموعے کو ساٹھ کے ساتھ ضرب دے کر گھنٹہ بنائیے۔ اب اسے چوبیس کے ساتھ ضرب دیں تو ایک دن بنے گا پھر اسے ۳۶۵ کے ساتھ ضرب دیں تو ایک نوری سال ہوگا۔ ہمارے گنتی کے پدم اور سنکھ اس کا حساب بتانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے بیس ملین سالوں کی مسافت کتنی ہوگی؟ یہ ربّ المشرقین وربّ المغربین ہی جانتا ہے۔ وہی بدیع الارض والسمٰوٰت ہے۔

حضرات! مؤذنوں نے اذان کیا دی کہ خدا کی ساری خدائی میں اللہ کی توحید اور محمد مصطفےٰ ﷺ کی رسالت کا ڈنکا بجا دیا۔ اب ذرا اس آیت پر بھی غور فرمائیے:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

اب سمجھ آئے گی کہ آپ کا ذکر کتنا بلند کر دیا کہ پوری کائنات میں اس کی گونج سنائی دی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اگر اذان کی بجائے ناقوس، دف یا بوق بجائے جاتے تو رفعنا لک ذکرک اس انداز سے نہ ہوتا جس انداز سے اذان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ اذان ایک طرف تو نماز کے لئے بلاوا (CALL FOR PRAYER) ہے تو دوسری طرف اسلام کے بنیادی عقیدے کا اظہار۔ یہ بات ناقوس پھونکنے یا دف بجانے سے نہیں بن سکتی تھی۔

حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! عمرؓ کو مسلمان کر کے اسلام کو رونق بخش دے۔ حضرت عمر رضی اللہ کی تجویز پر اذان مقرر ہوئی۔ اور اس اذان نے پوری کائنات میں توحید و رسالت کا ڈنکا بجا دیا۔ کیا دعا تھی اور اللہ تعالیٰ نے کیسی قبولیت بخشی۔ ••

الرشاد کی ڈاک

۲۳ مئی ۱۹۸۸ء، دوشنبہ

ذوالمجد والکرم حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی دامت برکاتہم !

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ رمضان المبارک کی روحانی باغ و بہار سے ہر طرح شادکام اور متمتع ہونے کے بعد آں محترم ہر طرح بخیر و عافیت ہوں گے۔ بندہ بھی از طفیل دعا قرین عافیت ہے۔ رمضان المبارک کے ایک مہینہ خشک مجاہدہ سے گزرنے کے بعد بندہ کے دل میں مے آشامی کی طلب پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ بقول شخصے ؎

ساقیا! عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ مے آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر سے

لیکن یہاں بات مہینہ کی نہیں مہینوں کی ہے۔ نگاہ دید کو آپ کی شربتِ تحریر کا عرصہ سے انتظار ہے۔ مگر اب اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انتظار اس لئے بھی تھا کہ میں نے کئی مہینہ پیشتر آں محترم کی خدمت میں ایک لفافہ ارسال کیا تھا جس میں میں نے اس بات کی التجا اور درخواست کی تھی کہ آں محترم "مضمون نگاری کی ابجد" کے تعلق سے مجھے کوئی اشارہ فرمائیں یا "الرشاد" ہی میں ہم جیسے نوخیز و نو آموز افراد کی رہنمائی کے لئے اس طرح کا کوئی مضمون تحریر فرمائیں لیکن ہنوز جواب سے محرومی رہی۔

مجھے معلوم ہے ہرچند کہ آپ عدیم الفرصت ہیں لیکن اس نیازمند کی اصل آرزو کو بر لانے کے لئے کوئی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔

رمضان المبارک میں مولوی عقیل احمد صاحب مالاڈوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف نے آپ کی تراویح وغیرہ کی مصروفیت اور آپ کے ہمہ جہتی معمولات کا تذکرہ کیا تو مجھے تاریخ دعوت وعزیمت کی جلد اول کا ایک جملہ یاد آیا جس میں حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی متعنا اللہ بطول بقائہم نے تحریر فرمایا ہے کہ "کثرت کار، مناسبت تام اور مقصد سے سچی لگن ہو تو ایسے ایسے محیر العقول امور سامنے آتے ہیں جو غیر متعلق اور ناوابستہ افراد کے لئے ورطۂ حیرت میں ڈوب جانے کا سبب بن جاتے ہیں"۔

مذکورہ جملہ آپ کی ذات پر بھی صد فی صد صادق آتا ہے۔ بہر کیف آپ جیسے بزرگ کا اسی طرح اس فرد مایہ پر نظر کرم کرنا میرے لئے زبردست سعادت کا سبب ہے۔ ؎

ساغر کی ہے تلاش نہ پیمانہ چاہئے ✽ ساقی کی ایک لطفِ کریمانہ چاہئے

دوسری دریافت طلب بات یہ ہے کہ "اسلامی فقہ" کا دوسرا حصہ شائع ہوا یا نہیں، اور اگر شائع ہوا ہو تو ضرور قیمت سے مطلع فرمائیں۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے اطلاع ملنے پر میں انشاء اللہ منی آرڈر کر دوں گا۔

نیز کچھ باتوں میں مجھے شرعی وضاحت کی ضرورت ہے میں آئندہ اسے خدمت اقدس میں ارسال کرونگا۔ سردست یہ کہ (۱) ایجاب اور قبول صرف ایک مرتبہ ہونا چاہئے یا تین مرتبہ قبول کرانا ضروری ہے۔ (۲) یہ کہ خطبۂ نکاح بیٹھ کر پڑھنا مسنون ہے یا کھڑے ہوکر۔ (۳) یہ کہ شوہر اپنی بیوی کے نان ونفقہ، لباس اور سکنیٰ کا ذمہ دار ہے تو اس ذمہ داری میں شرعی پابندی کہاں تک ہے۔ کیا بیوی کے بناؤ سنگھار اور زیب وزینت کے پورا کرنے کی ذمہ داری بھی شوہر ہی پر ہے؟

میں اس امید کے ساتھ اپنی تحریر ختم کر رہا ہوں کہ آں محترم اس بے ربط تحریر کو گستاخی پر محمول نہ کرتے ہوئے جوابی خامہ فرسائی کی زحمت گوارہ فرمائیں گے۔ ؎

نامہ بر تو ہی بتا تو نے تو دیکھے ہونگے ✽ کیسے ہوتے وہ خط جن کا جواب آتا ہے

اخیر میں مولانا احمد کمال صاحب رشادی ندوی، مولوی عقیل احمد صاحب و دیگر اساتذۂ کرام جامعہ کو راقم کا سلام شوق عرض کر دیں۔ فقط والسلام

(مولانا) زبیر احمد

بیلباغ۔ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳۔ ناسک۔ مہاراشٹر

نئی کتابیں

مہمات الصرف والنحو تصنیف مولانا عبدالغفار ضیاء نگرامی ندوی قادری مجددی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، کتابت وطباعت اور کاغذ نہایت عمدہ، صفحات ۳۲۴، ناشر مصنف خود، تقسیم کار: کامل برادرس ۳ رحمانیہ مارکیٹ سیتاپور روڈ لکھنؤ، قیمت غیر مطبوعہ۔

مولانا عبدالغفار صاحب ندوی نگرامی صرف ونحو کے ایک کہنہ مشق مدرس ہیں اور اپنے ۶۱ سالہ تجربہ کے بعد یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ مقدمۂ کتاب میں خود لکھتے ہیں کہ:

"اس طرز کی تعلیم وتمرین کا آغاز ۱۹۲۶ء میں جب کہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ ششم میں پڑھ رہا تھا، ہوا۔ اب جب کہ ۱۹۸۷ء ہے ۶۱ سال مسلسل تجربات کے بعد اس کا مجموعہ مطبوع ہوکر "مہمات الصرف والنحو" کے نام سے مدارس عربیہ اور ان کے طلبا اور دیگر ان حضرات کے سامنے جو کم سے کم وقت میں بسہولت عربی نوشت وخواند پر قادر ہونا چاہتے ہیں لایا جارہا ہے۔

مسائل نحو وصرف کو اس کتاب میں اس قدر سہل، عام فہم اور دل نشیں بنایا گیا ہے کہ ہر ایک خواہ معلم ہو خواہ طالب علم، با آسانی سمجھ سکتا ہے اور محفوظ رکھ سکتا ہے مثلاً ابتدائی باتوں میں اس طرح کہا گیا ہے:

زیدٌ زید نے، زیداً زید کو، زیدٍ زید کا، زید کی، زید کے، فعلتُ میں نے کیا، فعلتَ تو مرد نے کیا۔ فعلتِ تو عورت نے کیا وغیرہ مثالوں سے معلوم ہوا کہ عربی زبان میں زبر، زیر، پیش کے بدلنے سے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ زبر، زیر، پیش کو حرکت کہتے ہیں۔ اور ان حرکتوں میں تبدیلی کے قواعد ہیں۔ یہ قواعد دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ قاعدے ہیں جن کا تعلق لفظ کے صرف

اعراب حرکت سے ہے۔ یہ قاعدے علم نحو میں بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ قاعدے ہیں جن کا تعلق لفظ کی ہر جگہ سے ہے۔ یہ قاعدے علم صرف میں بتائے جاتے ہیں۔"

دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جس جدید نصاب تعلیم کی ضرورت کا احساس قوم کو دلایا تھا بحمد اللہ اس کو خود ہی تیار کرلینے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سمت میں ایک قدم ہے۔ گو کہ مصنف موصوف قدیم طرز کے پروردہ ہیں اور مثالوں میں انھیں الفاظ و کلمات اور ترجموں کی اتباع کرتے نظر آرہے ہیں جو قدیم مدارس میں رائج تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ نے اس سے پہلے کتاب "تمرین النحو" و "تمرین الصرف" ترتیب دی ہے جو بہت مقبول و مشہور ہے مگر وہ اس فن کی ابجد ہے اور یہ کتاب صرف و نحو کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ البتہ اس کا انداز نصابی طرز کا نہیں ہے بلکہ نصاب سے باہر مشق و تمرین کیلئے نہایت مفید ہے۔

امید کہ عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پرائیویٹ طور پر عربی نوشت و خواند سیکھنے والوں کے لئے بھی یہ ایک نادر تحفہ ہے۔
(ع م)

حقیقی حج

عن ابن عمرؓ ان رجلا قال لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الحاج قال الشعث التفل قال فای الحج افضل، قال العج والثج، قال ما السبیل، قال الزاد والراحلۃ۔ (ابن ماجہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں، ایک آدمی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا حاجی کون ہے؟ (یعنی حج کرنیوالے کے اندر کون سی خوبی ہونی چاہیے) آپ نے بتایا وہ جو پراگندہ بال ہو جسکے کپڑے میلے ہوں، اس نے پوچھا افعالِ حج میں کون سا فعل اجر و ثواب کے لحاظ سے بڑھا ہوا ہے؟ آپ نے بتایا بلند آواز سے لبیک کہنا اور جانور کا خون بہانا (قربانی کرنا) اس نے پوچھا آلِ عمران آیت حج میں آئے ہوئے لفظ سَبِیْلًا سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے گھر تک پہنچنے کے لئے سواری اور سفر خرچ ہو۔

تشریح: یہ حدیث بتاتی ہے کہ حج ایک عاشقانہ قسم کی عبادت ہے۔ جو شخص اپنے محبوب کے گھر کی زیارت کو جاتا ہے اسے ہر وقت غسل کرنے اور کھانے پینے سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اسے تو جو وقت ملتا ہے اپنے محبوب سے مناجات میں، ذکر و دعا میں، توبہ و استغفار اور گریہ و زاری میں صرف کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا حج، حج ہے۔

شہر اعظم گڑھ کا مشہور دینی ادارہ

جامعۃ الرشاد

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت (۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کیساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں (۲) یہاں عالمیت پاس کرنیکے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں بی اے میں اور فضیلت پاس کرنیکے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم اے میں براہ راست داخلہ ملجاتا ہے (۳) سعودی عرب کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے، کئی طلبہ داخل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔ کئی زیر تعلیم ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جارہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہترین دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

ادارے کے شعبے اس وقت ادارہ میں حسب ذیل شعبے قائم ہیں :۔

(۱) عربی درجات مدت تعلیم سات سال (۲) درجہ حفظ و قرآت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب۔ (۴) اسلامی نرسری اسکول (۵) کتابت و جلد سازی (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح وطلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبۂ نشر و اشاعت، جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں چھ سو طلبہ ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ڈیڑھ درجن لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں، دفتر اور مطبخ کے ملازمین ان کے علاوہ ہیں۔

ادارے کا خرچ تعمیرات کے علاوہ ادارے کا سالانہ خرچ پانچ لاکھ روپیہ ہے۔

آئندہ کے منصوبے ہمارے آئندہ کے پروگرام میں مسلمان بچیوں کی ایک معیاری اقامتی درسگاہ ایک معیاری اسپتال کا قیام اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے سکھانے کا ایک ٹیکنیکل شعبہ کا قیام بھی شامل ہے، جس پر کم از کم ۵ الاکھ روپیہ کا خرچ ہے۔

جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو رمضان المبارک میں خط و کتابت کرنا چاہیئے، مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ ر جون سے شروع ہو جاتا ہے اور عربی اور حفظ میں۔ ۱ر شوال سے داخلہ شروع ہو جاتا ہے اور ۲۰ ر شوال تک ختم ہو جاتا ہے۔

Regd No Azm / N. P. 42 / 84
Regd No R N 34937 81
Phone : 2461

MONTHLY JAMEATUR RASHAD

AZAMGARH—276001 (U. P.) INDIA

APRIL
MAY
1988
ماہنامہ
جامعۃ
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد - اعظم گڈھ - یوپی
M.ALI MAU

اسلامی فقہ (اوّل و دوم)

مرتبہ:۔ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب!

دو برس سے اصلی اسلامی فقہ بازار سے غائب تھی۔ بحمد اللہ اب اسلامی فقہ کا پانچواں شاندار ایڈیشن تاج کمپنی نئی دلی سے شائع ہو کر بازار میں آگیا ہے۔

مصنف موصوف نے اس میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس سے اب یہ بالکل نئی کتاب بن گئی ہے۔ شروع میں اسلامی عقائد کے باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اسی طرح معاشرتی و معاملاتی مسائل والے حصہ میں سیکڑوں جدید مسائل مثلاً خون چڑھانا، پوسٹ مارٹم، نسبندی، اولکی زادہ، مصنوعی اعضاء وغیرہ کے احکام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں دیوانی اور فوجداری کے بقیہ ابواب مثلاً دعویٰ، قضاء، شہادت، حدود و قصاص، احکام سلطانیہ اور بین الاقوامی تعلقات کے اصول وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے، گویا شریعت اسلامی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ پڑ گئی ہو، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی فقہ کے موضوع پر اردو زبان میں اس سے زیادہ مفصل کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ تمام اہم مسائل میں ائمہ اربعہ کے مسلک کا بھی متن یا حاشیہ میں ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ شریعت اسلامی کی وسعت کا پورا اندازہ ہو سکے۔ اب اس کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے زیادہ ہو گئی ہے، اسلئے دو حصے میں کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب نہ صرف عام پڑھے لکھے لوگوں کیلئے مفید ہے بلکہ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کیلئے بھی ایک نادر تحفہ ہے، یہ کتاب ہر گھر اور ہر لائبریری میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے پہلے اسلامی فقہ کے چار ایڈیشن مکتبۃ الحسنات سے شائع ہو چکے ہیں، مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مکتبۃ الحسنات کے موجودہ مالک کی بد معاملگی کی وجہ سے ان سے دو برس پہلے اسلامی فقہ کا معاملہ ختم کر لیا گیا تھا، اس عرصہ میں انہوں نے عبارت کا تھوڑا اردو بدل کر کے قانون و اخلاق کے سارے حدود توڑ کر مولانا موصوف کی اسلامی فقہ کو اسی نام سے ایک غیر معروف مصنف کے نام سے شائع کر لیا، مگر اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہ بالکل نمایاں ہے۔ پرانی مثل "نقل را چہ عقل" کے تحت مسائل میں نہ جانے کتنی غلطیاں کر بیٹھے ہیں،

بہرحال جس اصلی اسلامی فقہ کا لوگوں کو انتظار تھا اب وہ چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔

ملنے کے پتے: تاج کمپنی، ۳۱۵۱، ترکمان گیٹ، نئی دلی ۱۱۰۰۰۶
دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱، یوپی { منیجر دارالتالیف والترجمہ، جامعۃ الرشاد،

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ
جامعۃ
الرشاد

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے	۳۰/-	غیر ممالک سے
خصوصی معاون	۱۰۰/-	پندرہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ	۳/-	$ 15/-

جلد ۱۵ — اپریل، مئی ۱۹۸۸ء مطابق شعبان، رمضان ۱۴۰۸ھ — شمارہ ۸۱-۸۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

- مجیب اللہ ندوی (مرتب)
- ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مقیم ابوظبی
- عامر مجیب رشادی، مدینہ منورہ
- عبدالمجید ندوی (شریک مرتب)
- ڈاکٹر مشیر الحق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کشمیر
- احمد کمال عبدالرحمٰن رشادی ندوی

منیجر توسیع و اشاعت: مولوی عقیل احمد صاحب ٹانڈوی

کتابت: ابوالحسنات۔ عبدالرحیم۔ رفیق احمد

مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے افضل نعیمی پریس مئو سے چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے شائع کیا

ہماری پوری اسلامی تاریخ جد وجہد اور ایثار و قربانی سے بھری ہوئی ہے۔ میدان جہاد کی تنگ وتاز ہو یا علم وفن کے بحر بیکراں کی غواصی ہو۔ اپنوں کے اصلاح کا کام ہو یا غیروں میں دعوت وتبلیغ اور بے لوث خدمت کا کام ہو۔ غرض یہ کہ زندگی کے جتنے گوشے تھے سب کو ہمارے بزرگوں نے دین کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی اور مادیت سے بھری ہوئی اس دنیا کو انھوں نے ایمان ویقین، اخلاق وکردار اور دیانت وامانت سے محروم نہ ہونے دیا۔ دنیا کی تاریخ کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو علم وفن اور اخلاق وکردار کی جتنی خوبیاں اس وقت دنیا میں نظر آتی ہیں ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا ؎

یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے

خود ہمارے ملک ہندوستان کے چپہ چپہ پر علما وصلحا کے علم وعمل اور مجاہدین اور غازیوں کے کارناموں کے نقوش ثبت ہیں جن علما وصلحا اور مجاہدین کے کارناموں کا ذکر جمیل ہماری تاریخ کے صفحات میں ملتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ خدا کے ان برگزیدہ بزرگوں کے کارنامے ہیں جو اپنا نام ونشان مٹا کر ہمیں ایمان ویقین، اخلاق وکردار اور علم وفن ہی سے نہیں بلکہ دنیا کی دولت وحشمت سے بھی مالا مال کر گئے، آپ ہندوستان کی کسی مسلمان بستی میں چلے جائیں وہاں آپ کو کسی نہ کسی شہید یا غازی یا بزرگ کا مزار ضرور ملے گا مگر ان میں مشکل سے پانچ فیصد ایسے حضرات ملیں گے جن کے نام ونشان اور کارناموں کی پوری تاریخ سے ہم واقف ہوں گے یا تاریخ کے صفحات میں انھیں محفوظ کیا گیا ہوگا، بقیہ حضرات کے حالات پردۂ خفا میں ہوں گے مگر مسلمان بستیوں کے ذرے ذرے ان کے کارناموں کے شاہد عادل ہونگے یہ انہی کا فیض ہے کہ ہندوستان میں اسلامی زندگی کے آثار ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں

اور اس ملک میں خود مسلمانوں کا وجود اس کا زندہ ثبوت ہے

ہندوستان کے مسلمان اس وقت جن روح فرسا حالات سے گذر رہے ہیں ہمارے بزرگوں کو ان سے زیادہ سخت حالات سے گذرنا پڑا تھا۔ ہم آج جس تنگ نظری، تعصب اور تشدد کے شکار ہیں ان کے زمانہ میں یہ تنگ نظری، تعصب اور تشدد اس سے زیادہ بدترین صورت میں موجود تھا مگر خدا کی ذات اور اس کی نصرت پر ان کا ایمان ویقین ہم سے بڑھا ہوا تھا، اس لئے ان کے آگے دین و ملت کے راستہ کی ہر مصیبت ہیچ نظر آتی تھی۔ انکے اخلاق وکردار میں اتنی بلندی تھی کہ اس کی عظمت ورفعت کے آگے بڑا سے بڑا خود سر دشمن بھی سرنگوں ہو جاتا تھا۔ ان کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی ایسی محبت اور دین کی ایسی عظمت تھی کہ دنیا کی ساری محبتیں اور عظمتیں اس کے آگے ماند پڑگئی تھیں۔ ان کے دل میں خدا کا خوف ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑے جابروں، ظالموں اور بڑی سے بڑی حکومتوں سے ٹکرا جانے میں بھی انھیں ایک لمحہ کے لئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ خدا کی عبادت ان کی زندگی کی سب سے زیادہ محبوب اور لذیز چیز تھی۔ بندگان خدا کی خدمت کرکے ان کو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے ان کو کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔ گویا وہ زبان حال سے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

مگر ہمارا ایمان ویقین اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ ایک ہلکی سی رکاوٹ بھی ہم کو پہاڑ نظر آتی ہے۔ ہم اپنے اخلاق وکردار کے لحاظ سے اتنے کمزور ہیں کہ ہماری آنکھیں دوسروں کے سامنے جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں دنیا کی محبت نے اتنا گھر کر لیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے اس میں بہت کم جگہ باقی رہ گئی ہے۔ ہمارے دلوں سے خدا کا خوف نکل گیا ہے اس لئے ہم اپنے سایہ سے بھی ڈرنے لگے ہیں، خدا کی عبادت میں چند منٹ صرف کرنا ہم کو بوجھ معلوم ہوتا ہے اور رات کی رات ہوٹلوں اور بازاروں میں گزار دیتے ہیں۔ بندگان خدا کی خدمت اور رفاہِ عام کے کاموں کو ہم نے دنیا کا کام سمجھ لیا ہے۔ ہمارے اسلاف سراپا ایثار تھے اور ہم سراپا

خود غرض بن گئے ہیں۔ وہ فکر و عمل کے لحاظ سے آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے اور ہم اختلاف وانتشارِ فکر و عمل کے شکار ہیں۔

اگر ہم کو ایک زندہ قوم کی طرح زندہ رہنا ہے تو ہم کو اپنے ایمان و یقین کو درست کرنا اور اخلاق و کردار کو سدھارنا ہوگا اسی کے ساتھ ہم میں مسلکی اور طبقہ واری اختلافات کی وجہ سے دوری بلکہ نفرت و حقارت کی جو خلیج حائل ہوگئی ہے اسے پاٹنا ہوگا۔ پاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلک اور خیال کے پیچھے ایک تاریخ ہے اب ہم اس تاریخ کو نفرت و حقارت سے نہیں بدل سکتے اس لئے ان اختلافات کے باوجود اپنے مشترکہ مسائل میں ایک ملی وحدت ہونے کا ثبوت دیں اور اس ملی وحدت سے ہم سیاسی وحدت کا بھی کام لیں۔ اسی سیاسی وحدت کے نہ ہونے کی وجہ سے ملک کی تمام سیاسی جماعتیں ۴۰ برس سے ہمارا استحصال کر رہی ہیں۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں اپنے سیاسی میدان کا فٹ بال بنا رکھا ہے اور ہم اپنی ملی و سیاسی وحدت کی کمزوری کی وجہ سے ان کا فٹ بال بنے ہوئے ہیں۔ کبھی حکمران جماعت ہم سے اپنا گول بناتی ہے کبھی مخالف جماعتیں۔ کسی سیاسی جماعت نے بھی حقیقی طور پر ہمارے مسائل سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ ان کے حل کیلئے کوئی مخلصانہ کوشش بلکہ وہ ہمیشہ نئے نئے مسائل میں الجھاتی رہیں تاکہ ہم ہمیشہ ان کے دست نگر بنے رہیں۔

ہم کو ان سیاسی جماعتوں کو طاقت و بنانے کا صرف اتنا صلہ ملا ہے کہ کچھ بے ضمیر اور ملی حمیت و غیرت سے خالی قسم کے لوگ وزیر اور نائب وزیر بن گئے یا ان کے ٹکٹ پر کچھ ایم ایلیز اور ایم پیز منتخب ہوکر ودھان سبھا یا لوک سبھا کے ممبر ہو گئے۔ مگر یہ مسلمان وزرا اور ممبران اسمبلی اور پارلیمنٹ ہمارے اجتماعی مفاد اور ملی مسائل کیلئے مفید ہونے کے بجائے ہمیشہ مضر ثابت ہوئے ہیں۔ اس وقت کئی برس سے مسلم پرسنل لا اور بابری مسجد کے حل کے لئے عوامی سطح سے ایک تحریک چل رہی ہے اعظم خاں جیسے دو ایک ممبروں کو چھوڑ کر سیکولر جماعت کے مسلمان ممبران مسائل کے حل کے بارے میں گونگے

بہرے بنے ہوتے ہیں، بلکہ کبھی اگر ان کی سیکولر زبان کھلتی بھی ہے تو بالکل الٹی بات وہ کہتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے آقاؤں کو زیادہ سے زیادہ خوش کرسکیں۔ اگر کبھی کوئی بات کھل کر کرتے ہیں تو وہی ممبران جو کسی مسلم سیاسی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ۴۰ برس کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں اپنی ملی وحدت کے ساتھ ایک سیاسی وحدت قائم کرنی ضروری ہے۔ ہمیں اپنی ملی اور سیاسی جد وجہد میں دوسروں کے سہارے چلنے کو اپنے اوپر حرام کرلینا ہے۔ اس وقت ۱۹۹۰ء کے ہونیوالے الیکشن کے لئے نئی سیاسی صف بندیاں ہورہی ہیں، اور یہ ساری صف بندیاں مسلمانوں کو صفر مان کر کی جارہی ہیں۔ صفر ماننے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نہ کوئی متحد آواز ہے اور نہ کوئی موثر تنظیم ہے اس لئے وہ جب جائیں گے انفرادی طور پر ان کو خرید لیں گے۔ اس وقت مسلمانوں میں بہت سے لوگ ہریجنوں کی نئی پارٹیوں سے انفرادی طور پر اپنا تال میل پیدا کررہے ہیں۔ ان سے ہمیں ضرور تعلق پیدا کرنا چاہئے مگر ملی اتحادی سطح پر۔ اگر ہم انفرادی طور پر ان کی پارٹیوں میں گئے تو ہم پھر وہی تاریخ دہرائیں گے جو ۴۰ برس سے دہرا رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی اجتماعی حیثیت پیدا کئے بغیر ان کے ساتھ ہوئے تو اس سے بھی برے نتائج ہمارے سامنے آئیں گے جو اس سے پہلے آچکے ہیں۔ اونچی ذات کے ہندؤں کے اندر اپنی پچھلی تاریخ کی وجہ سے تھوڑی بلندی بھی ہے اور کچھ رکھ رکھاؤ بھی ہے مگر انکے اندر تو یہ بات بھی نہیں ہے، وہ اقتدار کے لئے ہر سطح پر اتر سکتے ہیں۔ جگ جیون رام کا سیاسی تجربہ ہمارے سامنے ہے مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ذلیل طرز عمل مسلمانوں کے وفد کے ساتھ اسی نے اختیار کیا تھا۔

راقم الحروف کئی سال سے مسلمانوں سے یہ کہتا رہا ہے کہ وہ اپنی ایک سیاسی وحدت قائم کرلیں اگر مسلم جماعتیں اپنا تشخص باقی رکھنا ضروری سمجھتی ہیں تو میری دردمندانہ اپیل ہے کہ ۶ مہینے کے اندر وہ مختلف جماعتوں کو ملاکر اپنا ایک سیاسی وفاق ضرور بنالیں اور پھر اسکے بعد اجتماعی طور پر جس جماعت سے چاہیں سیاسی پیکٹ کرلیں لیکن اگر ہم نے اپنی ملی و سیاسی صف بندی کے بغیر کسی دوسری سیاسی صف بندی میں شامل ہوگئے تو پھر ہمارے ہاتھ وہی

کچھ آئے گا جو چالیس برس سے آ تا رہا ہے۔

علحدہ صف بندی کرنے میں فرقہ پرست طاقتیں ہی نہیں بلکہ سیلولر مزاج کے مفاد پرست مسلمان بھی ہمارے سامنے بہت سے خطرات کھڑا کریں گے ہم فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کا جرم عائد کیا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس صف بندی سے مسلمان نام کے ایم ایل اے اور ایم پی کی تعداد کچھ کم ہو جائے مگر ہمیں پورا یقین ہے کہ اس سے ہمارا ملی وزن بڑھے گا اور ہم صفر کی حیثیت سے اوپر اٹھ کر اکائی اور دہائی کی صف میں ضرور آجائیں گے، اور اگر یہ سب کچھ نہ ہو جب بھی ملی اور سیاسی اتحاد کی یہ کوشش بجائے خود فائدے سے خالی نہیں ہے۔

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض

سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

---

(۱) اس وقت ہمارے سامنے مسلم پرسنل لا کی حفاظت کا مسئلہ ہے جس کا پورا ڈھانچہ آزادی کے بعد مجروح کر دیا گیا ہے اور اس کا جو کچھ رہا سہا حصہ باقی رہ گیا ہے یکساں سول کوڈ کے ذریعہ اسکے ختم کرنے کی سازش ہو رہی ہے ہم دو سال سے مسلسل یکساں سول کوڈ دفعہ ۴۴ میں ترمیم کرانے کی طرف اپنے راہنماؤں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اب تک اس کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ہم نے فوجداری کی دفعہ ۱۲۵ میں ترمیم کرانے کے لئے جتنی زبردست مہم چلائی تھی اس سے زیادہ زبردست تحریک یکساں سول کوڈ کے خلاف چلانے کی ضرورت ہے، تحفظ شریعت ایکشن کمیٹی اعظم گڈھ اس سے پہلے بھی اس کی اہمیت بتانے کیلئے ایک پمفلٹ دو سال پہلے شائع کر چکی ہے اب پھر دوبارہ اسے بڑی تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے اور ناظرین الرشاد کو بھی بھیجا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اسے آپ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ ہمارے سامنے بابری مسجد کی واگزاری کا ہے جس کو دیر بہادر سرکار نے ہندو مسلمان دونوں کے لئے ایک جذباتی مسئلہ بنا دیا ہے۔ لیکن دیر بہادر سرکار کو سمجھ لینا چاہئے کہ مسلمان اس سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملت کے عزت و وقار کا مسئلہ ہے۔ ۲۲ مئی ۱۹۸۷ء کو بابری مسجد مرکزی رابطہ کمیٹی نے اجودھیا مارچ کا جو پروگرام رکھا ہے انشاء اللہ اس مارچ میں تحفظ شریعت

ایجیشن کمیٹی اعظم گڈھ، غازی پور، اور دیوریا کے ہزاروں جانباز مارچ میں شریک ہوں گے۔ اس کا فارم چھپوالیا گیا ہے جس پر دستخط لئے جا رہے ہیں۔

---

(۳)

اس وقت ٹیلی ویژن کو ہماری مرکزی اور صوبائی گورنمنٹوں نے ہندو مذہب اور تہذیب کے پرچار کا ذریعہ بنالیا ہے۔ خبروں اور کچھ ترقیاتی پروگرام کے علاوہ جتنے پروگرام اس سے آتے ہیں وہ سب ہندو میتھالوجی کے پرچار کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ بابری مسجد کا تالا کھلنے کے چند گھنٹے بعد ٹیلی ویژن پر مسجد کے صحن میں پوجا پاٹ کا منظر دکھایا جانے لگا ادھر کچھ دنوں سے ایسے بھی پروگرام آنے لگے ہیں جنہیں مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی تصویر کو بگاڑ کر بلکہ توہین آمیز انداز میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے خلاف ہمارے رہنماؤں اور مسلمان جماعتوں کو سخت احتجاج کرنا چاہیئے۔

(۴) پارلیمنٹ میں جلد ہی جو آسام بل پاس ہوا ہے اس کے بارے میں راقم الحروف اس سے پہلے لکھ چکا ہے کہ جب یہ بل نہیں آیا تھا تو مسلمانوں پر وہاں قیامت ٹوٹی تھی، اب قانونی حیثیت حاصل ہو جانے کے بعد دیکھئے کتنے بے گناہ وہاں سے صوبہ بدر کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم ہندوستان ٹائمز کا اداریہ کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جس نے دبے الفاظ اس کے خراب اثرات

مسلمانوں کا تناسب | آزادی کے بعد ہماری سیکولر مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کا تناسب نہ صرف گھٹا دیا ہے بلکہ بعض شعبوں میں صفر تک پہنچا دیا ہے لیکن باہر سے چندہ لینے والی جن تنظیموں اور اداروں کو بلیک لسٹ میں شامل کیا گیا ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس میں انکا تناسب ۲۴-۵ ۲ فیصد تک پہنچا دیا گیا ہے۔

بقیہ: افتاء اور اسکی ذمہ داری

خاوند کی طرف سے حکومت ایک وکیل مقرر کرے گی جسے وکالت کا حق سپرد کیا جائے گا۔ وکیل کی بحث و تمحیص کے بعد خاوند پر خرچ کی ڈگری کی جاسکے گی۔ لیکن ہمارے ہاں وارنٹ کے ذریعے احضار پر قدرت کے باوجود دانستہ طور پر فسخ کی جاتی ہے۔ حلال و حرام اور حلال نسل جیسے عظیم مسئلہ سے صرف نظر کی جاتی ہے۔ والی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

قسط ۱۲

افتار اور اس کی ذمہ داری

مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو شمارہ جنوری ۸۶ء)

اصل سوم۔ کتاب وسنّت اور اجماع کے موافق ہو

ضروری ہے کہ افتار اوفق بالکتاب والسنۃ والاجماع

عامۃ المسلمین کے لئے سہل اور آسان ہو، مفید اور ارفق ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وقف کے لازم ہونے کے لئے حاکم کا فیصلہ اور وصیت کے الفاظ اور صیغے شرط ہیں اور صاحبین کے نزدیک ان کے بغیر بھی وقف لازم ہو جاتا ہے۔

فقیہ النفس القاضی فخر الدین حسن بن منصور محمود الاوزجندی المتوفی ۵۹۲ھ فرماتے ہیں کہ صاحبین کے یہاں ان تکلفات کے بغیر وقف لازم ہے۔ لوگوں نے (علماء نے) ان آثار مشہورہ کے پیش نظر جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے مروی ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے قول کو نہیں لیا نیز اس وجہ سے کہ مہمان سرا اور مسافر خانوں کا رواج شروع سے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اس کے بانی سیدنا ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔

صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

وعندهما الوقف لازم بغير هذه التكلفات والناس لم ياخذوا لقول ابي حنيفةؒ في هذه الآثار المشهورة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم والصحابةؓ وتعامل الناس باتخاذ الرباطات والخانات اولها وقف الخليل صلوات الله وسلامه عليه۔[1]

علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، اپنے مشہور و معروف رسالہ رسم المفتی میں فرماتے ہیں:

---

[1] قاضی خان کتاب الوقف۔ ج ۴، ص ۳۰۹

مسائل فقہیہ کا کتاب وسنت اور اجماع سے ماخذ معلوم اور مشہور ہو تو ان میں کسی کا نزاع نہیں اور اگر وہ مسائل اجتہادیہ ہیں تو یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کو اگر مجتہد نے نقل کیا ہے تو اس کا اتباع لازم ہے اور اگر کسی نے مجتہد سے نقل کیا ہے اور اس کی نقل کو ثابت کیا ہے تو بھی یہی حکم ہے اور اگر ناقل اپنی طرف سے نقل کرتا ہے یا کسی دوسرے مقلد سے یا کسی کی طرف نسبت کئے بغیر مطلقاً ذکر کرتا ہے، معہذا دلیل شرعی بیان کرتا ہے پھر اس میں کلام نہیں اور اگر دلیل شرعی نہیں بیان کرتا لیکن وہ نقل مسلمہ اصول اور کتب معتبرہ کے موافق ہے تو پھر ان مسائل پر عمل جائز ہے اور عالم کو چاہئے کہ وہ اس نقل یعنی ان مسائل منقولہ پر دلیل طلب کرے، اور اگر مسائل منقولہ ان قواعد کے مخالف ہوں تو وہ قابل التفات نہیں ہیں۔

قال ان المسائل الفقهية ان كان ماخذها معلوما مشهورا، من الكتاب والسنة والاجماع فلا نزاع فيها لاحد.... والا بان كان اجتهادية ينظر ان نقلها مجتهد الزمه اتباعه والا فان نقلها عن مجتهد وأثبت نقلهُ فكذالك والا فان كان بنقل من قبل نفسه او من مقلد آخر او اطلق فان بيّن دليلا شرعيا فلا كلام والا ينظر فان وافق الاصول والكتاب المعتبرة يجوز العمل بها وينبغي للعالم أن يطلب الدليل عليه وان خالف ما ذكر فلا يلتفت اليه۔ [1]

اصل چہارم۔ ادلۂ اربعہ میں ترتیب استدلال

اس پوری بحث سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ افتاء میں پیش آمدہ اصولوں میں کتاب و سنت اور اجماع بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اجتہاد اور قیاس کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ احتجاج اور استدلال میں اسی ترتیب کو برقرار رکھا جائے گا۔ کتاب اللہ کا حکم سب پر ناطق ہو گا۔ اس کے بعد سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو من وعن یہ مقام حاصل ہو گا پھر اجماع اور قیاس کا۔ قیاس اور اجتہاد کی طرف اجماع کے فیصلہ کے بعد رجوع کیا جائے گا۔ ان کو ادلۂ اربعہ کہتے ہیں۔

---

[1] مجموعۃ الرسائل۔ ص ۱۷۹

امام اعظم ابو حنیفہؒ نے انہی کو اپنی فقہ کے لئے بطور اصول تسلیم کیا ہے کہ ایک میں حکم نہ ملے تو دوسری چیز کی طرف بالترتیب رجوع کیا جائے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا تو فرمایا:

کیف تقضی ان عرض لک قضاء قال اقضی بکتاب اللہ، قال فان لم تجد فی کتاب اللہ، قال فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ولا فی کتاب اللہ قال اجتہد برائی ولا آلو فضرب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صدرہ فقال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لما یرضی رسول اللہ۔ [1]	جب تیرے پاس جھگڑا آئے تو تو اس کا کیا فیصلہ کرے گا؟ انھوں نے کہا میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تجھے نہ ملے تو پھر تو کیا کریگا؟ انھوں نے فرمایا پھر میں سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں تجھے نہ مل سکے تو پھر تو کیا کریگا؟ انھوں نے فرمایا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اور اسمیں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کرونگا۔ آپ نے حضرت معاذ کی چھاتی پر رضا اور شفقت کا ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق عطا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

امام شمس الائمہ السرخسیؒ نے ان میں سے بعض شقوں کو ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ ان کے الفاظ میں ان مطالب کو ذکر کیا جائے:

وینبغی لہ ان یقضی بما فی کتاب اللہ فان أتاہ شیٔ لم یجدہ فیہ قضی فیہ بما اتاہ عن رسول اللہ صلی اللہ	سب سے پہلے لازم ہے کہ اللہ کی کتاب پر فیصلہ کرے اور اگر اس کے پاس کوئی ایسا معاملہ پیش ہو جو کتاب اللہ میں نہیں ملا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۴۹

عليه وسلم فان لم يجده فيه نظر فيما اتاه عن اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ورضى عنهم فقضى به وقدمه على القياس لقوله صلى الله عليه وسلم اصحابى كالنجوم بايهم اقتديتم اهتديتم۔

ارشادات سے فیصلہ کرے اور اگر اس میں نہیں ملا تو صحابہ کرام کی ہدایات پر نظر ڈالے اور ان کے مطابق فیصلہ کرے اور قیاس پر ان کو مقدم کیجے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں جن کی اقتدا کرو گے ہدایت پا لوگے۔

فان اختلفوا فيه تخير عدة اقاويله احسنها فى نفسه وليس له ان يخالفهم جميعا ويبتدع شيئا من رايه۔

اگر ان کا آپس میں اختلاف ہو تو چند مختلف اقوال میں جو بذاتہ احسن ہو اسے اختیار کرلے، قاضی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان سب کی مخالفت کرے اور اپنی رائے سے ایک نئی راہ نکالے۔

لانهم لو اجتمعوا على قول لم يجز لاحد ان يخالفهم فاذا اختلفوا على اقاويل محصورة فذلك اجماع منهم على ان الحق لا يعد مما قالوا فلا يجوز لاحد ان يخالفهم ويبتدع شيئا من رأيه ولكنه يختار احسن الاقاويل فى نفسه۔

کیونکہ صحابہ کرام جس بات پر متفق ہو جائیں تو ان کی مخالفت کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو جس وقت چند محدود و محصور اقوال پر صحابہ کرام کا اختلاف ہو تو یہ ان کی طرف سے اس بات پر اجماع ہے کہ حق ان کی بات سے متجاوز نہیں۔ لہٰذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کی مخالفت کر کے اپنی رائے سے ایک نئی بات نکالے لیکن وہ ان اقوال میں احسن اقوال کو اختیار کر سکتا ہے۔

فان لم يجده فى ماجاءه عن احد منهم اجتهد رايه فى ذلك وقاسه بما جاء منه ثم قضى بما يجتمع رايه عليه من ذلك ويرى انه الحق لانه مامور بفصل القضاء

ہاں اگر صحابہ کرام کی مرویات میں سے کسی ایک سے وہ مسئلہ نہیں ملا تو اپنی رائے کو کام میں لائے اور مرویات پر قیاس کرے اور پھر اپنی متفق رائے سے فیصلہ کرے اور یہ باور کرے کہ یہ حق ہے۔ اسلئے کہ وہ فیصلہ کے باب میں منجانب اللہ مامور ہے اور تکلیف وسعت

والتكليف بحسب الوسع۔

کے مطابق ہوتی ہے۔

فان اشكل عليه شاور رهطا من اهل الفقه فيه وكذلك ان لم يكن من اهل الاجتهاد فعليه ان يشاور الفقهاء لانه يحتاج الى معرفة الحكم ليقضي به.....

اور اگر اسے مشکل پیش آئے تو اس میں اہل فقہ کی ایک جماعت سے باہمی مشورے کرے۔ ایسے ہی اگر اجتہاد کا اہل نہ ہو وہ بھی فقہاء کے مشورے سے بات طے کرے کیونکہ وہ فیصلہ کے لئے حکم معلوم کرنے کا محتاج ہے۔

فان اختلفوا فيه نظر الى أحسن اقاويلهم واشبهها بالحق فأخذ۔

فقہاء اگر اس مسئلہ میں اختلاف کریں تو ان کے احسن اور اشبہ بالحق پر نظر کر کے فیصلہ کرے۔

الا ان هنا ان رأى خلاف رأيهم فان استحسن واشبه الحق قضى بذلك لان اجماعهم لا ينعقد بدون رايه وهو واحد منهم۔

البتہ اگر اپنے ہمعصر علماء کی رائے خلاف مفتی یا قاضی کی رائے ہو اور وہ اپنی رائے کو اچھا سمجھتا ہو اور وہ اشبہ بالحق ہو تو اس پر فیصلہ دے۔ اسلئے کہ اہل عصر کا اجماع اس کی رائے کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتا اور یہ بھی تو منجملہ اہل عصر کا ایک فرد ہے۔

وان لم يكن من اهل اجتهاد الراي ليختار بعض الاقاويل نظر الى افقههم عنده واورعهم فقضى بفتواه فهذا اجتهاد مثله۔ [1]

اور اگر یہ شخص رائے کا اتنا اجتہاد بھی نہیں رکھتا کہ مختلف اقوال میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہو تو ان علماء حضرات میں سے اس کے نزدیک جو زیادہ فقیہ اور پرہیزگار ہو تو اس کے فتویٰ پر فیصلہ کرے۔ یہ بھی اسی طرح کا ایک اجتہاد ہے۔

علم اور اجتہاد قابل تقلید امر ہے

شیخ امام ابو الفرج عبد الرحمن بن الجوزی ؒ کثرت علم کو معیار تقلید قرار دیتے ہوئے ائمہ مجتہدین خصوصاً ائمہ اربعہ کے بارے میں اپنی حسن عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

---

[1] المبسوط - ج ١٦، ص ۷۳

كن مع العلماء وانظر الى طريق الحسن، وسفيان ومالك، وابي حنيفة، واحمد، والشافعي، وهؤلاء اصول الاسلام ولا تقلد دينك من قلّ علمه وان قوى زهده۔ [1]

علماء کے ساتھ رہو۔ حسن بصری، سفیان ثوری، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام شافعی کے طریق پر خوب نظر ڈالو۔ یہ لوگ اصول اسلام ہیں اپنے دین کے معاملہ میں ان کی تقلید مت کرو جو قلیل العلم ہوں، اگرچہ ان کا زہد قوی کیوں نہ ہو۔

مقلدین پر امام کے قول کا اتباع

ان العمل بقول ابي حنيفة على مقلديه واجب والافتاء بغيره لايجوز لهم۔

امام ابو حنیفہؒ کے مقلدین پر آپ کا قول واجب العمل ہے دوسرے مذہب پر افتاء جائز نہیں ہے۔

امام صاحب سے معارضہ کی بعض صورتوں میں صاحبین کے اقوال کی ترجیح

امام کے قول پر صاحبین یا ان میں سے کسی ایک کے قول کی ترجیح ضروری عارض کی بناء پر ہوتی ہے مثلاً:

۱۔ امام صاحب کے مذہب کی دلیل ضعیف ہو۔

۲۔ ضرورۃ عام اور تعامل کی وجہ صاحبین کے قول کو اختیار کیا جائے جیسا کہ مزارعہ اور معاملہ میں صاحبین کے قول کو ترجیح حاصل ہے۔

۳۔ گردش ایام عصر اور زمانے کے اعتبار سے اختلاف رونما ہو گیا ہو یعنی اگر امام صاحب بھی صاحبین کے حالات اور تغیر زمانہ کا مشاہدہ کرتے تو ان کی موافقت کرتے۔

جیسا کہ امام صاحب کے زمانہ میں ظاہر عدالت پر فیصلہ کیا جاتا تھا زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی تھی۔ اصحاب خیر زیادہ تھے اور صاحبین کے نزدیک ظاہر عدالت کافی نہیں ہے۔

۴۔ قضاء کے بعض مسائل میں امام ابو یوسفؒ کے قول کو ترجیح اسلئے ہے کہ ان کو اس سے واسطہ پڑا تھا۔ [2]

---

[1] سید الخاطر۔ ص ۱۰۲ [2] مجموعہ رسائل ابن نجیم مصری ص ۱۸

تنبیہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبین کے اقوال میں معارضہ۔ امام صاحب کے مختلف اقوال میں ایک کا انتخاب۔ اصول ائمہ سے غیر ظاہر الروایت کی موافقت و عدم موافقت۔ غیر ظاہر الروایت کو متاخرین فقہاء کا قبول و عدم قبول۔ مجتہدین ائمہ احناف کے مراتب کے درجات۔ کتب فتاویٰ اور غیر فتاویٰ کا معیار۔ مفتی کا مجتہد یا مقلد محض ہونا۔ مجتہد کی غیر موجودگی میں افتار کا معیار۔ امام صاحب اور دوسرے ائمہ کا فرمان کہ ہمارے قول پہ کسی کو فتویٰ دینا جائز نہیں ہے جب تک کہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہم نے کہاں سے یہ بات کہی ہے۔ کی توضیح اور تفسیر۔

یہ باب تفصیل طلب ہے، دقیق بھی عمیق بھی صرف اہل علم کے لئے مخصوص ہے اس لئے کسی دوسری مجلس کی رونق کے لئے اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگر خدا تعالیٰ کی توفیق شامل ہوئی تو حصہ ثانی کے نام سے منصۂ ظہور میں لایا جائے گا۔

اصل پنجم۔ افتار میں تساہل اور تسامح نہ ہو فتویٰ میں غفلت اور تسامح سے کام لیا گیا ہو اور نہ اغماض و رواداری کا اس میں عمل دخل ہو اور نہ اس میں رخصت اور جواز کے پہلو تلاش کئے گئے ہوں، مستفتی کی رضا جوئی مطلوب ہو اور نہ حیلہ سازی مطمح نظر ہو، محض رضائے خدا اور حق طلبی پیش نظر ہو اور یہ کہ احکام خداوندی اسکی مخلوق تک صحیح صحیح پہنچ جائیں، اگر ان مقاصد میں خدا نا خواستہ ذرا بھی لغزش ہوئی تو اسلامی اقدار پامال ہوں گے، دین میں استخفاف پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ استہزا کیا جائے گا، معصیت پر جرأت بڑھ جائے گی۔ ایسے ہی اختلافی مسائل میں اپنی حسب منشار بلا دلیل کسی قول کو ترجیح نہ دی جائے خواہ اس میں کسی امام کا قول ہی کیوں نہ پایا جائے۔ تاویلات کی فریب کاریوں اور فتاویٰ کی قلابازیوں سے ہمیشہ تشویش میں رہنا چاہئے۔ ترجیح بلا مرجح ممنوع ہے ایسا کرنا اتباع نفس میں داخل ہے اور شرع میں اتباع نفس حرام ہے۔ سیدنا داؤد علیہ السلام نے جب آپس میں دو جھگڑنے والوں کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو قضا کا ایک ضابطہ بتلا دیا۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض	اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں میں
فاحکم بین الناس بالحق، ولا تتبع	حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کا اتباع نہ کرو
الھوی۔ فیضلک عن سبیل اللہ	وہ تجھے اللہ کی راہ سے بے راہ کر دے گی، جو لوگ اللہ کی

ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب۔ [1]

راہ سے بے راہ ہو گئے ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انھوں نے یوم الحساب کو بھلا دیا۔

باوجود عصمت، عظمت اور عزیمت کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو عدل و انصاف اور ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔

وان احکم بینھم بما انزل اللہ و لا تتبع اھوائھم و احذرھم ان یفتنوك عن بعض ما انزل اللہ الیك۔ [2]

ان میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کی مرضی پر نہ چلیں اور ان سے پرہیز رہیں کہ کہیں تجھے بہکا نہ لیں کسی ایسے حکم سے جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر نازل کیا ہے۔

المیہ تعزیرات ہند میں طرح طرح کی باریکیوں اور موشگافیوں میں مہارت پیدا کرنے کے باوجود حکام اور دفتر کا عملہ شرعی احکام سے ناواقف ہے اور ان میں غفلت برتتا ہے۔ نکاح، طلاق پھر تنسیخ جیسے حلال و حرام مسائل میں ان کا طرز عمل غیر ذمہ دارانہ ہے۔

مسئلہ تنسیخ کے باب میں شرعاً ان وجوہ کو مدنظر رکھا جانا چاہئے جن کی بنا پر تنسیخ عمل میں لائی جاتی ہے، وجوہ تنسیخ مثلاً خاوند کی نامردی، دیوانگی، گمشدگی اور ضد و عناد ہے کہ وہ نہ حقوق زوجیت ادا کرے اور نہ طلاق پر آمادہ ہو۔ اسی طرح بیوی بھی تنسیخ کا مطالبہ کرے یہ نہ ہو کہ وہ تو خلع کی طالب ہو اور حاکم تنسیخ کر دے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ تنسیخ کے دعوے میں یوں لکھا جاتا ہے کہ خاوند پٹائی کرتا ہے، سخت مزاج ہے، اس نے دوسرا نکاح کر لیا ہے، مہر کی خطیر رقم اس کے ذمہ واجب الادا ہے، ادائیگی میں لیت و لعل کر رہا ہے۔ یہ ہیں دلائل اور دعاوی جن کی بنیاد پر عورت اپنے ماں باپ یا کسی غیر کی مدد سے اپنے خاوند سے رہائی چاہتی ہے اور اس کے خلاف استغاثہ کیا جاتا ہے۔ فقہاء کرام نے تنسیخ کی چند شرائط بیان کی ہیں:

---

[1] سورۃ صٓ، رکوع ۲ [2] سورۃ المائدہ رکوع

۱۔ حاکم مسلمان ہو، تنسیخ کی وجوہ پر فیصلہ کرنے کا مجاز ہو۔ ۲۔ تنسیخ کی وجوہ صحیح ہوں۔
۳۔ عورت تنسیخ کا مطالبہ کرے۔ ۴۔ تنسیخ کا دارومدار ان اشیاء کو قرار دے جو دعویٰ میں بیان کی گئی ہوں۔ ۵۔ مدعاعلیہ کو حاضر عدالت ہونے کا حکم دے اور جواب دعویٰ کے بعد ظالم قرار دے۔

لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ مدعیہ کی بات سن کر عموماً یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ عورت مظلوم ہے۔ اس کی اپنے خاوند کو ناپسندیدگی حاکم کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ وقتی طور پر عورت کے حق میں فیصلہ دیا جائے حالانکہ اس عارضی خوشی سے بعض دفعہ عاجلانہ فیصلے کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کی خانہ بربادی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ قواعد و ضوابط کی بالاتری کے بجائے حاکم اپنی رائے و قیاس کو دخل دیتا ہے کہ چونکہ ان کے مابین نباہ مشکل ہو گیا ہے لہذا مدعیہ کے حق میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ چونکہ خاوند حاضر عدالت نہیں ہوا یا کسی ایک سماعت میں نہیں آیا تو یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ اسے اس دعویٰ کی اطلاع تک نہ ہو جیسے کہ آج کل سمن غلط بھیجنے کی وبا عام ہے، یا یہ کہ خاوند دعویٰ دائر کردہ عدالت کو شرعی عدالت نہ سمجھتا ہو، یا اسے کوئی اور عذر درپیش ہو۔ ایسی صورت میں حکام پر فرض عائد ہوتا ہے کہ جبراً خاوند کے حاضر ہونے کا حکم دیں اور اس سے بازپرس کریں۔ اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ مدعا علیہ نہ تو آباد کرنے پر رضامند ہے اور نہ طلاق دینے پر تو اسے ظالم قرار دیں۔ نباہ مشکل ہونے کی بنا پر خلع کرا دیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ حاضر نہ ہونے کو یک طرفہ کارروائی کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے کہ یہ شخص متعنت (ظالم) ہے۔ لہذا خاوند کی غیر موجودگی میں یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ یک طرفہ کارروائی فقہاء کرام کے یہاں قضاء علی الغائب کہلاتی ہے۔ حنفی مذہب میں یہ ہے کہ اگر کوئی شافعی مذہب کا قاضی اس طرح فیصلہ کرے تو بھی نافذ العمل نہیں ہوگا۔ فتاویٰ شافیہ میں ہے:

فعلی ھذا ما یقع فی زماننا من فسخ القاضی الشافعی بالغیبۃ لا یصح ولیس للحنفی تنفیذہ سوا بنی علی اثبات الفقر او علی عجز المرأۃ	لہذا ہمارے زمانے میں شافعی المذہب قاضی، خاوند کی غیر موجودگی میں فسخ کا جو فیصلہ کر دیتا ہے وہ صحیح نہیں ہے ایک حنفی المذہب قاضی اسے نافذ نہیں کر سکتا خواہ اس فیصلے کا دارومدار اس پر ہو کہ وہ

من تحصيل النفقة منه بسبب غيبته فليتنبه لذلك۔	تنگ دست ہے، یا یہ کہ عورت خاوند کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خرچہ حاصل کرنے سے عاجز ہو
(ص ۹۰۳ ، ج ۲)	اس بات میں ہوشیار ہو جانا چاہیئے۔

ایک با اختیار حاکم اپنے اختیارات کا جائز اور صحیح استعمال کیوں نہیں کر پاتا۔ مالی معاملات میں معمولی غیر حاضری سے بلاضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ حلال و حرام اور حلالی نسل کے حصول کے لئے ایک دو تاریخ پیشی پر غیر حاضری کے باعث یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی گئی" یہ روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ عورت کے لئے خاوند پر خرچ کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لو طلق امراته عند العدل فغاب عن البلد ولا يعرف مكانه او يعرف لكن يعجز عن احضاره او ان تسافر اليه هي او وكيله، لبعده او لمانع آخر۔	خاوند نے اگر اپنی عورت کو کسی اچھے آدمی کے پاس ٹھہرایا او شہر سے باہر چلا گیا۔ اس کی رہائش کا پتہ نہ ہو اور اگر پتہ ہو لیکن اسکے حاضر کرنے کی کوئی صورت نہ ہو بلکہ مجبوری ہو اور نہ عورت اس کے پاس جانے کیلئے سفر کر سکتی ہو اور نہ اس کا وکیل۔ وہ دور رہتا ہو، یا کوئی اور مانع
(فصل فی الحبس، ج ۲، ص ۴۷۰، ۴۷۱)	در پیش ہو۔

دیکھیئے بیوی پر خرچ کے باب میں اتنی شرائط و قیود لگائی گئی ہیں تاکہ خاوند کی غیر موجودگی میں اس پر ظلم نہ ہو۔ ایک شرط یہ بھی بتائی کہ (لكن يعجز عن احضاره) لیکن خاوند کو حاضر عدالت کرنے میں مجبوری اور لاچاری ہو۔ غور طلب یہ امر ہے کہ خاوند کو کس کو حاضر کرنا تھا اور حاضر کرنے میں کون مجبور و لاچار ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ حکومت اور حاکم کا کام تھا۔ جب حکومت اپنے وسائل سے خاوند کو حاضر عدالت کرنے میں ناکام رہے تو پھر اس کی صورت یہ ہو گی۔

وينبغي عن الغائب وكيل يعرف انه يراعي جانب الغائب ولا يفرط في حقه۔	ایسے چاہیئے کہ خاوند غائب کی طرف سے ایک وکیل مقرر کیا جائے جس کے متعلق علم ہو کہ وہ خاوند کی رعایت ملحوظ
(شامیہ، ج ۲، ص ۴۷۱)	رکھے گا اور اسکے حق میں زیادتی نہیں کرے گا۔

کس قدر احتیاط برتی گئی ہے اگر خاوند کی حاضری کی تمام ممکنہ صورتیں کالعدم ہو جائیں تو پھر

باقی صفحہ پر

رمضان المبارک کے

روزے

روزہ کو عربی میں صَوْم کہتے ہیں، صوم کے معنی بات چیت یا کھانے پینے سے رک جانے کے ہیں، اور شریعت میں صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کھانا پینا چھوڑنے، عورتوں سے الگ رہنے اور بُری باتوں سے بچنے کو صوم یا روزہ کہتے ہیں۔ (شرح وقایہ)

روزہ کی اہمیت قرآن مجید کی متعدد آیات اور بے شمار احادیث نبوی سے روزہ کی نہ صرف اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا شمار ان فرض عبادات میں ہوتا ہے جن پر ایمان و اسلام کی بنیاد ہے، قرآن پاک میں ہے کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ)	مسلمانو! تمہارے اوپر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے دوسری امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی طرح روزہ کا حکم بھی خدا نے دوسری امتوں کو دیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے نبی اور رسول دنیا میں گذرے ہیں ان سب نے اس کی تاکید کی تھی اور اسے فرض قرار دیا تھا۔ اہل کتاب کے یہاں روزے کا رواج آج بھی باقی ہے، ان کے علاوہ مشرک قوموں میں برت کا رواج بھی قرآن پاک کی اس تاریخی شہادت پر یقین کے لیے کافی ہے، صرف جو فرق ہے وہ روزوں کی تعداد اور وقت میں ہے، یہ امت مسلمہ کی خصوصیت ہے کہ اس پورے ایک مہینے کے روزے فرض کیے گئے ہیں، قرآن نے مِنْ قَبْلِكُمْ کے لفظ سے محض ایک تاریخی حقیقت ہی کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ اس میں مسلمانوں کے سامنے اس کی طبعی مشقت کو یہ کہہ کر آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تم سے پہلے اگلی امتیں بھی اس مشقت کو برداشت کر چکی ہیں۔

قرآن مجید جو اس دنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت ہے اس کا نزول اسی مبارک مہینہ سے شروع ہوا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرۃ)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن پاک نازل ہونا شروع ہوا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن روزہ کے مہینہ سے نازل ہونا شروع ہوا، قرآن پاک ہی کی دوسری آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رمضان میں بھی اس مبارک رات سے اس کا نزول شروع ہوا جس کو لیلۃ القدر کہا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے کہ وہ کون سی رات تھی کسی نے ۲۵ کی رات کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، کسی نے ۲۱ دیں کو۔ مگر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کسی میں پڑے گی، اس لیے انھی پانچ راتوں میں سے کسی میں قرآن پاک کا نزول شروع ہوا۔

قرآن پاک کی پہلی آیت لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ پر اور دوسری آیت لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کے جملہ پر ختم ہوتی ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ روزہ سے تمھارے اندر تقویٰ یعنی پرہیزگاری اور خدا کا خوف پیدا ہونا چاہیے، گویا روزہ کی روح اور اس کی غایت تقویٰ پیدا کرنا ہے اور تقویٰ نام ہے خدا کے خوف کی وجہ سے اپنے جذبات اور خواہشاتِ نفس پر قابو پانے کا، اور یہ چیز روزہ کے ذریعہ بدرجۂ اتم پوری ہوتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ بُرے سے بُرا آدمی بھی روزہ میں کچھ نہ کچھ ضرور سنور جاتا ہے، دوسری آیت لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کے کئی پہلو ہیں۔ اور ہر پہلو قابل شکر ہے، اگلی امتوں کو روزہ کا جو حکم دیا گیا تھا اس میں سختی کا پہلو غالب تھا، وہ رات میں اپنی بیویوں کے پاس نہیں جا سکتے تھے لیکن امت محمدیہ کو اس کی اجازت ہے، اگر کوئی مریض ہے تو وہ روزہ قضا کر سکتا ہے، حاملہ اور مرضعہ کے لیے آسانی ہے، اگر کوئی بہت ضعیف ہے تو اس کیلئے فدیہ ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس مہینہ میں واقعی اللہ کی عظمت، کبریائی اور شکرگذاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، ہم روزانہ کھانا کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں، مگر کھانے اور پانی کی جو قدر اور لذت روزہ افطار کرتے وقت روزہ دار کو معلوم ہوتی ہے، وہ دوسرے کو نہیں معلوم ہو سکتی

کھانے کا ایک ایک لقمہ اور پانی کا ایک ایک قطرہ جب حلق کے نیچے اترتا ہے تو خدا کی اتنی بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے کہ گویا اس سے پہلے وہ اس کی لذت جانتا ہی نہیں تھا، اگر ذرا بھی شعور ہو تو اسکے لیے آدمی کے اندر جذبۂ شکر ضرور پیدا ہوگا، اسی جذبہ کا اظہار روزہ افطار کرنے کی دعاؤں میں ہوتا ہے
اَللّٰھُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ ۔ ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ تَعَالٰی ۔ پھر اس کی شکر گذاری کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسی نعمت اسی مہینہ میں عطا کی جو ہماری مادی زندگی کے لیے مجموعۂ ہدایت بھی ہے اور روحانی زندگی کے لیے نسخۂ کیمیا بھی ہے غرض روزہ سے آدمی کے اندر تقویٰ بھی پیدا ہوتا ہے اور جذبۂ شکر بھی، اور روزہ کی یہ سب سے بڑی فضیلت ہے۔

قرآن پاک کے علاوہ بے شمار احادیث نبویؐ میں بھی روزہ کی بڑی فضیلت آئی ہے، چند ارشادات نبویؐ ملاحظہ ہوں: ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "ہر نیکی کا ثواب بندوں کے اعمال نامہ میں دس گنے سے سات سو گنے تک لکھا جاتا ہے، لیکن روزہ خاص میرے لیے ہے، اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا۔" (بخاری) اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا کی قدرت لامتناہی ہے اسی طرح روزے کے اجر کی بھی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "روزہ دار کے منھ کی بو خدا کو مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے، ایک حدیث میں ہے: ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادت کا دروازہ روزہ ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ روزہ گناہوں سے بچنے کے لیے ایک ڈھال ہے"، آپؐ نے فرمایا کہ "جن روزہ داروں کے روزے مقبول ہو جائیں گے، ان کے لیے قیامت کے دن ایک دروازہ ہوگا جس سے وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور دروازہ کا نام "ریّان" ہے، یعنی سیراب کرنے والا" آپؐ نے فرمایا ہے کہ "جب روزہ شروع ہوجاتا ہے تو شیطان مقید کر دیے جاتے ہیں، جہنم کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں[1]، آپؐ نے فرمایا کہ روزہ قیامت کے دن خدا سے سفارش کرے گا کہ اے پروردگار! اس نے میری وجہ سے

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنۃ وغلقت ابواب جھنم وسلسلت الشیاطین، متفق علیہ۔ اوپر جتنی حدیثیں نقل کی گئی ہیں، وہ سب بخاری و مسلم اور دوسری احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔ (مشکوٰۃ ص ۱۷۳)

کھانا پینا اور اپنی خواہش نفس کو چھوڑ دیا تھا، تو اس کی مغفرت فرما۔"

لیکن یہ اجر و ثواب اس وقت ملے گا جب روزہ مقبول ہو جائے، اور کسی عبادت کے مقبول ہونے کے لیے سب سے ضروری چیز خلوص ہے، یعنی وہ عبادت صرف خدا کے لیے کی گئی ہو، روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں خلوص دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے، ایک آدمی اگر چاہے تو چھپ کر کھا پی سکتا ہے، یا اپنی خواہش نفس پوری کر سکتا ہے، اور یہ سب کرتے ہوئے خدا کے علاوہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا، مگر اس کے باوجود وہ نہ تو کھاتا پیتا ہے اور نہ اپنی خواہش نفس پوری کرتا ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ خدا ہی کے لیے روزہ رکھتا ہے، اسی وجہ سے خدا نے کہا ہے کہ "روزہ کا بدلہ میں دوں گا۔"

لیکن اس خلوص کے باوجود بعض اعمال ایسے ہیں جو روزہ کے خلوص کو خراب کر دیتے ہیں، اور روزہ دار اس کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے، مثلاً روزہ میں لڑائی جھگڑا کرنا، گالی گفتہ بکنا، پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا، چغلی کرنا، حرام مال کھانا، جو لوگ ان باتوں سے نہیں بچتے ان کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔ (بخاری)	جو شخص غلط، جھوٹ اور گناہ کی بات اور غلط گناہ کا کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

غلط بات اور غلط عمل میں زبان اور جسم کا ہر بُرا اور غلط عمل شامل ہے۔

آپؐ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

كَمْ مِّنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاءُ۔ (دارمی بحوالہ مشکوٰۃ)	کتنے روزہ دار ہیں جن کو پیاسا رہنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہے۔

اسی بنا پر آپ نے فرمایا ہے کہ روزے سے گناہ ضرور معاف ہوتے ہیں، مگر اس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک ایمان اور دوسرے احتساب مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ، ایمان تو یہ ہے کہ اس کو خدا، آخرت، رسالت وغیرہ پر یقین ہو اور احتساب یہ ہے کہ روزہ خدا ہی کے لیے رکھا گیا ہو، اور اس کو تمام برائیوں سے محفوظ رکھا گیا ہو، اس میں دکھاوا اور

نمود و نمائش نہ ہو۔

ایمان واحتساب کی قید لگادینے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو لوگ ایمان اور احتساب کے بغیر بھوکے پیاسے رہتے ہیں ان کا بھوکا پیاسا رہنا روزہ نہیں ہے، اسی بنا پر برت اور بھوک ہڑتال وغیرہ کو اسلامی شریعت میں روزہ نہیں کہا جائے گا، اگر ان تمام باتوں کا خیال کرکے آدمی روزہ رکھے تو جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے واقعی آدمی پرہیزگار اور متقی بن سکتا ہے۔ اور اس کا نفس اس کے قابو میں آسکتا ہے۔

اسی اہمیت کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی اور رمضان کے درمیان برابر صحابہؓ کو روزہ مقبول بنانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے، آپؐ نے بار بار فرمایا ہے کہ "جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ روزہ رکھے گا اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔" مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے شعبان کے آخری دنوں میں صحابہؓ کے مجمع میں ایک تقریر فرمائی، جس میں فرمایا کہ " ایک بہت ہی مبارک مہینہ تمھارے اوپر سایہ کیے ہوئے ہے، اس مہینہ میں ایک رات ہزار مہینے سے زیادہ بہتر ہے، دن میں اس کے روزے فرض ہیں، اور رات کی عبادت میں ثواب ہے، اس میں نفل کا ثواب فرض کے برابر اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور سلوک کا مہینہ ہے، اس میں مومن کی روزی زیادہ ہوتی ہے، جو شخص روزہ دار کو افطار کرادے، اس کو ایک روزہ کا ثواب ملے گا اس پر صحابہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کے پاس اتنا وافر کھانا تو نہیں ہوتا کہ خود بھی کھائیں اور کسی کو افطار بھی کرائیں، آپؐ نے فرمایا کہ اگر کچھ نہ ہو تو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی ہی سے افطار کرادو، غور کیجیے کتنے صحابہؓ کے پاس اتنا کھانا نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کو افطار کرا سکیں مگر اس کے باوجود وہ روزہ رکھتے تھے، خود آپ کا حال بھی یہی رہتا کہ آپ کو کبھی کبھی روزہ روزہ پر روزہ رکھنا پڑتا تھا، یعنی مشکل سے پیٹ بھر کھانا میسر ہوتا تھا۔ (بخاری ومسلم)

رمضان کا چاند دیکھنے کا حکم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ توڑ دو۔"[1]

---

[1] بخاری ومسلم۔

اسی حکم کی بنا پر شعبان کی ۲۹ تاریخ کو مطلع کے اوپر رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے، مطلع سے مراد آسمان کا وہ حصہ ہے جہاں چاند نکلتا ہے، یہ ہر موسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، اگر ۲۹ کو چاند دکھائی دے تو دوسرے دن سے روزہ رکھنا چاہیے، اور اگر چاند دکھائی نہ دے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ مہینہ ۳۰ کا ہے، اور ۳۰ دن گذار کر دوسرے دن سے روزہ رکھ لینا چاہیے، خواہ کوئی چاند دیکھے یا نہ دیکھے۔

یہ حکم اس وقت کا ہے جب مطلع یعنی چاند نکلنے کی جگہ پر بدلی یا بہت زیادہ گرد و غبار[1] نہ ہو لیکن اگر ۲۹ تاریخ کو مطلع صاف نہ ہو تو پھر دوسرے دن ۱۰۔۱۱ بجے تک چاند کی خبر کا انتظار کرنا چاہیے، اور کھانا پینا نہ چاہیے، کہ ممکن ہے کہیں سے چاند کی معتبر خبر آ جائے، اگر آ جائے تو پھر روزہ کی نیت کر کے روزہ رکھ لیا جائے، اور اگر نہ آئے تو پھر کھا پی لینا چاہیے[2]۔

(۱) ۲۹ تاریخ کو اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نہ ہو تو پھر ۳۰ تاریخ کو چاند کی خبر کے بغیر روزہ کی نیت کرنا مکروہ ہے، بعض لوگ یہ نیت کر لیتے ہیں کہ اگر چاند کی خبر آئی تو رمضان کا روزہ ورنہ نفل کا روزہ، یہ بھی مکروہ ہے، شریعت میں اس کو شک کا دن کہتے ہیں، اور اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے[3]۔

(۲) بعض لوگ اس خیال سے تیس کا روزہ رکھتے ہیں کہ تیس روزے پورے ہو جائیں، یہ بھی مکروہ ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ توڑ دو، چاہے انتیس روزے ہوں یا تیس۔

چاند کی گواہی اگر مطلع صاف نہ ہو اور عام لوگوں کو چاند نظر نہ آیا ہو، لیکن اگر ایک نمازی پرہیزگار اور سچا مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت، یہ گواہی دے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی گواہی مان لینا چاہیے، اور دوسرے دن سے روزہ شروع کر دینا چاہیے[4]، یہ تو رمضان کے

---

[1] عالمگیری ج۱ [2] رد المحتار، ویأمر المفتی العامة بالتلوم الی وقت الزوال ثم بالإفطار ج۲، ص ۱۴۱۔ [3] من صام یوم الذی یشك فیه فقد عصی ابا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)۔ [4] فتاویٰ ہندیہ ج۱، ص ۱۹۷۔

چاند کا حکم تھا، لیکن اگر بدلی یا غبار کی وجہ سے عید کا چاند نہ دکھائی دے تو پھر ایک آدمی کی گواہی قابلِ اعتبار نہیں ہے چاہے وہ کتنا پرہیزگار اور نمازی کیوں نہ ہو، بلکہ اس کے لیے دو پرہیزگار اور سچے مسلمان مرد یا ایک مسلمان مرد اور دو مسلمان عورتوں کی گواہی کی ضرورت ہے[1]۔

یہ تو مطلع صاف نہ ہونے کا حکم تھا، اگر مطلع صاف ہو تو پھر ایک یا دو آدمی کے دیکھنے اور ان کے گواہی دینے سے کچھ نہیں ہوتا، اس صورت میں اتنے آدمیوں کا دیکھنا ضروری ہے کہ ان سب کا جھٹلانا آسان نہ ہو، یعنی وہ خبر خبرِ مستفیض ہو، خبرِ مستفیض کی تعریف آگے آ رہی ہے۔

رویتِ ہلال کے ثبوت کی کئی صورتیں ہیں، اوپر دو صورتوں کا ذکر ہو چکا ہے، ایک یہ کہ مطلع صاف ہو، دوسرے یہ کہ مطلع صاف نہ ہو، ان دونوں صورتوں میں خبر و شہادت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر براہِ راست خبر و شہادت کے علاوہ کئی اور بالواسطہ صورتیں ہیں جن سے چاند کا ثبوت ہو سکتا ہے۔

وہ یہ ہیں:

(۱) شہادۃ علی الشہادۃ | یعنی دو ثقہ آدمیوں نے چاند دیکھا، مگر وہ خود کسی عذر کی بنا پر[2] قاضی یا مفتی کے پاس نہ جا سکتے ہوں، تو وہ دو ثقہ آدمیوں کو اپنی طرف سے بھیج دیں، اور وہ ان کی طرف سے کہیں کہ فلاں فلاں لوگوں نے چاند دیکھا ہے اور ہم کو شاہد بنا کر بھیجا ہے، تو اس صورت میں رویت کا فیصلہ مفتی یا قاضی کر سکتا ہے۔

(۲) شہادۃ علی قضاء القاضی | قاضی یا مفتی نے چاند کی شہادت قبول کر لی اور اس مجلس میں شریک دو دین دار آدمی دوسری

---

[1] مالی معاملات میں یا حدود وغیرہ میں گواہی و شہادت کی شرط ذرا سخت ہے، مگر رمضان یا عید کے چاند کے لیے ایسے آدمیوں کی شہادت بھی معتبر ہے جن کے حالات سے پوری واقفیت نہ ہو، یعنی وہ مستور الحال ہوں، یعنی ان کی برائیاں عام نہ ہوں، فان کان مستور الحال قبل (ہدایہ وحاشیہ شرح وقایہ) امام شافعی ایک آدمی کی گواہی کو رمضان اور عید دونوں میں قبول کر لینے کے قائل ہیں، مگر ائمہ ثلاثہ عید کے ثبوت کے لیے دو عادل گواہوں کی شرط لگاتے ہیں، (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱، ص ۵۵۲) [2] باب الشہادۃ علی الشہادۃ، وھی مقبولۃ لکن لا تقبل الا بشرط تعذر حضور الاصل (شامی ج ۴، ص ۳۴۳)

جگہ کے قاضی یا مفتی کے پاس جاکر شہادت دیں کہ ہمارے سامنے فلاں قاضی یا مفتی کے یہاں چاند کی شہادتیں پیش ہوئیں، اور اس کے مطابق قاضی یا مفتی نے رویت کا فیصلہ کر دیا، تو یہ شہادت دوسری جگہ کے لیے قابل قبول ہوگئی، اور رویت ہلال کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے[1]۔

(۳) قاضی کا خط قاضی کے پاس

ایک جگہ کے قاضی یا مفتی یا کسی ذمہ دار عالم کے سامنے چاند کی شہادت پیش ہوئی، اور انھوں نے اسے قبول کر لیا، اب انھوں نے دو دیندار مسلمانوں کے سامنے یہ خط لکھا کہ میں نے شرعی شہادت کی بنا پر رویت ہلال کا فیصلہ کر دیا ہے، وہ اس خط پر اپنا دستخط کر دے اور اگر مہر ہو تو مہر لگا دے، اور وہ دونوں مسلمان اس خط کو لے جاکر دوسری جگہ کے مفتی، قاضی یا ذمہ دار سے کہیں کہ یہ خط میرے سامنے لکھا گیا ہے کہ اسے آپ تک ہم پہونچا دیں، اس بنیاد پر قاضی یا مفتی یا ذمہ دار عالم چاند ہونے کا اعلان کر سکتا ہے، مقصد یہ ہے کہ کوئی ذمہ دارانہ خط ہونا چاہیے، ایک عام آدمی کا خط نہیں ہونا چاہیے۔

(۴) خبر مستفیض

یعنی چاند کی خبر مشہور ہو جائے تو وہ قبول کی جاسکتی ہے، استفاضہ کی تعریف یہ ہے:

ان المراد بالاستفاضة تواتر الخبر من الواردين من بلدة الثبوت الى البلدة التي لم يثبت بها۔ (حاشیہ بحر الرائق ص ۲۷۰/۲ فتاوی رحیمیہ ج ۵، ص ۵)	استفاضہ سے مراد اس جگہ کی وہ خبر ہے، جہاں رویت ثابت ہو چکی ہے اور اسے وہاں سے آنے والے بہت سے لوگ وہاں آکر بیان کریں جہاں رویت کا ثبوت نہیں ہو سکا ہے۔

یعنی یہ خبر افواہ جیسی نہ ہو کہ نہ کہنے والا معلوم ہو اور نہ سننے والا۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا حکم یہ ہے کہ اگر ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر علمائے کرام کی کوئی مجلس یا معتبر چاند کمیٹی شہادت لے کر فیصلہ کرے، اور پھر ان کی طرف سے اس کا اعلان ہو تو مقامی علماء اور معتبر چاند کمیٹی غور

---

[1] در مختار ج ۲، ص ۱۲۸۔

کر کے رویت ہلال کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ صرف عوام کی منظوری اور رائے معتبر نہیں ہے۔ موجودہ دور میں جس میں ہر شخص مفتی بن گیا ہے، احتیاط ضروری ہے۔ اسی طرح سے اگر متعدد جگہ سے یہ اطلاع آئے کہ فلاں جگہ کے قاضی یا مفتی نے رمضان کے شروع ہونے یا عید کے ہونے کا اعلان کیا ہے، تو مقامی علماء کو اگر اس کی صحت کا غلبۂ ظن ہو جائے تو وہ رویت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

اسی طرح تار، وائرلیس اور ٹیلیفون کے بارے میں خاتم الفقہاء مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اور مجلس تحقیقات شرعیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے جو فیصلہ کیا ہے۔ وہ نہایت صائب فیصلہ ہے تار، خط، ٹیلیفون کی خبر معتبر نہیں ہے، ہاں خصوصی انتظام کے تحت متعدد جگہوں سے تار، ٹیلیفون اور خطوط آئیں اور مقامی علماء کہیں کہ ان سے ظن غالب پیدا ہوتا ہے تو اس بنیاد پر مقامی علماء کا فیصلہ قابل قبول ہوگا، مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ملاحظہ ہو:

واقعی در رویت ہلال شہرت خبر معتبر است	واقعہ یہ ہے کہ رویت ہلال کے سلسلہ میں
اگر از شہرے خبر رسیدہ کہ بہ شب	خبروں کا مشہور ہونا معتبر ہے، اگر کسی شہر سے
گذشتہ در آنجا رویت ہلال شدہ	یہ خبر ملے کہ وہاں چاند دیکھا گیا ہے، یا تار وغیرہ
بوساطت تار برقی دریافت ایں امر شد، تا	کے ذریعہ خبر ملے کہ چاند ہوگیا تو جب تک متعدد
وقتیکہ شہرت آں نشود از تحریرات کثیرہ و	تحریروں اور خبروں سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے
اخبار عدیدہ معلوم نشود اعتبار آں نباشد[1]	اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ایک تو ہے شہادت، اور دوسرے شہادت کسی دوسری جگہ گذری، اور اس کی اطلاع متعدد واقعات سے مل جائے تو شہادت ٹیلی فون، تار، وائرلیس، یا تحریر سے ثابت نہیں ہو سکتی، البتہ اس شہادت کی خبر متعدد ذرائع سے ملے اور گمان غالب ہو جائے تو امام شہر یا قاضی یا کوئی کمیٹی اس کا اعلان کر سکتی ہے، اس کی حیثیت منادی کی ہوگی۔

خبر منادی السلطان مقبول	بادشاہ یا ذمہ دار کی منادی معتبر ہوگی چاہے
عدلاً کان او فاسقاً۔	وہ خود بے عمل کیوں نہ ہو۔

---

[1] فتاوی مولانا عبدالحی ج ا۔ یہی فیصلہ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء کا ہے۔

اختلاف مطلع کی بحث

یہاں ایک اور مسئلہ پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ وہ اختلاف مطلع کا مسئلہ ہے، یعنی اختلاف مطلع پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اگر پایا جاتا ہے تو وہ نماز روزہ میں معتبر ہے یا نہیں؟

جہاں تک اختلاف مطلع کے پائے جانے کی بات ہے، اب یہ نظری چیز نہیں رہ گئی ہے بلکہ ایک مشاہداتی چیز بن گئی ہے، کہ اس دنیا کے مختلف ملکوں میں ایک دو گھنٹے کا نہیں بلکہ پورے دن رات اور اس سے زیادہ کا بھی فرق ہوتا ہے، اس لیے اب یہ مسئلہ تو قابل بحث رہا نہیں، دوسرا مسئلہ کہ اختلاف مطلع نماز کے پڑھنے اور روزہ کے رکھنے اور توڑنے کے لیے معتبر ہوگا یا نہیں؟ عام طور پر علمائے احناف اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ اختلاف مطلع کا اعتبار نہیں کرتے، اور امام شافعیؒ مطلع کا اعتبار کرتے ہیں[1]، مگر بعد کے حنفی فقہاء کی تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی تجربہ کی بنیاد پر اختلاف مطلع کو تسلیم کرتے ہیں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے انکے تمام اقوال نقل کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ اختلاف مطلع کا اعتبار کیا جانا ضروری ہے، ان کی عبارت ملاحظہ ہو

"اصح المذاہب عقلاً و نقلاً ہمین است کہ ہر دو بلدہ فیما بین آنہا مسافتے باشد کہ دراں اختلاف مطالع می شود و تقدیرش مسافت یک ماہ است، دریں صورت حکم رویت یک بلدہ بہ بلدۂ دیگر نخواہد شد و در بلاد متقاربہ کہ مسافت کم از یک ماہ داشتہ باشد حکم رویت یک بلدہ بہ بلدۂ دیگر لازم خواہد شد[2]"	عقل و نقل کے لحاظ سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ ایسے دو شہر جن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ان کے مطلع بدل جائیں جس کا اندازہ ایک ماہ کی مسافت سے کیا جاتا ہے، اس میں ایک شہر کی خبر دوسرے شہر میں معتبر نہیں ہوگی، اور قریبی شہر جس کی مسافت ایک ماہ سے کم ہو تو ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ کے لیے لازمی ہوگی۔

اس لحاظ سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا مطلع، حجاز، مصر، افریقہ اور یورپ اور امریکہ سے مختلف ہے، اسی طرح آسٹریلیا، ملیشیا اور جاپان وغیرہ سے مختلف ہے۔ البتہ ایک ماہ

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۵۰ [2] مجموعۂ فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی ج ۱

کی مسافت بھی تخمینی چیز ہے[1]، اس لیے اس میں جدید رصدگاہوں اور فلکیات کے ماہرین کی رائے اور مشاہدہ زیادہ مناسب ہے، اس لیے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال کی مسافت کے لحاظ سے اس کی تعیین ہونی چاہیے، اس لیے کہ ان سب کا مطلع قریب قریب ایک ہے۔

نئے آلات کے ذریعہ جب مطلع صاف ہو تو چاند دیکھنے میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر مطلع غبار آلود یا بدلی ہو یا ایسا شہر ہو جہاں دس منزلہ اور بیس منزلہ مکان ہی مکان ہوں تو وہاں اگر دوربین سے یا ہوائی جہاز سے چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مضایقہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس کا انتظام اسلامی حکومت کرے، یا کچھ باقاعدہ قابل اعتماد افراد کریں، اوپر ذکر آچکا ہے کہ چاند کی گواہی کے شرائط ہلکے ہیں، یعنی جب مستور الحال آدمی کی شہادت سے بھی گمان غالب ہوجاتا ہے تو ان نئے آلات کے استعمال کے ذریعہ آئی ہوئی خبر یا شہادت سے زیادہ وجہ کا گمان ہوجاتا ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جس ڈگری پر عام طور پر وہاں چاند کی رویت ہوتی ہو اس سے زیادہ اونچائی سے نہ دیکھا گیا ہو، یعنی جیسے ہوائی جہاز کو بہت اونچا نہ اڑایا گیا ہو، اس لیے کہ چاند کبھی غروب نہیں ہوتا، وہ کہیں نہ کہیں تو دکھائی دیتا ہی ہے، اس لیے اگر بہت اونچائی سے دیکھا جائے گا تو کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دے گا، اس لیے اس کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے کسی اونچی جگہ سے چاند دیکھنے کی گنجائش فقہاء نے صُومُوا لِرُؤْيَتِہٖ کے تحت دی ہے، ابن عابدین لکھتے ہیں:

فقد یری الهلال من اعلی الاماکن	ایسی جگہوں پر کبھی چاند اونچی جگہوں سے دیکھنا
مالا یری من الاسفل فلا یکون تفرده	پڑتا ہے جہاں نیچے سے نہ دیکھا جاسکتا ہو، اس کا
خلاف الظاهر (ردالمحتار ج ۲ ص ۹۳)	تفرد ظاہر روایت کے خلاف نہیں ہوگا۔

چاند کی رویت میں یکسانیت اوپر چاند کی رویت کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے کہ چاند کی رویت چونکہ ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی اس لیے علمائے محققین نے اختلاف مطلع کو تسلیم کیا ہے، مگر اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جہاں کا مطلع ایک ہے،

---

[1] ایک ماہ کی مسافت کی تعیین ہمارے قدیم فقہاء نے گھوڑے اور اونٹ کی رفتار سے مقرر کی تھی۔

مثلاً ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال وغیرہ، وہاں رمضان وعید میں اختلاف کیوں ہوتا ہے، اور علماء ریڈیو یا ٹیلی ویژن یا ٹیلی فون کی خبر کے مطابق اسے کیوں تسلیم نہیں کر لیتے، تاکہ ہر جگہ رمضان اور عید و بقر عید کے منانے میں یکسانیت پیدا ہو، بلکہ بعض مرتبہ تو ایک شہر میں بھی دو عیدیں ہو جاتی ہیں، جب بھی ایسی صورت پیش آجاتی ہے تو عام طور پر علماء کو مطعون کیا جاتا ہے، اور قدامت پرستی اور تنگ نظری کا الزام عائد کیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں چند باتیں ذہن میں رکھی جائیں تو شاید یہ بات بظاہر جتنی وزنی معلوم ہوتی ہے اس کا وزن باقی نہ رہے، اور لوگ علماء پر بلاوجہ الزام تراشی نہ کریں۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چاند کے افق میں موجود ہونے اور پھر قابل اعتماد شہادت کے ذریعہ اس کے ثبوت کے فراہم ہونے میں فرق ہے، چاند کسی وقت غروب نہیں ہوتا، بلکہ ہر مقام کے مطلع کے اعتبار سے طلوع یا غروب ہوتا ہے، چاند کے دیکھے جانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ مطلع صاف ہے، اور بہت سے لوگوں نے چاند دیکھا، اور ایک جگہ رمضان کا یا عید کا اعلان ہو گیا اور یہ خبر ریڈیو کے ذریعہ دوسرے شہر یا صوبہ میں پہونچی کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا ہے، تو عام لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ بس خبر آتے ہی اس پر عمل کر لیا جائے، حالانکہ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ریڈیو پر اعلان ہوتا ہے کہ جے پرکاش نرائن کا انتقال ہو گیا، اس خبر کے مطابق پارلیمنٹ میں ان کی تعزیت کی تجویز پاس ہوتی ہے، اور پھر چند گھنٹے کے بعد اس کی تردید ہو جاتی ہے، اس لیے محض ریڈیو سے خبر کا آجانا کافی نہیں ہے، اگر ریڈیو سے یہ اعلان ہو کہ ہندوستان کے وزیر اعظم کا انتقال ہو گیا تو ہر شخص مان لے گا، مگر کسی عدالت عالیہ کا جج نہیں، بلکہ ضلع کا ایک معمولی منصف بھی کسی مقدمہ میں ریڈیو، یا ٹیلی ویژن یا ٹیلی فون کے ذریعہ کوئی شہادت قبول نہیں کر سکتا، آپ اس عدالت کے طرز عمل پر تو کوئی اعتراض نہیں کرتے، لیکن علماء جب یہی بات کہتے ہیں کہ چاند کی رویت کی حیثیت شہادت کی ہے، عام خبر کی نہیں ہے، تو آپ علماء پر تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں، (۲) پھر دوسری بات یہ کہ رمضان یا عید بقر عید کی حیثیت دوسری قوموں کے عام تہواروں کی سی نہیں ہے، بلکہ ان کی حیثیت عبادت کی ہے یعنی چاند کے دیکھنے کے بعد ایک عبادت شروع ہوتی ہے اور دوسری ختم ہوتی ہے، اور چاند کے اوپر ہمارے بہ جانے کتنے معاملاتی اور معاشرتی احکام کا دار و مدار ہے، اس لیے شریعت کا سادہ حکم یہ ہے کہ:

صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ ۔ (بخاری و مسلم) چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ توڑ دو۔

اس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ مقصود چاند کا موجود ہونا نہیں بلکہ دیکھا جانا ہے، اور دیکھے جانے میں یہ بھی خیال رہے کہ عام آنکھوں سے دیکھا جانا مقصود ہے۔ ہوائی جہاز، دوربین یا موسمیات کے ماہرین کے حساب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے جہاں ذرائع سے یکسانیت یا وحدت ملت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ شریعت کے منشا کے خلاف ہے، لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ جہاں بہت اونچے اونچے مکانات ہوں، یا مطلع غبار آلود ہو۔ وہاں اس کی کوشش اسلامی حکومت کی طرف سے صحیح ہو سکتی ہے۔ اوپر اس سلسلہ میں علامہ شامی کی رائے نقل کی جا چکی ہے۔

یہی حکم عام عبادات کا ہے، نماز ہی کو لیجیے ہمارے ملک میں مغرب اور فجر کی نماز کہیں ایک گھنٹہ پہلے ہوتی ہے اور کہیں ایک گھنٹہ بعد، تو اس سے وحدت ملت یا یکسانیت میں کیا فرق آتا ہے، اسلیے بلا وجہ یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ہمیں اپنی عبادات میں ان شرائط کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جن کا لحاظ ضروری ہے، صحابہؓ کے دور سے اب تک چاند کا یہ اختلاف چلا آرہا ہے، مگر کبھی کسی زمانہ میں وحدت ملت کے لیے عیدین وغیرہ میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اور نہ اس میں کوئی اعتراض پیدا ہوا، اس سلسلہ میں حضرت کریبؓ کا واقعہ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہماری رہنمائی کرتی ہے، جو حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، لیکن محض مسلکی یا ذاتی اختلاف کی بنا پر کسی ایک طبقہ یا شخص کی قبول شہادت کی بات نہ ماننا اور شخصی یا جماعتی عصبیت کی بنا پر رمضان و عید کے سلسلہ میں عوام میں انتشار پیدا کرکے دو عیدیں کرنا، یا روزہ ایک دن پہلے یا بعد رکھوانا یا توڑوانا کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا، اس معاملہ میں خدا کا خوف کرنا چاہیے اگر روزہ حرام تھا اور روزہ رکھوایا، یا روزہ رکھنا چاہیے تھا اور توڑوایا تو دونوں صورتوں میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوگا

چاند دیکھنے کی دعا[1]

جب نیا چاند نظر آئے تو یہ دعا پڑھنی چاہیے: اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْيُمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِيْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ هِلَالُ رُشْدٍ وَّخَيْرٍ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذَا الشَّهْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهٖ. (ترمذی، مسند احمد، طبرانی، ابن حبان) ایک شخص نے رمضان یا عید کا چاند دیکھا مگر کسی وجہ سے اس کی گواہی قبول نہ کی گئی تو اس کو دوسرے دن روزہ رکھنا واجب ہے، اس کو عید نہ کرنی چاہیے[2]۔

---

[1] مختلف روایتوں میں جو دعائیں وارد ہوئی ہیں ان سب کو ملا کر یہ دعا لکھی گئی ہے۔ [2] رد المحتار۔

امامِ اعظم کا طریقِ استدلال

قضا و افتاء میں

(محمد عیسیٰ عفی عنہ صدر شعبۂ افتاء نصرت العلوم گوجرانوالہ)

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہؒ کوفی م ۱۵۰ھ صاحب مناقب کثیرہ ہیں۔ لیکن یہاں آپ کی چند خصوصیات کا ذکر مقصود ہے۔

۱۔ آپ کے عقلی طرز استدلالات اور مناظرہ جات کا نمونہ جس کی دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے۔

۲۔ سیاسی آزادی اور شخصی خودی علم دین کے تحفظ اور اظہار رائے کے حقوق کی بحالی کے سلسلہ میں امام صاحب کی مساعی جمیلہ کا ذکر جن کا آغاز آپ کے دور میں آپ کے وجود ہی سے شروع ہوتا ہے۔

۳۔ فقہ اور اجتہاد میں امام صاحب کا مسلک اور اس کے قواعد و اصول جو قیامت تک پوری امت کے لئے، مسائل و احکام کی اساس ہیں جن سے آجتک کسی مجتہد اور امام نے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ فروع اور احکام میں اختلاف کی حیثیت اس سے مختلف ہے۔ یہ ہیں چند وہ اوصاف جنہیں ہم بحث کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) عقلی طرز استدلال اور مناظرہ:

امام صاحب کا شہرہ صرف فقہ و اجتہاد کے امام ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے، کم لوگ جانتے ہیں کہ آپ بحث و مناظرہ اور عقلی طرز استدلال کے امام بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عادت مندیہ ہے کہ ہر دور میں تقاضۂ وقت کے مطابق ایسے افراد پیدا کرتے رہتے ہیں، جن کی اسوقت ضرورت ہوتی ہے چنانچہ امام صاحب کا وجود با جود بھی اسی قبیل سے ہے۔ آپ کے دور میں اسلام کے اندر مختلف قسم کے فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ معتزلہ قدریہ، جبریہ، جہمیہ، کرامیہ، خوارج،

مرجیہ، شیعہ اور دہریہ، معروف ادا کے مطابق اپنے اپنے عقائد کی اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسلامی عقائد اور وحدت امت کے لئے یہ لوگ دیمک ثابت ہوئے۔ قرآن مجید کی واضح آیات، صریح نصوص اور سنت واضحہ کے ارشادات عالیہ سے یکسر ہٹ کر اپنی راہ ایجاد کی اور فرقہ بندی کرنے لگے۔ مسائل ثابتہ حقہ کو اپنی نارسا عقل کے ترازو میں تولنے کی ناکام کوشش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حالانکہ خدا اور رسول کے ارشادات ہی اصل معیار ہیں جن پر عقل کے ترازو میں صحت اور سقم کو پرکھا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے قائم کردہ فرامین و دلائل سے کب خاموش ہوتے تھے اپنے طور و طریقے کے مطابق نقل کے بجائے محض اپنی فرسودہ عقل سے جواب کا مطالبہ کرتے تھے۔ ضرورت تھی کہ ایسا امام برحق وجود میں آئے جو ان کو ان کی زبان میں جواب دے۔ عقل صحیح کے لئے اصول و ضوابط وضع کرے جو اسلام کی حقانیت ثابت کرتے ہوں اور اہل باطل کی دیوار کو مسمار کر دیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں سیدنا امام اعظمؒ سے ایسا کام لیا کہ آپ کے چشمۂ فیض سے نہ صرف اہل باطل کا ناطقہ بند ہو گیا بلکہ مستقبل میں اہل حق کو انمٹ کامیابی اور فتحمندی سے ہمکنار کرتا رہا۔

امام اعظمؒ کا مناظرہ اور مباحثہ طویل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے جواب میں کوئی لمبی چوڑی تقریر جھاڑنے کے عادی ہیں بلکہ وہ اپنے مقابل کو ایک مسئلہ کی مختلف شقوں میں اختیار دے دیتے ہیں۔ کہ مثلاً ان دو شقوں میں سے کس شق کو لیتے ہو۔ الف کو لیتے ہو تو اس سے تو ہمارا مدعیٰ ثابت ہوتا ہے اور اگر ب کو لیتے ہو تو تمہارے مدعیٰ کے خلاف ہے۔ امام صاحبؒ جواب طلب کرتے ہیں مقابل فریق ان بیان کردہ شقوق کے حصار میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ امام ابو مطیع بلخیؒ کی آپ سے روایت کردہ فقہ اکبر اس قسم کے ابحاث سے پر ہے۔ بطور نمونہ ایک دو باتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

قال (ابو مطیع للامامؒ) فان قال (المعترض) اقول ان اللہ تعالیٰ لم یجبر عبادہ علی ذنب ثم یعذبھم علیہ۔ فما تقول لہ۔ قال قل لہ ھل یطیق العبد لنفسہ ضرا او نفعا فان قال لا لأنھم مجبورون فی الضر والنفع	ابو مطیع نے امام سے دریافت کیا کہ اگر معترض یوں اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو گناہ پر مجبور کیوں کرتا ہے جبکہ ان گناہوں پر عذاب بھی دیتا ہے؟ آپ کا اس کے جواب میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا۔ اس سے دریافت کرو کہ بندہ اپنی ذات کیلئے نفع یا نقصان کی

ما خلا الطاعة والمعصية فقل له هل خلق الله تعالیٰ الشرفان قال نعم خرج من قوله وان قال لاکفر لقوله تعالیٰ قل اعوذ برب الفلق من شر ما خلق (ص ۷ باب المشیۃ)

طاقت رکھتا ہے یا نہ؟ اگر نفی میں جواب دے کیونکہ وہ نفع اور نقصان میں طاعت اور معصیت کے علاوہ بھی مجبور رہیں۔ تو اس سے پوچھو کیا خدا نے شر کو پیدا کیا ہے؟ اثبات میں جواب دے تو وہ اپنے قول سے نکل گیا اور اگر جواب نفی میں ہو تو کافر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قل اعوذ برب الفلق من شر ما خلق جس سے شر کی خالقیت ثابت ہوتی ہے۔

(۲) فان قال ان الرجل ان شاء فعل وان شاء لم یفعل وان شاء اکل وان شاء لم یاکل وان شاء شرب وان شاء لم یشرب۔ فقل له هل حکم الله تعالیٰ علی بنی اسرائیل ان یعبروا البحر وقدر علی فرعون الغرق فقلت فهل کان یقدر فرعون ان یسیر فی طلب موسیٰ وان لا یغرق هو واصحابه فان قال نعم فقد کفر بالله وان قال لا نقض قوله السابق۔ (ایضاً ص ۷)

اگر معترض یوں کہے کہ آدمی چاہے کوئی کام کرے یا نہ کرے چاہے کھائے یا نہ کھائے پیئے یا نہ پیئے تو اسے اختیار ہے تو اس سے یوں دریافت کرو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم کیا ہے کہ وہ دریا عبور کریں اور فرعون پر غرق کو مقدر کیا ہے تو ان سے پھر پوچھو کہ کیا فرعون کو اس بات کی قدرت تھی کہ موسیٰ کی گرفتاری پر جاتا اور نہ وہ ڈوبتا نہ اس کے ساتھی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو وہ کافر ہو گیا اور اگر جواب نفی میں ہے تو اس نے اپنے سابق کلام کا خلاف کیا۔

دوسرا طریق بحث

آپ کا دوسرا طریق بحث یہ ہے کہ حاضرین کے سامنے صرف ایک ایسی صورت پیش کرتے ہیں جو آپ کے دعویٰ کے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ صورت بھی ایسی جو مافوق العادۃ ہوتی ہے اور مقابل

غرض آپ کی زبان سے ایسی بات سنکر حیرت میں چلا جاتا ہے۔ پھر وہ اگر مصورہ شکل کا انکار کرتا ہے تو اسی انکار میں امام صاحب کی کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے اس کے اس انکار اور استعجاب سے امام اپنی دلیل قائم کرتے ہیں جسے خصم بلا چون وچرا تسلیم کر لیتا ہے۔

امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں دلائل توحید کا ذکر کرتے ہوئے امام صاحب کا واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

کان ابوحنیفة رحمة الله سیفا علی الدھریة، وکانو ینتھزون الفرصة لیقتلوہ فبینا ھو یوما فی مسجدہ قاعدا اذ ھجم علیه جماعة بسیوف مسلولة وھموا بقتله فقال لھم: اجیبوانی عن مسئلة ثم افعلوا ما شئتم فقالوا له ھات، فقال ماتقولون فی رجل یقول لکم انی رائیت سفینة مشحونة بالاحمال مملوءة من الاثقال قد احتوشھا فی لجة البحر امواج متلاطمة ورياح مختلفة وھی من بینھا تجری مستویة لیس لھا ملاح یجریھا ولا متعھد یدفعھا ھل یجوز ذلک فی العقل؟ قالوا لا۔ ھذا شیئ لا یقبله العقل فقال ابوحنیفة یا سبحان الله اذا لم یجز فی العقل سفینة تجری

ابوحنیفہ فرقہ دہریہ کے خلاف برہنہ شمشیر تھے اور وہ موقعہ کی تلاش میں ہوتے تاکہ آپ کو قتل کر دیں۔ ایک دن آپ مسجد میں بیٹھے تھے کہ آپ پر ایک جماعت نے تلواریں سونتتے ہوئے حملہ بول دیا اور آپ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا پہلے مجھے ایک مسئلہ کا جواب دو پھر جو چاہو کرو انھوں نے کہا بتاؤ۔ آپ نے کہا کہ ایسے شخص کے بارے تمھاری کیا رائے ہے جو تم سے کہے میں نے ایک کشتی بوجھ سے لدی ہوئی اور بھاری بھرکم سامان سے پُر دیکھی ہے جس کو سمندر کی لہریں متلاطم موجیں اور مختلف اد ھر ادھر کی ہوائیں دھکیل رہی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ وہ برابر صحیح طور پر چل رہی ہے۔ نہ تو اس کا کوئی ملاح ہے جو اسے چلا رہا ہو اور نہ اس پر کوئی نگراں کہ جو اسے کنٹرول کر رہا ہو۔ کیا عقل میں یہ بات درست ہو سکتی ہے؟ وہ بولے نہیں۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی

في البحر مستوية من غير متعهد ولا مجري فكيف يجوز قيام هذه الدنيا على اختلاف احوالها وتغير اعمالها وسعة اطرافها وتباين اكنافها من غير صانع وحافظ فبكوا جميعا وقالوا صدقت واغمدوا اسيوفهم وتابوا (تفسير كبير ص ۹۹ جلد ۲)

تو ابوحنیفہ نے کہا یا سبحان اللہ۔ جبکہ عقل میں یہ جائز نہیں کہ ایک کشتی سمندر میں نگراں اور ملاح کے بغیر متوازی طور پر چل سکے تو اس دنیا کائنات کا قیام کیسے درست ہے۔ باوجودیکہ اسکے احوال مختلف ہیں اور اس کے آثار ایکدوسرے متغیر جس کے اطراف وسیع اور اسکے کنارے باہم ایک دوسرے کی ضد اور اس کا کوئی صانع ہو اور نہ محافظ اس بات کو سنتے ہی سب رو پڑے اور کہا آپ نے سچ کہا۔ تلواریں نیام میں ڈالدیں اور اپنے ارادے سے باز آگئے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ تابعین میں سے پہلے شخص تھے جنھوں نے عوامی سطح پر اصلاح امت کے لئے اس طریقۂ بحث کی طرف توجہ مبذول فرمائی اور ایسا کمال حاصل کیا کہ زمانہ خیرون القرون میں آپ اس فن کے جامع امام سمجھے گئے۔

امام کو اہل بدعت سے اکثر مناظرہ کا اتفاق ہوتا تھا۔ بصرہ میں اچانک بدعت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ تقریباً بیس فرقے پیدا ہوئے تھے۔ امام نے اپنی ہمت اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف فرمائی اور بنفس نفیس کئی بار بصرہ تشریف لاکر ایک ایک سال بلکہ اس سے بھی زیادہ قیام فرماکر فرقہ مبتدعہ سے مناظرے کئے ان کو پسپا کیا جس شخص نے سب سے پہلے علم کلام کے اصولی مسائل کو دلائل شرعیہ سے ثابت کیا وہ امام ہی تھے۔

امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کو ایک ستون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ امام ابوحنیفہؒ اگر اس اسطوانہ کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو ثابت کر دکھائیں گے۔

یہ قول امام صاحب کی قوت استدلال کا کیسا عجیب و غریب مظہر ہے۔

عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں۔

ما رأيت احدا اعقل من ابي حنيفة

میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زیادہ عقلمند بالغ نظر

دوسرا کوئی نہیں دیکھا۔

مشہور ہے کہ امام صاحب اپنی طفولیت میں مکتب کو جا رہے تھے۔ سر راہ ایک شخص مجمع لگا کر کرسی پر بیٹھا اسلام پر اعتراض کر رہا تھا کسے یارا ہے جو میرے سوالات کا معقول جواب دے۔ امام نے سنتے ہی فرمایا کہ یہ عجیب ہے کہ سائل کرسی پر بیٹھے جواب کا طالب ہو۔ وہ فوراً کرسی سے اتر آیا اور امام صاحب اسی کرسی پر بیٹھ گئے۔

سائل: اس وقت خدا نے کیا کیا؟

امام صاحب: تجھے کرسی سے اتار کر مجھے بٹھا دیا۔

سائل: خدا سے پہلے کیا تھا؟

امام صاحب: ایک سے پہلے شمار کرکے دیکھ لو۔

سائل: خدا کا رُخ کدھر ہے؟

امام صاحب: آفتاب اور چراغ کا رُخ کدھر ہوتا ہے۔

سائل: زمین کا نصف کہاں ہے؟

امام صاحب: یوں سمجھ لو جہاں میری کرسی ہی نصف ہے، پیمائش کرکے دیکھ لو۔

سائل: اسلام میں عورت کے لئے دو مردوں کی اجازت کیوں نہیں؟

امام صاحب: نسل کا امتیاز ناممکن ہو جاتا۔ جیسے مختلف جانوروں کے باہم دودھ ملا کر ان کا جدا کرنا مشکل ہے۔

الغرض امام کا وجود اللہ کی حجت اور وجود خداوندی پر زبردست دلیل اور برہان ہے۔

مناظرہ میں امام کی بردباری۔ درگذر اور مشروط معافی

یزید بن الکمیت یقول۔ سمعت ابا حنیفۃ یقول۔ وقد ناظرہ رجل فی مسئلۃ وقال لہ یا مبتدع یا زندیق فقال: غفر اللہ لک،

یزید بن کمیت کہتے ہیں۔ میں نے ابو حنیفہؒ سے اس حال میں سُنا جب کہ ان سے ایک شخص نے مناظرہ کرتے ہوئے کہا او مبتدع زندیق، آپ نے دُعا کی اور کہا مجھے

الله يعلم مني خلاف ما قلت وهو
يعلم اني ما عدلت به احداً
منذ عرفته، ولا رجوت الا عفوه
ولا خفت الا عقابه، ثم بكى عند
ذكر العقاب فسقط صريعاً ثم افاق
فقال الرجل اجعلني في حل فقال
كل من قال ما ليس في من اهل الجهل
فهو في حل، وكل من قال شيئاً مما
ليس في من اهل العلم فهو في حرج
فان غيبة العلماء تبقى شيئاً
بعدهم (اخبار ابي حنيفة و
اصحابه ص ٣٧)

اللہ تعالیٰ تیرے قول کے برعکس جانتے ہیں
اسے پتہ ہے کہ جب سے میں نے اسے
پہچانا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کو برابر اور
شریک نہیں کیا۔ اس سے معافی کے
بغیر کوئی امید اور اس کے عذاب کے بغیر
اور کوئی خوف نہیں رکھتا۔ عذاب کا
ذکر کرتے ہی رو پڑے اور بیہوش ہو کر گر
پڑے۔ افاقے میں آئے تو اس شخص نے
کہا مجھے معافی دے دیجئے، آپ نے کہا جس
نادان اور کم علم نے میرے بارے میں ایسی
بات کی جو مجھ میں نہیں ہے تو اسے معافی
ہے اور جس اہل علم نے ناحق میرے
بارے میں کوئی بات کی تو وہ حرج یعنی خدا
کی طرف سے باز پرس کے مقام میں ہے۔
کیونکہ علماء کی غیبت کرنے کے آثار ان کی
موت کے بعد بھی معیوب علیہ پر بطور
عیب باقی رہتے ہیں۔

بحث دوم سیاسی آزادی اور شخصی خودی

امام صاحب بڑے عالی ہمت اور بلند نظر انسان تھے، جانتے تھے کہ سیاسی اور شخصی آزادی ہی سے آدمی اظہار رائے پر قادر ہوتا ہے۔ اور یہ منصب جلیل جس پر میں فائز ہوں جو آفتاب کی مانند پورے عالم کو منور کر رہا ہے جس کے پرتو سے گوشہ گوشہ روشن ہے بطور وراثت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم مجھے عطا کیا گیا ہے۔ پھر ایک عالم کے لئے پیشوا اور مقتدا ہونے

کی حیثیت سے اگر یہ منصب پابند سلاسل ہو جائے تو آئندہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے لئے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لئے آپ نے عہدہ قضا کو ٹھکرا کر دین متین کی لاج رکھ لی۔ اور آنیوالے علماء امت کیلئے اسوۂ حسنہ قائم کیا۔ فتویٰ "جو حکم شرع کے اظہار اور اعلام کا نام ہے"، خدا نے کسی بادشاہ اور حاکم کی پیشگی اجازت کا مرہون منت نہیں بنایا امام صاحب نے "خدا کی بات خدا کے لئے" کے زریں اصول کی بنیاد ڈالی تا آنکہ جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جبر و تشدد کو لبیک کہا لیکن اپنے منصب جلیلہ پر آنچ تک نہ آنے دی، یہی وجہ ہے کہ امت کے آزاد اور بلند و بالا نظر طبقے نے امام کے ان آزادانہ نظری اور فکری احساسات کو خوشی سے قبول کیا اور اپنی زندگی کا راہنما اصول بنایا اور اسی پر جان کی بازی لگا دینے کو فخر محسوس کیا۔ فرضی اللہ عنہ و لمن اتبعہ من السابقین فی الخیرات باذن اللہ۔

اراد ابن هبيرة اباحنيفة على قضاء الكوفة فابي وامتنع فحلف ابن هبيرة ان هو لم يفعل ليضربنه بالسياط على راسه ، فقيل لابي حنيفة ، فقال ضربة لي في الدنيا اسهل علي من مقامع الحدائد في الاخرة ، والله لا افعل ولو قتلني وحلف له ان لم يل ليضربن على راسه حتى يموت فقال له ابوحنيفة : هي موتة واحدة فامر به فضرب عشرين سوطا على راسه فقال ابوحنيفة اذكر مقاملك بين يدي الله فانه اذل

ابن ہبیرہ کوفے کے گورنر، نے کوفے کی قضا کے بارے میں ابوحنیفہ رح سے کہا آپ نے انکار کیا۔ اس پر ابن ہبیرہ نے قسم اٹھا لی کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو وہ سر پر چابک لگائے گا، ابوحنیفہ رح سے کہا گیا تو آپ نے کہا مجھ پر دنیا کی سزا آخرت کی نسبت آسان ہے۔ خدا کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا۔ اگرچہ مجھے قتل ہی کر دے ابن ہبیرہ نے حلف اٹھائی کہ اگر وہ اسے قبول نہیں کریں گے تو وہ اس کے سر پر ضرب لگائے گا تا وقتیکہ ان کی موت واقع ہو جائے۔ تو ابوحنیفہ رح نے کہا کہ دنیا کی صرف ایک موت ہے۔ تو اس نے

من مقامی بین یدیك ولا تهددنی فانی اقول، لا اله الا الله، والله سائلك عنی حیث لا یقبل منك جوابا الا بالحق (اخبار ابی حنیفة واصحابه ص ۵۸)

اذا سئلت عن معضلة فاقلبها

حکم دیا اور آپ کے سر پر بیس کوڑے مارے گئے۔ تو ابو حنیفہ نے کہا کہ خدا کے حضور اپنی حاضری کا خیال کیجئے کہ وہ تیرے سامنے میری حاضری کی نسبت کہیں زیادہ رسواکن ہوگی اور مجھے زجر مت کرو۔ میں تو لا الہ الا اللہ۔ کہہ رہا ہوں اور اللہ تجھ سے میرے بارے میں بازپرس فرمائے گا جبکہ وہاں حق کے سوا اور کوئی جواب قبول نہیں کریگا آپ کی دانشمندی اور فراست ایمانی میں اس ضابطہ پر عمل بھی شامل ہے جو آپ کو اپنے استاد حضرت امام حماد سے بطور وصیت اور تلقین عطا ہوا تھا کہ ہر سوال کا جواب اسی سوال کے اندر ہی تلاش کرنے کی کوشش کیا کرو سوال کے انداز اور سوال کے مختلف پہلوؤں پر نظر وسیع ڈالکر غور سے دیکھو گے تو سوال کے اندر اس کا جواب بھی بالآخر پالو گے۔ چنانچہ امام نے اس میں اتنا رسوخ پیدا کرلیا کہ بڑے مشکل مسائل میں ایسا دندان شکن جواب دیتے کہ اپنے جال میں پھنس کر دم بخود رہ جاتا۔ آپکے استاد کی وصیت کے الفاظ یہ ہیں:

جب تجھ سے کسی مشکل حل طلب بات کے

سوء الا على ساءلك عنها حتى
تخلص من مسالته لك؛ فدس
الى رجل فعقد لى على الباب وانا
عند ابن هبيرة قد امر بي الى
السجن فسعى الرجل الى
السجن فقال: يا ابا حنيفة
يحل للرجل اذا امره السلطان
الاعظم ان يقتل رجلا ان
يقتله؟ قال قلت له وكان الرجل
ممن وجب عليه القتل؟ قال
نعم قلت فاقتله قال: فان لم
يكن ممن وجب عليه القتل
قال قلت: ان السلطان الاعظم
لا يأمر بقتل من لا يستحق
القتل (اخبار ابي حنيفة واصحابه
ص ١٩)

(٢) تقلد الكوفة رجل من قبل
ابي جعفر المنصور فاراد اذى إبي
حنيفة فقال: والله لاسألنه
عن مسالة يكون سببا لقتله. ثم
احضره على رؤس الناس فقال
إن امير المومنين يا مرني بضرب

بارے میں پوچھا جائے تو اس کو سوال کر کے
لوٹا دو، تاکہ اس مسئلہ کا مخلص تمھارے
سامنے آجائے اتنے میں ایک دن میرے
پاس خفیہ ایک شخص کو بھیجا گیا اور وہ دروازہ
پر میرے انتظار میں بیٹھ گیا۔ میں گورنر کوفہ
ابن ہبیرہ کے پاس تھا اور مجھے جیل کی
طرف لے جانے کا حکم ہو چکا تھا پس وہ
شخص جیل کی طرف دوڑے آیا اور پوچھا
اے ابو حنیفہ کسی کو حق پہنچتا ہے کہ جب
اسے سلطان اعظم کسی کے قتل کا حکم دے
کہ وہ اسے قتل کر دے تو میں نے کہا کہ
کیا وہ شخص ایسا ہے جس پر قتل واجب
ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا پھر اسے
قتل کر دو اس نے پھر کہا کہ اگر وہ شخص
واجب القتل نہ ہو تو امام کہتے ہیں میں نے
اس سے کہا، سلطان اعظم ایسے شخص کے
بارے میں قتل کا حکم نہیں دیتا جو قتل کا مستحق نہ ہو

ابو جعفر منصور کی طرف سے ایک
شخص کو کوفے کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے
ابو حنیفہ کی ایذا کا تہیہ کیا اور کہا، خدا کی قسم
میں اس سے ایک ایسا سوال کروں گا جو
اس کے قتل کا سبب ہو گا۔ پھر لوگوں کے
سامنے ابو حنیفہ کو حاضر کیا اور کہا

الاعناق وسفك الدماء واخذ الاموال وانتهاك المحارم افا طيعه فی ذلك ام اعصيه؛ فقال له ابوحنيفة، ما يامرك به امير المومنين طاعة لله او معصية؛ قال، لا، بل طاعة لله، فقال له ابوحنيفة؛ اطع امير المومنين اكرمه الله. فی كل ما كان طاعة لله ولا تعصه وخرج واصحابه على اماء فقال (لهم)؛ اراد الرجل ان يرهقنا فارهقناه، فاذا انتكم معضلة فاجعلوا جوابها منها (ص ٦٢)

امیر المومنین مجھے گردنوں کے مارنے اور ناحق خونریزیوں. لوگوں کے مال چھیننے اور محارم کی ہتک کرنے کا حکم دیتے ہیں. کیا اس بارے میں اس کی اطاعت کروں، یا حکم عدولی؛ اس سے ابوحنیفہ نے دریافت کیا تیرے خیال میں تجھے امیر المومنین جس چیز کا حکم دیتے ہیں طاعت ہے یا معصیت اس نے کہا معصیت نہیں بلکہ طاعت ہے تو ابوحنیفہ نے کہا امیر المومنین اکرمہ اللہ کے ہر اس حکم میں جو اطاعت خداوندی ہو اطاعت کرو اس کی حکم عدولی نہ کرو. امام ابوحنیفہ باہر آئے اور آپکے ساتھی دروازے پر کھڑے منتظر تھے. آپ نے ان سے کہا اس شخص نے تو ہمارے خون بہانے کا ارادہ کیا تھا لیکن ہم نے اس کا خون بہا دیا۔ پھر بطور ضابطہ فرمایا، جب تمہیں مشکل بات پیش آئے اس کا جواب اسی مشکل میں تلاش کر لیا کرو.

بحث سوم :- امام اعظمؒ کے فقہی اصول اور آپ کا مسلک؛

اس باب میں آپ تمام ائمہ کرام سے ممتاز اور مختص حیثیت کے مالک ہیں. آپ کی خداداد فہم نے ثریا آسمانی سے ان مبارک اور دقیق اصولوں کو دریافت کر لیا. کہ طبعی اور حقیقی درجات کی طرح دلائل شرعیہ بھی بالترتیب یکے بعد دیگرے مرتب اور باہم متفاضل اور سلسلہ وار مسلک ہیں. یعنی سب سے پہلے کتاب اللہ کا مقام ہے. مسائل و احکام حقائق و دقائق اسی سے حاصل

ہو سکتے ہیں۔ ازیں بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کتاب اللہ کی تشریح اور خود مستقل درجہ ومقام کی حامل ہے۔ کو لیا جائے گا۔ پھر ان مسائل میں جنہیں کتاب وسنت بظاہر ناطق نہ ہوں اجماع صحابہؓ کو لیا ہوگا۔ اجتہاد، قیاس ورائے کا درجہ آخر میں ہے۔ بایں معنی کہ مذکورہ بالا دلائل ثلاثہ سے حکم نہ ملے تو اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ قیاس اور رائے کی وجہ سے امام اعظم کو خصوصی طور پر مطعون کرنا نہایت بے انصافی تغافل اور حقیقت سے ناآشنائی ہے۔ ہر دور میں ہر امام نے قیاس سے کام لیا اور آئندہ بھی اس کی ضرورت ناگزیر ہے۔ دوسرے قیاس اور رائے کے معنی یہ ہیں کہ کتاب وسنت سے کسی حکم کا استنباط اور اخذ کرنا۔ بھلا ان اعلیٰ اصولوں کا انتخاب اور ترتیب پھر اس طرح کے قیاس اور رائے کی بیان کردہ تشریح کو کس طرح رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ سچی حنفیت جس کی ایک شرزمہ قلیلہ نے فی سبیل اللہ دشمنی مول لے رکھی ہے۔

(۱) يحيي بن ضريس يقول شهدت سفيان الثوري واتاه رجل فقال له ماتنقم على ابي حنيفة: قال له وماله قال سمعته يقول آخذ بكتاب الله فما لم اجد فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فما لم اجد في كتاب الله ولا في سنت رسول الله صلى الله عليه وسلم اخذت بقول اصحابه اخذ بقول من شئت منهم وادع من شئت منهم ولا اخرج من قولهم الى قول غيرهم۔

(فضائل الثلاثة لابن عبد البر ص ۱۴۲)

یحیی بن ضریس کہتے ہیں کہ میں سفیان ثوری کے پاس تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ تجھے امام ابوحنیفہ سے کیا چڑ ہے۔ تو سفیان نے کہا اس کی خوبی ہے۔ تو اس شخص نے کہا میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا کہ میں کتاب اللہ کو لیتا ہوں۔ پس جو بات مجھے کتاب میں نہ ملے تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لیتا ہوں۔ اور جب کتاب وسنت دونوں میں نہ ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی بات کو لیتا ہوں لیکن بعض کی باتوں کو لیتا ہوں اور بعض کی باتوں کو چھوڑ دیتا ہوں لیکن مجموعی طور پر میں ان کے اقوال سے خروج کر کے کسی غیر کی بات کو نہیں لیتا۔

(۲) ابو عصمة قال سمعت ابا حنيفة رح يقول ما جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قبلناه على الراس والعينين وما جاء عن اصحابه رحمهم الله اخترنا منه ولم نخرج عن قولهم وما جاءنا عن التابعين فهم رجال ونحن رجال (ايضا ص ۱۴۴)

ابو عصمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ رح کو کہتے ہوئے سنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوا اسے ہم سر آنکھوں پر قبول کرتے ہیں۔ اور جو صحابہ رض سے حاصل ہوا اس میں سے اپنی پسند کو کام میں لاتے ہیں اور ان کی بات سے باہر نہیں جاتے اور جو تابعین سے ہمیں پہنچتا ہے تو وہ بھی (مرد) صاحب اجتہاد ہیں اور ہم بھی (مرد) صاحب اجتہاد ہیں۔

(۳) ابا حمزة السكري يقول سمعت ابا حنيفه رح يقول اذا جاء الحديث الصحيح الاسناد عن النبي صلى الله عليه وسلم اخذنا به ولم نعده واذا جاء عن الصحابة تخيرنا وان جاء عن التابعين زاحمناهم ولم نخرج عن اقوالهم (ايضا ۱۴۴)

ابو حمزہ اسکری کہتے ہیں۔ میں نے ابو حنیفہ کو کہتے ہوئے سنا۔ جب حدیث صحیح اسناد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو اس کو ہم اپنا مذہب بنا لیتے ہیں، اور اس سے ہم تجاوز نہیں کرتے۔ اور جب صحابہ سے حاصل ہو تو اس میں ہم اپنی پسند کو کام میں لاتے ہیں۔ اور تابعین سے آئے تو ان سے ہم مقابل ہوتے ہیں۔ اور ان کے اقوال سے بھی خروج نہیں کرتے۔

(۴) وكان ابي مطيع البلخي يقول كنت يوما عند الامام ابي حنيفة رح في جامع الكوفة فدخل عليه سفيان الثوري ومقاتل بن حيان وحماد بن سلمة وجعفر الصادق وغيرهم من الفقهاء فكلموه وقالوا قد

ابو مطیع بلخی کہتے ہیں کہ میں ایک دن امام ابو حنیفہ رح کے پاس کوفہ کی جامع مسجد میں تھا تو سفیان ثوری مقاتل بن حیان حماد بن سلمہ۔ جعفر صادق وغیرہ فقہاء کرام تشریف لائے اور آپ سے باتیں کیں اور کہا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ آپ دین میں قیاس

بلغنا انك تكثر من القياس في
الدين وانا نخاف عليك منه
فان اول من قاس ابليس فناظر
هم الامام من بكرة نهار الجمعة
الى الزوال وعرض عليهم
مذهبه وقال انى اقدم العمل
بالكتاب ثم بالسنة ثم با
قضية الصحابة مقدما ما
اتفقوا عليه على ما اختلفوا
فيه وحينئذ اقيس فقاموا
كلهم فقبلوا ركبته ويديه
وقالوا له انت سيد العلماء
فاعف عنا في ما مضى عنا من
وقيعتنا فيك بغير علم
فقال غفر الله لنا ولكم اجمعين
(الكلام المبرور للعلامة اللكهنوى
ص ۶۱)

کو زیادہ کام میں لاتے ہیں اور ہمیں
آپ پر اس چیز سے خوف ہے جس نے
سب سے پہلے قیاس سے کام لیا وہ
ابلیس تھا امام نے ان سے علی الصباح
جمعہ سے زوال تک مناظرہ کیا اور ان پر
اپنا مذہب واضح کیا اور کہا میں کتاب اللہ
پر عمل کی تقدیم ضروری سمجھتا ہوں۔ پھر
سنت پر پھر صحابہ کرام کے فیصلوں کو جو
متفق علیہ ہیں مختلف فیہ پر مقدم سمجھتا
ہوں۔ اور اس وقت (اس قاعدے)
میں قیاس کرتا ہوں تو سارے فقہاء اٹھ کھڑے
ہوتے ہیں۔ اور آپ کے گھٹنے اور ہاتھوں
کو بوسہ دیا۔ اور کہا کہ آپ تو علماء کے
سردار ہیں۔ کل ماضی میں آپ کی شان کے
بارے لاعلمی میں ہم سے جو قصور سرزد ہوا
اس کی تلافی چاہتے ہیں۔ آپ نے کہا اللہ
تعالیٰ ہم سب کو معاف کردے۔

تکفیر کے باب میں امام اعظم کا مسلک

تکفیر کے باب میں امام اعظم کی احتیاط معروف و مشہور ہے، جو توضیح و تشریح طلب ہے
اس باب میں خود امام صاحب سے کافی ذخیرہ منقول و متوارث ہے۔ لیکن یہاں سردست
مسئلہ کی اصل نوعیت بیان کرنا مقصود ہے۔ اہل حق کا ہمیشہ سے یہی شعار رہا ہے کہ وہ تکفیر میں
عجلت پسندی۔ ناعاقبت اندیشی نہیں کرتے۔ فرقہ غالیہ، شیعہ، مبتدعہ اور جملہ فرق باطلہ اس کے

"برخلاف تکفیر و تضلیل اور امت میں تفریق کے خصوصی کردار سے ممتاز رہے ہیں۔ لیکن ائمہ دین اپنے اپنے متبعین کو یہی وصیت کرتے رہے کہ عنان تکفیر کو واگذار نہ چھوڑ دینا چاہئے اور انھوں نے اسی کو دین اسلام کی بہت بڑی فقہ قرار دیا ہے۔ ابو مطیع بلخی کہتے ہیں۔

سالت اباحنیفة النعمان بن ثابت رحمه الله عن الفقه الاکبر فقال لاتکفر احدًا بذنبه ولا تنفِ احدا من الایمان الخ

میں نے ابو حنیفہ نعمان بن ثابت سے فقہ اکبر کے بارے میں دریافت کیا فرمایا کسی کے گناہ پر اس کی تکفیر نہ کرو اور کسی کی ایمان سے نفی نہ کرو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اہل علم (اہلسنت) اور اہل بدعت کے مابین بطور امتیاز خصوصی اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

فمن عیوب اهل البدع تکفیر بعضهم بعضا ومن ممادح اهل العلم انهم یخطئون ولا تکفرون (منهاج السنة ج ۲ ص ۶۳)

فرق اہل بدعت کے عیوب میں یہ عیب بھی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔ اور اہل علم (اہلسنت) کی قابل قدر صفات میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ غلطی کی نشاندہی اور نسبت الی الخطا تو کرتے ہیں لیکن تکفیر نہیں کرتے۔

فقہ اکبر از امام اعظم ابو حنیفہ بروایت ابو مطیع بلخی

(۱) امام ابو مطیع بلخی سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفیؒ کے مایۂ ناز تلمیذ ہیں۔ انھوں نے امام اعظم سے اعتقادات اور مسائل کلامیہ میں مختلف سوالات کرکے آپکے جوابات قلمبند کئے ہیں۔ متقدمین علماء و فقہاء اور اہل تاریخ و سیر کی تحقیق و رائے میں امام اعظم ابو حنیفہ کی فقہ اکبر کا دراصل صحیح نسخہ یہی ہے۔ ملا علی قاری سے متقدم علماء نے اپنی کتب میں صرف اسی کا حوالہ دیا ہے۔

(۲) تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فقہ اکبر جس کی شرح ملا علی قاری نے کی ہے وہ

امام اعظم کی تصنیف نہیں ہے۔ کیونکہ اس تصنیف کا طور وطریق متاخرین کے متون کے موافق ہے امام صاحب کے زمانہ میں تصنیف کا یہ طریق نہیں تھا۔ یہ تو متاخرین کا انداز ہے۔ جیساکہ علامہ ابن حاجب اور علامہ تفتازانی کے متون کا ہوتا ہے۔ حضرت امام کے دور میں حدثنا و اخبرنا کے ذریعے کتاب کے مندرجات کو مروی عنہ تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہ اس انداز سے کوسوں دور ہے۔

نیز حضرت امام جو کسی کو کافر کہنے میں نہایت محتاط تھے اور اس بارے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ان کی شان سے بعید ہے کہ وہ بے دھڑک یہ تحریر فرمائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کفر پر مرے۔

۳۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلی نے اپنے رسالہ حمویہ میں امام اعظم ابو حنیفہؒ کی نسبت ابو مطیع بلخی سے اسی فقہ اکبر کے حوالہ سے لکھا ہے:

وفی کتاب "الفقه الاکبر" المشهور عند اصحاب ابی حنیفة الذی رووه بالاسناد عن ابی مطیع الحکم بن عبد الله البلخی قال سالت ابا حنیفة عن الفقه الاکبر فقال لا تکفرن احدا بذنب ولا تنف احدا به من الایمان وتامر بالمعروف وتنهی عن المنکر وتعلم ان ما اصابك لم یکن لیخطئك ولا تبرء من احد من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا یوالی احدا دون احد وان ترد امر عثمانؓ وعلیؓ الی الله عزوجل الخ

(مجموعة الفتاوی ج ۵ ص ۳۶)

فقہ اکبر جو اصحاب ابی حنیفہؒ کے ہاں مشہور ہے جسے ابو مطیع بلخی نے امام صاحب سے روایت کیا ہے، اس میں ہے: میں نے ابو حنیفہؒ سے پوچھا فقہ اکبر کیا ہے، فرمایا گناہ پر کسی کی تکفیر نہ کرو اور نہ ہی کسی سے ایمان کی نفی کرو اور یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور یہ عقیدہ رکھو کہ جو کچھ تجھے (نفع ضرر) پہنچا ہے ہٹ نہیں سکتا تھا اور جو رہ گیا ہے وہ پہنچ نہیں سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی سے بیزاری کا اظہار نہ کرو کسی سے لاتعلقی کا معاملہ نہ ہونا چاہئے اور یہ کہ حضرت عثمان اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ فقط۔

مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ

اور ان کا ترجمہ شمائل ترمذی

قسط (۳)

مولانا کے تبلیغی کاموں کی کامیابی کے اسباب

مولانا جون پوریؒ کے تبلیغی کاموں کی اوپر جو تفصیل بیان کی گئی ہے، ان پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اصلاح و تبلیغ کا اتنا عظیم کام جو پوری ایک جماعت بلکہ ایک حکومت کے کرنے کا تھا وہ محض ان کی ذات کے ذریعہ کیسے انجام پاگیا، بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح کا جو کام آپ نے انجام دیا، وہ بجائے خود حیرت انگیز ہے، لیکن اس کے ساتھ صوبۂ بنگال و آسام کے غیر مسلموں میں آپ نے وہ کامیابی حاصل کی جو دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، صوبۂ بنگال جو مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ نہ بن سکا، اور جس کو عام طور پر جہنم پُر از نعمت" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اس کو مسلمانوں کی اکثریت کا صوبا اور اہل ایمان کے ذریعہ جنت پُر از نعمت" کا نمونہ بنانے میں مولانا کی تبلیغی کوششوں کا بہت زیادہ دخل ہے، مگر افسوس ہے کہ انگریزوں کو سید صاحب کے سلسلہ کے بزرگوں سے جو بغض و عناد تھا اور ان سے جو عام مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کے نتیجہ میں بہت کم لوگوں نے اس سلسلۃ الذہب کی دینی خدمات کا کما حقہ ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے، اب جاکر کہیں کہیں ذکر آنے لگا ہے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ مولانا کے ہاتھوں پر بنگال و آسام کے لاکھوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ جس کا اعتراف خال خال بہت سے تاریخ نویسوں نے بھی کیا ہے، الحاج محمد اجمل خان ایم۔ اے اپنی کتاب "سوانح خواجہ معین الدین چشتی" میں لکھتے ہیں:

"زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اس کے بعد اس کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوئے ہیں کہ مشرقی بنگال پورا کا پورا مسلمان ہو چکا ہے یہ کوشش صرف جون پور کے ایک

بنگال کی تھی جنھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ (غیر مسلموں کو) مسلمان بنادیا، آپ کا نام نامی مولانا مولوی کرامت علی جون پوری تھا۔

سیرت سید احمد شہیدؒ کے مصنف لکھتے ہیں :

"صرف مولوی کرامت علی صاحبؒ جون پوری کی کوششوں سے جو سید صاحبؒ کے مشہور خلیفہ تھے بنگال میں لاکھوں آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے" (سیرت سید احمد شہیدؒ)

مختصراً یہاں ان داخلی وخارجی اسباب کی قدرے تفصیل کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کی بنا پر مولانا کی سعی دعوت وتبلیغ سعی مشکور ثابت ہوئی، توفیق الٰہی کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والوں کیلئے ان اسباب کو اختیار کیے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔

اخلاص وللّٰہیت

(۱) دعوت وتبلیغ کی راہ کا سب سے قیمتی زادِ راہ اخلاص وللّٰہیت ہے خدا تعالیٰ نے اس دولت سے مولانا کو پورے طور پر نوازا تھا، مولانا جون پور کے ممتاز خاندان کے فرد تھے، ان کی پرورش بڑی ناز ونعمت میں ہوئی تھی، خاندانی وجاہت کی وجہ سے عوام سے رابطہ کی نوبت کم آتی تھی، مگر ان کا اخلاص اور غایت درجہ کی للّٰہیت ہی تھی کہ اس عیش وآرام کو چھوڑ کر بنگال وآسام کے دور دراز مقامات کی خاک چھانی اور سارے اعزاز واکرام کو بالائے طاق رکھ کر اور ہزار ہا مشقتیں اور زحمتیں اٹھا کر دینِ حق کی "صدائے غریب" کو بنگال و آسام کے جاہل عوام کے لیے نہ صرف مانوس بنادیا۔ بلکہ اسے صدائے دلنواز بنا کر ان کے کانوں سے اتار کر ان کے دلوں کی گہرائی تک پہونچا دیا، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ سابغۃ۔ مولانا کی للّٰہیت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ جب وہ مرجع خلائق بن گئے تھے اسی اثنا میں بنگال میں ایک عرب قاری آگئے، مولانا پہلے سے تجوید وہفت قرأت سے واقف تھے، مگر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے ان سے سبقاً سبقاً تجوید وقرأت سبعہ کی تکمیل کی اور پھر اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، مولانا کے کچھ اقوال ہم آخر میں نقل کریں گے، جن سے ان کے زہد وتقاء اور اخلاص وللّٰہیت کا اندازہ ہوگا۔

(۲) دوسری چیز جو مولانا کے کاموں میں معنوی سہارا بنی، وہ حضرت سید صاحبؒ کی دعائے خاص مولانا جون پوریؒ حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت سید صاحبؒ نے چند ہی دنوں میں ان کی دعوتی صلاحیت کا اندازہ فرمالیا۔ اور شوق جہاد کے باوجود ان کو تین ہفتہ بعد یہ دعاء اور حکم

دے کر رخصت فرمادیا کہ "خدا کی رحمت سے کام ہوگیا، اور بہت جلد ہوگیا[1] اب ہدایت کے کام میں لگ جاؤ۔" چنانچہ ذاتی صلاحیت اور اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ اس مقبول بارگاہ دعا اور حکم کا اثر یہ ہوا کہ اس کے بعد مولانا اسی کے ہو رہے، مولانا نے دعوت و تبلیغ کے لیے بنگال اور آسام کے پُر ظلمت غربت کدوں کا انتخاب حضرت سید صاحبؒ کے حکم ہی سے کیا تھا۔

(۳) ان معنوی اسباب کے ساتھ مولانا نے اس راہِ پُر خار میں جو غیر معمولی محنت، جدوجہد اور استقامت کا ثبوت دیا ہے، اس سے اسلاف کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شدید سے شدید موانع کے باوجود ان کا کام کسی آن بھی رکا نہیں، مولانا نے خود اپنی محنت و مشقت اور جدوجہد کے واقعات اپنی کتابوں میں کم نقل کیے ہیں، مگر ان کی کتابوں میں ضمناً جو اشارات مل جاتے ہیں ان سے ان پر کچھ روشنی پڑتی ہے، ایک جگہ سفر کی تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب کی بار سفر میں چند روز کچھ ظاہری تکلیف ایسی ہوئی کہ بعض ہمراہیوں کو کچھ وسواس آگیا، مگر ہم کو اللہ تعالیٰ نے استقامت کے ساتھ رکھا تھا۔"

اوپر ذکر آچکا ہے کہ بسا اوقات کئی کئی دن ایک ہی کدو پر پورا قافلہ گذر کرتا تھا، مولانا کے سفر کے سارے اخراجات ان کے متوسلین برداشت کرتے تھے، مگر بسا اوقات قرض کی نوبت بھی آجاتی تھی، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس فقیر کے ساتھ کئی بوٹ ہیں، اور ایک سو روپئے روزانہ کا خرچ ہے، اور بعضے مقام پر لوگ دعوت دے کر فقیر کو لے گئے، مگر ان لوگوں نے نہ سمجھا اور فقیر مقروض ہوگیا۔"

دورانِ سفر آپ پر کاموں کا کتنا ہجوم رہتا تھا اس کا اندازہ مولانا کے پوتے مولانا عبد الباطن

---

[1] کام ہوجانے سے مطلب تزکیۂ نفس، باطن کی صفائی اور تعلق مع اللہ کا پُر شور جذبہ پیدا ہوجانا ہے، اس کے لیے برسوں بزرگوں کی صحبت میں لوگ رہتے ہیں، مگر صلاحیت کی کمی کی وجہ سے انھیں کامیابی نہیں ہوتی، مولانا جونپوری میں پہلے سے صلاحیت موجود تھی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچ کر اس کو جلا مل گئی، ہمارے حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ اگر لکڑی سوکھی ہو تو ایک سلائی کی تیلی سے وہ بھڑک اٹھتی ہے، اور اگر گیلی ہو تو گھنٹوں اس سے شعلے نہیں پیدا ہوتے۔

ذکر کرنے سے ، یعنی ایسا نہ کرو ، بلکہ بیان کرو فاجر کو اس کے عیب کے ساتھ جو اس میں ہو، تاکہ پرہیز کریں لوگ اس فاجر سے[1]"

مولانا نے ہمیشہ بحث و مباحثہ اور مناظرہ سے گریز کیا، مگر بسا اوقات اس کی ضرورت پیش آ جاتی تو مناظرہ بھی کر لیا کرتے، مگر ان کو خدا نے جو دعوت و تبلیغ کا ایک فطری اور سادہ انداز بیان دیا تھا زیادہ تر اسی سے کام لیتے تھے، ان کے سادہ بیان کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، اوپر ذکر آ چکا ہے کہ بنگال میں ایک گروہ منکرین جمعہ کا پیدا ہو گیا تھا، وہ اسے دار الحرب کہہ کر جمعہ کا انکار کرتا تھا، اور مولانا کا شدید مخالف تھا، مولانا نے ان کے ایک مرکز میں ایک بار نماز جمعہ ادا فرمائی اور پھر یہ تقریر کی :

خواہ مخواہ لوگ ہم کو کہتے ہیں کہ ہم نئی بات ایجاد کرتے ہیں، ہماری نئی بات یہی ہے کہ ہم نماز کا حکم دیتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں، اور جو لوگ اس ملک میں جمعہ کو بالکل ناجائز بتلاتے ہیں، ہند اور بنگال کو دار الحرب کہہ کر جمعہ کی فرضیت کے منکر ہیں اور جمعہ پڑھنے سے زبردستی لوگوں کو روکتے ہیں ان سے ہم مناظرہ کرتے اور نماز جمعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں، اب تم لوگ بتلاؤ کہ مسجد کس نے بنائی ہے ؟ لوگوں نے جواب دیا کہ شجاع بادشاہ نے بنوائی ہے، پھر پوچھا: کس واسطے ؟ لوگوں نے کہا : نماز کے لیے ، پھر فرمایا : کتنے روز ہوئے اس مسجد کو بنے ہوئے ؟ کہا گیا سیکڑوں برس گذر گئے ، تو فرمایا : منبر مسجد میں کس لیے بنایا ہے ؟ کہا گیا خطبہ پڑھنے کے لیے ، فرمایا : خطبہ کب پڑھتے ہیں ؟ کہا گیا : جمعہ کو ، فرمایا : کہ تو معلوم ہوا کہ یہ مسجد قدیم ہے اور منبر بھی قدیم ہے ، اور جمعہ کا چرچا اور رواج بھی قدیم ہے ، صرف بیچ میں لوگوں کی سستی سے جمعہ کی نماز متروک ہو گئی تھی جس کو پھر ہم جاری اور تازہ کر دیتے ہیں ، اور بھولے ہوئے مسائل کو یاد دلا رہے ہیں، ہماری بات نئی نہیں ہے، بلکہ پرانی اور قدیم ہے "

مولانا کے اس انداز بیان سے کون انکار کر سکتا تھا، چنانچہ یہ متروک سنت وہاں جاری و ساری ہو گئی۔

(۵) مولانا کی دعوتی اور تبلیغی کامیابی پر اس حیثیت سے اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا بنگلا اور آسامی زبان سے واقف نہیں تھے ، پھر بھی بنگالیوں اور آسامیوں میں ان کو یہ کامیابی کیسے حاصل ہوئی

---

[1] اس حدیث کا متن راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرا، مگر اس مفہوم کے قریب بعض روایتیں موجود ہیں۔

صاحب کے بیان سے ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مولانا کو بسلسلۂ تبلیغ ایک وقت میں بہت سے کام ایک ساتھ انجام دینے پڑتے تھے مثلاً عام مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعہ باعمل مسلمان بنانا، بے شرع فقیروں، بدعتی پیروں کا استیصال، وحدت وجودی عقیدہ والوں کا رد، خارجی گروہ کی بدعقیدگی کا دک تھام، اور ان کے عقائد کے بطلان میں رسائل لکھ کر شائع کرنا، ضروریات دین کی کتابوں کی تالیف و تصنیف، استفتاؤں کا جواب غلط اور گمراہ کن فتاوؤں اور رسالوں کا رد لکھنا، طالبین کو ذکر واذکار اور سلوک کی تعلیم دینا، فن تصوف میں کتابوں کی تالیف و اشاعت، طلبہ کو تجوید قرآن کی تعلیم، مبلغین کو خاص ہدایت کے ساتھ بنگال و آسام کے مختلف گوشوں میں روانہ کرنا، اور نگرانی بھی کرنا، جس جگہ ضرورت محسوس ہو وہاں مسجد و مدرسہ قائم کرنا، اور اس کا کفالت کے لیے لوگوں کو مستعد و آمادہ کرنا، خود اپنے قافلہ کی جس میں عورتیں، بچے، اور طلبا، مہمان، ترجمان، ملاح و خدام ہوتے، ان لوگوں کی دیکھ بھال اور ان کے حقوق و راحت کا خیال کرنا، خود اپنے معمولات باطن کو پابندی سے ادا کرنا، غرضیکہ مولانا ایک ایسے مرد مجاہد تھے کہ جن کے جسم کا ہر عضو خدمت دین و خلق کے لیے وقف تھا، اور مثل مشین کام کر رہا تھا، دل و دماغ اور کل اعضاء و جوارح اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول رہتے تھے، جس کام کی انجام دہی کے واسطے ایک دفتر و عملہ کی ضرورت تھی، اس کو وہ تن تنہا انجام دے رہے تھے، اور اپنے خزانۂ توکل سے تمام کثیر اخراجات کے خود ہی کفیل تھے۔"

(۴) مولانا کو اپنے کاموں میں جن اسباب سے کامیابی ہوئی ان میں ایک بڑا سبب ان کا اعتدال و توازن اور سادہ انداز بیان تھا۔ مولانا نے جس وقت اپنا کام شروع کیا اس وقت بنگال میں نہ جانے کتنے فتنے سر اٹھائے ہوئے تھے، مگر مولانا ان فتنوں سے ہمیشہ صرف نظر کر کے اپنے کام میں مشغول رہتے البتہ جہاں ناگزیر ہو جاتا وہاں اپنی زبان کھولتے اور قلم کو حرکت دیتے، چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں جو اہل حل کے رد میں کتابیں لکھیں انتہائی مجبوری کی بنا پر۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جس گمراہ کرنے والے نے ہزاروں آدمی کے دین کو برباد کر دیا، اور سیکڑوں کلمہ گو کو بغیر جنازہ کی نماز کے دفن کروا دیا، سو بموجب حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کا ذکر ہم نام لے کے کر دیتے ہیں، تاکہ لوگ اسکے فساد سے محفوظ رہیں، وہ حکم یہ ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تم لوگ باز رہتے ہو بدکار کے

اس کمی کو دور کرنے کے لیے مولانا نے دو طریقے اختیار کیے، ایک تو اس دیار میں اردو زبان (جسے اس وقت عام طور پر ہندی کہا جاتا تھا) کو رواج دیا، اور لوگوں کو اس سے مانوس کیا، اور اپنی کتابوں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی اردو اور بنگالی کی شدید عصبیت کے باوجود بنگالیوں کی دینی مجلس اردو زبان ہی میں ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ بہت سے بنگالی علماء کو اردو زبان سکھا کر اپنی ترجمانی پر مامور کیا، اور بہت سے لوگوں کو دور دراز مقامات پر تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، جو بنگالی اور آسامی زبان میں اسلام کی خوبیاں عوام کے سامنے بیان کرتے تھے۔ چنانچہ آج بھی مولانا کے بہت سے خلفاء کے نام اہل بنگال کی زبان پر ہیں، ان خلفاء کے ناموں کی تفصیل آگے آئے گی جو مولانا کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے تھے، یہی حضرات غالباً غیر مسلموں کو مولانا کے قریب لاکر ان کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا سبب بنے۔

(۶) مولانا کے دعوتی کاموں میں ایک اور خارجی چیز معاون ثابت ہوئی، وہ تھی مولانا کے والد محترم کا جذبۂ ایثار و قربانی، مولانا جس وقت بنگال روانہ ہوئے تو وہ صاحب اہل وعیال ہو چکے تھے، مولانا کے والد مولانا ابو ابراہیم شیخ امام بخش باحیات تھے، اور عمر رسیدہ ہو چکے تھے، مگر جب مولانا نے حضرت سید صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق دعوت و تبلیغ کی غرض سے بنگال و آسام کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے شفقت پدری کے باوجود ان کو ایک دن بھی اس سے نہیں روکا، اور جانے کے بعد اٹھارہ برس تک ان کی واپسی نہیں ہوئی، ادھر اہل خاندان برابر مولانا کے والد صاحب پر زور ڈال رہے تھے کہ ان کو جون پور واپس بلانے کے لیے خط لکھیں، مگر ان کے والد صاحب ہمیشہ اس کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ اٹھارہ برس کے بعد وہ خود واپس ہوئے تو وہ بے حد خوش ہوئے، مگر ان کی واپسی کی خوشی ان کو کس حیثیت سے ہوئی، اس کا اندازہ ان کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو انھوں نے ان کی واپسی پر ظاہر کیے۔

ان کے والد محترم نے اہل خاندان اور حاضرین سے جو اس وقت ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے، مخاطب ہو کر فرمایا:

"بعض لوگوں کو تعجب تھا کہ حضرت سید صاحبؒ نے اول ہی ہفتہ گذر جانے پر مولوی صاحب کو (مولانا کرامت علی صاحبؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہہ دیا کہ ہدایت کے کام میں لگ جاؤ، پھر اٹھارہ یوم کے بعد اجازت و خلافت بھی عطا فرما کر رخصت فرما دیا، اور پھر جہاد میں جاتے وقت ان کو صوبۂ بنگال کی تبلیغ کا کام سپرد فرما دیا، اور ان کے ارشادات کے مطابق کاربند ہوئے، اب بتلاؤ کہ ان کا یہ سفر

کتنے دن کا ہوا، اور کتنے دنوں کے بعد واپس ہوکر حاضرین سے ملے؟ سبھوں نے عرض کیا کہ حضرت مولانا پورے اٹھارہ برس کے بعد تشریف لائے، اور خدا کے فضل وکرم سے عیال و اطفال کی ایک جماعت ماشاءاللہ لے کر آئے، مولانا کے والد مرحوم نے فرمایا کہ اب دیکھو حضرت سید صاحبؒ کے فیوض و برکات کا اثر کہ ان کی صحبت کا ایک ایک دن ایک ایک سال کی تبلیغی قوت رکھتا ہے، جو مشاہدہ ہے۔ تمام احبابِ مخلصین مجھ سے فرمائش کرتے تھے کہ تم مولوی صاحب کو لکھو کہ مدتیں گذر گئیں اور گذرتی جارہی ہیں، آپ جون پور والوں کو بھول گئے، اطراف وجوانب کے مریدین امید اور یاس کے عالم میں منتظر ہیں، مگر میں نے کبھی ان کے سفر کے انقطاع کا حکم نہیں لکھا۔" (کشکول باطن)

ان تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے والد کے اندر دعوت واحیائے دین کا کتنا بے پایاں جذبہ موجود تھا کہ دین کے لیے اپنے محبوب لختِ جگر کی مفارقت انھوں نے ایک دو دن نہیں بلکہ پورے اٹھارہ سال برداشت کی، اور پھر تھوڑے دن بعد انھیں پھر رخصت کر دیا، اور اسی زمانۂ مفارقت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اللہ ان پر رحمتوں کی بارش کرے۔

(۷) اس سلسلہ میں سید صاحبؒ کے وہ خلفاء جو کلکتہ اور بنگال وغیرہ میں موجود تھے وہ بھی مولانا کے کاموں میں سا بے حد معاون ہوئے، ان میں حسب ذیل حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

مولانا حافظ جمال الدین صاحب محدث وقت، مولانا محمد وجیہ صاحب مدرس اول مدرسۂ عالیہ کلکتہ، قاضی عبدالباری صاحب وغیرہ۔

(۸) اس کام میں مولانا کے سیکڑوں تلامذہ اور متوسلین بھی شریک تھے، جن کے ناموں کی تفصیل باوجود کوشش کے نہ مل سکی۔ مولانا کے اہل خاندان میں ان کے تقریباً ساٹھ ستر خلفاء و متوسلین کے نام محفوظ ہیں، ان میں چند کے نام یہ ہیں:

(۱) مولانا انوار اللہ صاحب، مصنف شوارق مکیہ، یہ چاٹگام کے رہنے والے تھے، اور مولانا کے خلیفۂ خاص اور آپ کے شریک کار تھے۔

(۲) مولانا سید محمد رام پوری، ریاست رام پور کے سابق قاضی مولانا حامد شاہ صاحب کے یہ والد ماجد تھے، اور مولانا کے کاموں میں برابر شریک رہے، رام پور کے علاوہ علاقہ پانبا اور ناگوا وغیرہ کے لوگوں کو ان سے بہت فیض پہونچا۔

(۳) مولانا عبد العزیز صاحب، یہ ضلع فرید پور کے مقام ملفت گنج کے رہنے والے تھے، یہ مولانا کے ترجمان خاص تھے، مولانا کی اردو تحریروں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ بھی کرتے تھے، خود بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

(۴) منشی نعمت اللہ صاحب احمد پور، پابنا کے رہنے والے تھے، آپ نے مولانا کے ارشاد کے مطابق بگڑہ، رنگ پور، سورج گنج اور گولکنڈہ وغیرہ میں زبردست تبلیغی کام کیا، گول کنڈہ میں آپ نے ایک بڑی مسجد تعمیر کرائی تو بیس پچیس میل سے لوگ اس میں جمعہ ادا کرنے آتے تھے۔

(۵) قاری محمد جاوید صاحب، یہ سلہٹ کے رہنے والے تھے، اور مولانا کے خاص جاں نثاروں میں تھے، یہ آسام کے ایک اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کے صاحبزادے شمس العلماء ابو نصر صاحب آسام کے وزیر تعلیم رہ چکے ہیں۔

(۶) مولانا احسن اللہ صاحب اور منشی حاجی عبد الرحیم صاحب، یہ دونوں حضرات مولانا کے بوشکے گشتی مدرسے کے فیض یافتہ تھے، اول الذکر بڑے جید عالم تھے، اور ان کے بعد بھی ان کے خاندان میں مدتوں علم دین اور دعوت دین کا چرچا رہا۔

(۷) ان کے علاوہ مولانا فیض اللہ صاحب نواکھالی، مولانا الٰہی بخش صاحب فتاوی ودائم الدین، مولانا عبد القادر صاحب مصنف خلاصۃ المسائل وغیرہ مولانا کے ان خلفاء نے تبلیغ و اصلاح میں مولانا کا پورا تعاون بھی کیا، اور خود بھی پورے علاقہ میں زبردست دعوتی و اصلاحی کام کیا۔

(۸) مولانا کے خلفاء و متوسلین کے ساتھ ان کے اہل خاندان اور خاص طور پر ان کے دو صاحبزادے مولانا کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی بڑا زبردست کام انجام دیتے رہے، ایک مولانا حافظ احمد صاحب متوفی ۱۳۱۶ھ، دوسرے مولانا عبد الاول صاحب متوفی ۱۳۲۵ھ ہیں، مولانا حافظ احمد صاحب کی ولادت کلکتہ میں مولانا کے اثنائے قیام ہی میں ہوئی تھی، یہ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور تبلیغ و دعوت میں مولانا کے نقش ثانی تھے، اور ان اوصاف اور خدمات کی وجہ سے عوام میں حد درجہ مقبول تھے، ان کے عقیدت مندوں میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ہی شامل تھے، ان کے کاموں اور دوروں کی خبریں کلکتہ اور بنگال کے سارے اخبارات جلی سرخیوں سے شائع کرتے تھے، ایک بار کلکتہ میں مولانا کے گرد دعا کرانے والوں کا غیر معمولی مجمع ہوا، اور مولانا نے ہزاروں کو پانی میں کالا زیرہ دم کر کے دے دیا،

جس سے نہ جانے کتنے مریض شفایاب ہوئے، ایک شاعر نے اس پر یہ شعر کہا ہے

دکھایا اثر کالے زیرے نے جب　　　پرستش گئے بھول کالی کی سب

مولانا احمد صاحب کا انتقال ڈھاکہ میں ہوا، اور وہیں چوک والی مسجد میں آپ کا مزار ہے، مولانا کے دوسرے صاحبزادے عبدالاول صاحب دعوت و تبلیغ کے ساتھ متعدد اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں بعض کتابیں عربی زبان میں ہیں، آپ کا انتقال کلکتہ میں ہوا، اور مانک تلہ میں آپ کا مزار ہے، ان کے خاندان کے بہت سے حضرات آج تک تبلیغ و اصلاح کا کام جاری کیے ہوئے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ تھے وہ داخلی و خارجی اسباب جو مولانا کے دعوت و تبلیغ میں معاون ثابت ہوئے، واللہ اعلم بالصواب۔

تصانیف

مولانا کی حسب ذیل تصانیف کا ذکر "تذکرہ علمائے ہند" میں ہے: (۱) مفتاح الجنۃ (۲) زینۃ المصلی (۳) زاد التقوی (۴) راحت روح (۵) نور علی نور (۶) فیض عام (۷) دعوات مسنونہ (۸) قرۃ العین (۹) تزکیۂ نسواں (۱۰) تزکیۃ العقائد (۱۱) مراد المریدین (۱۲) قوۃ الایمان (۱۳) نسیم الحرمین (۱۴) حقائق الحق (۱۵) مرآۃ الحق (۱۶) رفیق السالکین (۱۷) تنویر القلوب۔ (۱۸) حق الیقین (۱۹) قول الحق (۲۰) مرآۃ الحق (۲۱) عکازۃ المومنین (۲۲) المعاندین (۲۳) براہین قاطعہ فی مولد خیر البریہ (۲۴) کرامۃ الحرمین فی ازالۃ مشتبہ الفریقین (۲۵) لمعۃ النعل الآمین (۲۶) اطمینان القلوب، (۲۷) بہا　الاخوان (۲۸) مخارج الحروف (۲۹) ہدایۃ الرافضین (۳۰) زینۃ القاری (۳۱) شرح ہندی جزری (۳۲) شرح شاطبی (۳۳) ترجمہ مشکوٰۃ جلد اول (۳۴) ترجمہ شمائل ترمذی (۳۵) فتح باب جہان، (۳۶) کوکب دری (۳۷) نور الہدیٰ (۳۸) حجت قاطعہ (۳۹) مکاشفات رحمت (۴۰) دفع الوسواس (۴۱) مصباح الظلام (۴۲) رسالۂ بیعت (۴۳) قاطع البتدعین (۴۴) استقامت (۴۵) ازالۃ (۴۶) قوت روح (۴۷) سبیل الرشاد (۴۸) القول الثابت (۴۹) رسالۂ محمودیہ وغیرہ۔

لہ بنگال میں "کالی" کی پرستش کثرت سے ہوتی ہے، بعض لوگوں نے کلکتہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی بتائی ہے ۱۲۔ غالباً کالی استھان سے بگڑ کر کلکتہ ہوگیا۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام علوم دینیہ پر مولانا نے اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان کتابوں میں مشکوٰۃ اور شمائل ترمذی کا ترجمہ اور شرح جزری اور شرح شاطبی اپنی دینی و علمی حیثیت کے لحاظ سے اور مفتاح الجنۃ اور عقائد پر بعض دوسری کتابیں اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں بعض کتابوں کا شمار تو دو چار ممتاز ہندوستانی تصنیفات میں ہونا چاہیے۔ ان کی چار پانچ کتابیں عربی میں ہیں، بقیہ اردو میں ہیں، ان میں بعض تو بہت زیادہ مقبول اور مشہور ہوئیں

مفتاح الجنۃ | خاص طور پر مفتاح الجنۃ جو پہلی بار ۱۲۴۳ھ میں چھپی اور پندرہ سولہ برس کے اندر اس کے چار پانچ ایڈیشن نکل گئے، ہمارے پاس اس وقت مطبع مصطفائی محمود نگر لکھنؤ مطبوعہ ۱۲۶۰ھ کا نسخہ ہے، اس کے مالک محمد مصطفیٰ خان نے جو کتاب کے آخر میں خاتمہ لکھا ہے، اس میں انھوں نے تمام مطبوعہ نسخوں کا ذکر کیا ہے، اور سب سے مقابلہ کر کے چھاپا ہے، ہم ان کا پورا بیان یہاں نقل کرتے ہیں:

"کتاب مفتاح الجنۃ کہ مولوی کرامت علی صاحب جون پوری کی تصنیف ہے انھوں نے شہر کلکتہ میں اول دفعہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں اور دوسری بار ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں چھپوایا تھا اور حاجی عبدالقادر صاحب نے بعد اس کے اسی شہر میں چھپوایا، ۱۲۵۰ھ میں سو اس بندۂ گنہ گار، امیدوار مغفرت پروردگار محمد مصطفیٰ خان بیٹے حاجی محمد روشن خان مرحوم نے ان تینوں نسخوں کو مع چوتھے نسخہ چھپوائی ہوئی محمد فیض اللہ صاحب کے ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں ساتھ کمال جدوجہد کے ہر ایک جگہ سے جمع کر وا کر اول سے آخر تک ہر ایک کو نظر دقیق دیکھ کر اور مفرد جمع اور تذکیر و تانیث موافق اردو ئے معلیٰ کی درست کر واسطے خیر خواہی بھائیوں مسلمانوں کے بیچ بیت السلطنت لکھنؤ کے محلہ محمود نگر میں پیچھے اکبری دروازہ کے مطبع اپنے میں کہ ساتھ مصطفائی مشہور ہے، پچیسویں ماہ جمادی الآخر ۱۲۶۰ھ میں چھپوایا، اب جو شخص اول چاروں کو اکٹھا کر سیر اس کی کرے، اس پر بخوبی تمیز روشن ہو جائے کہ یہ نسخہ بہت و متانت و موافقت روزمرہ میں فی الحقیقت لاجواب ہے، اور دوسرا چھپنا دشوار۔ الحمد للہ اولاً و آخراً۔ (ص ۱۳۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۶۰ھ تک ۱۵-۱۶ برس کے اندر اس کے چار ایڈیشن

طابع کے علم میں نکل چکے تھے، مگر خود مولانا کرامت علی جون پوری کا جو بیان ۱۲۶۳ھ والے ایڈیشن کے آخر میں درج ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس کے مطبوعہ یا پھر قلمی نسخے ملک میں پھیل چکے تھے اور انھوں نے اضافہ کے بعد پھر اسے ۱۲۶۳ھ میں چھپوایا، مولانا کا بیان یہ ہے:

"اس فقیر نے اس کتاب کو تصنیف کرنے کے کئی برس بعد حج کے سفر سے پھرتے ہوئے ۱۲۴۲ھ میں چھپوایا تھا، سو اب بعضے مقام پر مضمون صاف ہونے کے تئیں کچھ لفظیں زیادہ کم کیں اور دو چار ضروری مسئلے چھوٹ گئے تھے سو ان کو ان کے مقام پر داخل کیا، اب جس کے پاس وہ کتاب ہووے، وہ اس کے موافق اپنی کتاب درست کرے۔" (ص ۱۲۹)

"اب جس کے پاس یہ کتاب ہوئے" سے یا تو قلمی مراد ہے، جیسا کہ دستور تھا کہ لوگ لکھ کر اپنے پاس رکھتے تھے، یا پھر مطبوعہ مراد ہے، اس سے پہلے مطبوعہ ہونے کی صورت میں ۱۲۴۲ھ کے ایڈیشن کے بارے میں یہ کہا جائے کہ مولانا نے ترمیم و اضافہ کے بعد اپنے اہتمام میں سب سے پہلے ۱۲۴۲ھ میں اسے چھپوایا۔ اور ہدایت کر دی کہ اس کے موافق لوگ اپنے نسخے درست کر لیں۔

آگے شمائل کے سلسلہ میں ہم مولانا کی اردو تصنیفات کے مقصد پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

مفتاح الجنۃ کی تصنیف جن مقاصد کے پیش نظر ہوئی ان میں سب سے بڑا مقصد دین کی اشاعت تھی اور یہ اسی وقت ممکن تھی جب اسے عوام کی زبان میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مفتاح الجنۃ کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں:

"جب اس فقیر عاجز نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور اپنی طاقت کے موافق معنی قرآن شریف اور حدیث بیان کرنے شروع کیے تب اللہ تعالیٰ کے کلام کا اثر سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی برکت سے بہتیرے مسلمان دین پر مضبوط ہوئے اور اذان اور نماز خوب ہونے لگی اور مسلمانوں کی عورتیں بھی بہت سی اللہ کی ہدایت سے نماز پڑھنے لگیں۔ اس فقیر عاصی نے چاہا کہ ایک رسالہ چھوٹا سا جس میں مسئلے ضروری نماز کے سب رہیں ہندی زبان میں جو آسانی سے عورتوں اور مردوں کو سمجھ میں آویں لکھنا چاہیے، اور اس بات کو موجب بہتری اور پڑھنے والوں کی سمجھ کے اس رسالہ کی ۲۲ معتبر کتابوں سے جیسا طرح شرح وقایہ اور تاتارخانی اور محیط اور ہدایہ اور فتاوی محققہ شامی اور مختصر قدوری اور کنز اور شرح اوراد وغیرہ سے خوب تحقیق کر کے کتابوں میں سے نکال کے اس رسالہ میں لکھا ہے[1]۔" (ص ٦)

---

[1] اس وقت "ہے"، "کے" وغیرہ عموماً یائے مجہول کے بجائے معروف سے لکھتے تھے لیکن ہم نے نقل میں اس املا کی پیروی نہیں کی ہے۔

مولانا ظفر صاحب نے مفتاح الجنۃ کا نیا ایڈیشن اس کے تمام مسائل کو مدلل اور محشی کر کے شائع کیا ہے، جو ہر طرح لائق تحسین ہے، افسوس ہے کہ اس کتاب کی طرف سے اب توجہ کم ہوگئی ہے، لیکن اس کی افادیت آج بھی جوں کی توں باقی ہے۔

ترجمہ مشکوٰۃ شریف

مولانا نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ بھی کیا تھا، مولانا نے جس زمانہ میں مشکوٰۃ کا ترجمہ کیا، اسی کے لگ بھگ ایک دوسرا ترجمہ مولانا قطب الدین صاحب دہلوی نے "مظاہر حق" کے نام سے کیا، اور یہ ترجمہ کافی مقبول ہوا اور اب بھی متداول ہے، مولانا کرامت علی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، مگر شمائل ترمذی کے ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ترجمہ مظاہر حق کے ترجمہ سے زیادہ رواں، صاف اور شستہ ہوگا، مظاہر حق کا لفظی ترجمہ اگر اصل عربی متن سامنے نہ ہو تو وہ بہت سی جگہ کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا، مگر شمائل ترمذی کے ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترجمہ میں یہ کمی نہ ہوگی۔

مولانا سخاوت علیؒ کے چند نصائح

"الرشاد" کے حالیہ شماروں میں مولانا کرامت علی جونپوری علیہ الرحمۃ پر ایک سلسلۂ مضمون جاری ہے۔ جونپور کے ایک دوسرے بزرگ عالم مولانا سخاوت علی جونپوری علیہ الرحمۃ ہیں جن کی مشہور کتاب "راہِ نجات" جو پچاس برس پہلے ہر گھر میں پڑھی جاتی تھی ان کے سوانح اور علمی و تبلیغی خدمات پر انشاء اللہ ایک نیا سلسلہ شروع کیا جانے والا ہے۔ اس شمارہ میں مولانا موصوف علیہ الرحمۃ کے چند وہ نصائحؒ اور ارشادات دیئے جا رہے ہیں جو ان کے متعدد رسالوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان میں ہر ایک نصیحت حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔

رسالہ التقویٰ ص۸ میں فرماتے ہیں:

اصل عقیدہ جس پر ایمان و کفر کی بنیاد ہے ایمان لانا ہے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور پچھلے دن پر۔ اس عقیدہ میں تمام امت مصطفویہ شریک ہے جسمیں یہ عقیدہ ہو اسی کو کلمہ گو اور اہل قبلہ کہتے ہیں کا فر کہنا ان کا اہلسنت کے نزدیک جائز نہیں۔

رسالہ فقر ص۳ میں ارشاد ہے:

قطعی گواہی کسی اہل قبلہ پر نہ دیوے شرک کی نہ کفر کی نہ نفاق کی نہایت بچے کسی پر بددعا کرنے سے اگرچہ اس پر ظلم کیا ہو۔

رسالہ نصائحؒ میں تحریر فرمایا:

کسی کو کافر نہ کہے گناہ سے کہنا جائز نہیں کسی کو ہرگز کافر نہ کہے خصوص نام معین کے ساتھ اور کافر کہنے سے نہایت پرہیز کرے ہرگز لب نہ کھولے۔

جو مسئلہ آپ جانتا ہو اور وہ اختلافی ہو اوس پر اصرار نہ کرے اور جو دوسرا شخص اوس کے خلاف کرتا ہو اوس پر جرح نہ کرے۔ جہاں تک ہو سکے مسائل فروع میں گفتگو خلاف نہ کرے زیادہ تفتیش و تلاش کر کے دور تک نہ پہنچا وے۔ ہمیشہ جماعت محمدیہ کی ترقی میں رہے یعنی اہل سنت کی جماعت بڑھاتا جاوے، جہاں تک ہو سکے سب کو اپنی جماعت میں لیوے اور پھوٹ اور جدائی سے پرہیز کرے اور ذرا ذرا باتوں سے اپنے گروہ سے خارج نہ کہے اور اتفاق کو بڑی نعمت سمجھے۔ ایضاً صـ۱۳۱ ۔ تقویٰ مطابق ظاہر شرع کے لازم لیوے اور سینہ صاف رکھے اور سخاوت و خوش روئی اور بخشش اور تحمل اور لوگوں کا دکھ ٹالنا اور خیر خواہی اخلاق اور ترک خصومت اور ایثار اپنی خو کرے۔ (ایضاً)

ہر کام دین و دنیا میں اللہ و رسول کی مرضی کا لحاظ رکھیں اور اپنی نمود کو اور نام کا اصلاً خیال نہ کرے خلق خوش اختیار کرے پر اس خلق خوش سے دین میں سست نہ ہو جاوے۔ کسی کی خاطر کے واسطے شریعت کا مکروہ امر عمل میں لانے نہ لگے۔ سب اپنے اہل و عیال جورو بچوں پر لحاظ رکھیں کہ خلاف اللہ و رسول نہ چلیں اور تعلیم کیا کریں۔ (ایضاً صـ۱۴۰)

سب سے مقدم کتاب اللہ کو جانے، بعد اوس کے کتب احادیث کو، بعد اوس کے کتب فقہ کو اور ہر مرتبہ کی نگہبانی نہایت ضرور ہے۔ سب کی نگہبانی کریں۔ مرتبہ ہر ایک کا نگاہ میں رکھیں۔ اللہ جل شانہٗ کے سامنے سب کو حقیر جانیں، بعد اوس کے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ۔ بعد اوس کے صحابۂ کرامؓ اور اہل بیت عظام کا مرتبہ، بعد اون کے علمائے ربانی جو مجتہدین کے ہیں اون کا مرتبہ، بعد اوس کے علماء کا مرتبہ، بعد اون کے صلحاء و مؤمنین کا مرتبہ۔ (ایضاً صـ۱۴۱)

رسالہ تقویٰ صـ۸۲ میں ارشاد ہے:

چند عقیدے جس سے اہل سنت جماعت کہلاتا ہے اور اوس کے نہ ہونے سے اہل ہوا و بدعت، وہ یہ کہ نیکی و بدی پیدا کی ہوئی خدائے تعالیٰ کی ہے اور خالق وہ ہے اور دیدار الٰہی بہشت میں حق ہے اور صراط اور حساب اور کتاب اور نامۂ اعمال حق ہے۔ اور عذاب قبر حق ہے اور پیغمبر صلعم معصوم ہیں گناہوں سے بعد پیغمبری کے اصحاب رسول مقبول صلعم سب نیک اور اچھے اور سردار دین ہیں اور چار خلیفہ برحق ہیں جن کو چار یار کہتے ہیں اور بند و بست دین کے واسطے ایک سردار مقرر کرنا جو

لائق اور قریش کی قوم سے ہو واجب ہے اور جتنی آیات و احادیث ہیں سب کے معنی ظاہر حق ہیں سے اور مراد الٰہی، پس سوچو مسلمانو! اور تعصب دور کرو کہ یہ باتیں سلامت کی راہ ہیں۔

رسالہ بیان کلمات کفر میں فرماتے ہیں،

حدیث میں آیا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کو کسی گناہ سے کافر کہنا درست نہیں مسلمان کے کافر کہنے سے احتیاط ضرور ہے۔ تاتارخانی میں نیا بیع سے کہا ہے کہ امام اعظم نے فرمایا کہ جب تک اعتقاد نہ ہو کفر نہیں ثابت ہوتا۔ محیط اور ذخیرہ میں کہا ہے کہ مسلمان کافر نہیں ہوتا جب تک قصد کفر نہ ہو۔ مضمرات میں نصاب اور جامع اصغر سے کہا کہ اگر کسی نے کلمۂ کفر قصداً کہا لیکن اعتقاد کفر کا نہیں رکھا بعضے علماء کہتے ہیں کافر نہ ہوگا۔ امام ناصرالدین نے فرمایا کہ جس کلمہ کا کفر ہونا یقینی ہو اس سے حکم کفر کا کیا جاوے اور کفر ہونا یقینی نہ ہو حکم کفر کا نہ کیا جاوے گا۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک وجہ اسلام کی ہو اور کئی وجہ کفر تو اسلام کو غالب کیا چاہیئے اور حکم کفر نہ دینا چاہئے۔
(بیان کلمات کفر ص۳۰)

رسالہ فقر میں ارشاد ہے:

رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام صاف صاف ہے کہ میری امت دعوت بہتر فرقے ہوں گی سب دوزخ میں جائیں گے ہمیشہ رہیں یا چند روز پر ایک فرقہ دوزخ میں نہ جائے گا اور ان کا نشان یہ ہے کہ رسول مقبول صلعم اور اون کے اصحاب کے طور پر ہوں عقیدہ میں، عمل میں، اخلاق میں۔ پس بھائیو! اگر نجات و فلاح کلی منظور ہو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے قدم بہ قدم ہو جاؤ۔ (رسالۃ الفقر ص۳)

ملک کی ممتاز دینی درسگاہ

جامعۃ الرشاد

اعظم گڈھ

ایک نظر میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم حضرات !

جامعۃ الرشاد محض ایک عربی درسگاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع المقاصد ادارہ ہے
یہاں دینی علوم کی معیاری تعلیم کے ساتھ بقدر ضرورت جدید علوم کی بھی تعلیم دی جاتی ہے
یہاں سے فارغ ہونے والے طلبا ایک طرف علوم دینیہ میں مہارت رکھتے ہیں تو دوسری طرف
جدید علوم سے بھی بے بہرہ نہیں رہتے۔ گویا یہ ادارہ قدیم وجدید کا بہترین سنگم ہے۔ اعلیٰ
دینی تعلیم کے ساتھ یہ ادارہ بہت سے ملی کاموں کا مرکز بھی ہے۔ نہ صرف ضلع بلکہ مشرقی
اضلاع میں اس وقت جتنے ملی کام ہو رہے ہیں ان کا مرکز یہی ہے۔

تعلیم و تربیت

(۱) صرف ونحو اور عربی ادب وانشاء پر شروع سے زور دیا جاتا ہے تاکہ طلبہ
کو عربی تقریر و تحریر پر پوری قدرت ہو جائے۔

(۲) فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، و ترجمہ قرآن پاک اور تفسیر کی معیاری تعلیم تیسرے
درجہ سے آخر درجہ تک جاری رہتی ہے۔ یونانی فلسفہ ومنطق کی تعلیم بھی بقدر ضرورت ہوتی ہے
قرآن پاک سے زیادہ سے زیادہ لگاؤ پیدا کرنے کے لئے عربی درجات کے پہلے ابتدائی تین سالوں
میں ہر طالب علم کو سورہ حجرات سے ختم قرآن تک مع تجوید حفظ کرنا ضروری ہے۔

(۳) دینی علوم کے ساتھ ہندی، انگریزی، جغرافیہ، اسلامی تاریخ، جنرل سائنس کی تعلیم بھی دی
جاتی ہے اور اس کے لئے مخصوص گھنٹہ ہوتا ہے۔

(۴) جامعۃ الرشاد کا نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم و تربیت اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے پورے
ملک میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے تفصیل کے لئے "مقاصد وخصوصیات اور نصاب تعلیم
اور جامعۃ الرشاد اکابر کی نظر میں" والے کتابچوں کا مطالعہ کریں۔

(۵) معیاری تعلیم کے ساتھ بچوں میں زیادہ سے زیادہ علم دین کا ذوق، عمل کا جذبہ، اسلامی اخلاق
وکردار کی خوبی، ایمان ویقین کی کیفیت اور دعوت دین اور اتباع سنت کا احساس پیدا کرنے
کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ان کا علم خود ان کے لئے بھی مفید ثابت ہو اور دوسروں کے لئے بھی۔
ان کے مزاج میں زیادہ سے زیادہ سادگی، خاکساری، محنت وقناعت پسندی اور جذبہ خدمت

پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے اخلاق وکردار کی خوبی اور محنت و خدمت سے بندگان خدا کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرسکیں۔

مدینہ یونیورسٹی جامعۃ الرشاد کی ان ہی خصوصیات کی بناء پر الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ نے اس کا الحاق منظور کرلیا ہے اور اس کے بعض طلبہ وہاں داخل ہوکر فارغ ہوکر دوسرے ملکوں میں اور ہندوستان میں دینی تعلیم کا کام کر رہے ہیں اور بعض زیر تعلیم ہیں۔

جامعہ ملیہ، مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اس کی سند کو تسلیم کرلیا ہے۔ یہاں سے عالمیت کرنے کے بعد وہاں بی، اے سال اول میں داخلہ ہو جائے گا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی نے بھی اس کی فضیلت کی سند کو ایم، اے میں داخلہ کے لئے منظور کرلیا ہے۔ بنگال کی بعض یونیورسٹیوں سے خط وکتابت ہو رہی ہے۔

ادارہ کے شعبے (۱) عربی درسگاہ تعلیم دورہ تک، مدت تعلیم سات سال۔ (۲) درجۂ حفظ و قرأت (۳) مکتب درجہ پانچ تک (۴) اردو میڈیم جونیر ہائی اسکول۔ (۵) شعبۂ کتابت وجلد سازی اور دستکاری (۶) شعبۂ نشر واشاعت (۷) الجماعۃ الشرعیہ جسکے ذریعہ طلاق اور فسخ نکاح وغیرہ کے فیصلے کئے جاتے ہیں (۸) رشاد نرسری اسکول۔

داخلہ ان تمام شعبوں میں داخلہ ۱۰ر شوال سے ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے بچوں کو داخل کرنا چاہیں وہ ۲۰ر رمضان تک درخواستیں بھیج دیں۔

اخراجات ان تمام شعبوں میں پانچ چھ سو طلبہ تعلیم پا رہے ہیں جنیں دار الاقامہ میں رہنے والے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ دو درجن سے زیادہ اساتذہ و ملازمین مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ سارے شعبوں کا مستقبل سالانہ خرچ پانچ لاکھ سے زیادہ ہے۔ تعمیرات کا خرچ اس کے علاوہ ہے۔

دستکاری طلبہ کے لئے ذریعہ معاش پیدا کرنے کیلئے ادارہ نے کچھ دستکاری کے شعبے قائم کردئے ہیں جن سے عربی اور حفظ کے طلبہ فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً کتابت، جلد سازی، موم بتی سازی وغیرہ۔

الجماعۃ الشرعیہ یعنی دار القضاء اس نام سے مدرسہ میں ایک شعبہ قائم ہے جس کے ذریعہ مسلمانوں کے نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ کے معاملات کے فیصلے علماء کی ایک جماعت کرتی ہے۔ اب تک کئی درجن فیصلے کئے جا چکے ہیں۔

عمارت اور مسجد خدا کے فضل سے عربی درسگاہ کے لئے دو سو فٹ لمبی پختہ عمارت اور کتبخانہ کیلئے ایک شاندار ہال بن گیا ہے۔ اس طرح ۶۰×۹۰ سائز کی ایک خوبصورت اور وسیع مسجد بن کر تیار ہوگئی ہے۔ صرف فرش اور وضو خانہ کا کام باقی ہے۔

مکتب اور دار الاقامہ ۵۶×۲۴ سائز کا ایک ہال بچوں کے کھانے کے لئے بھی بن گیا ہے جس سے تعلیم کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ دار الاقامہ اور مکتب کیلئے کچھ پختہ اور کچھ سفالہ پوش عمارت موجود ہے مگر اب وہ ناکافی ہو رہی ہے۔ فی الحال دار الاقامہ کے لئے آٹھ دس کمرے اور مکتب کیلئے چار پانچ کمروں کی شدید ضرورت ہے جس کی تعمیر پر کم سے کم چار لاکھ روپئے صرف ہوں گے۔

ماہنامہ الرشاد جامعہ کی طرف سے ایک دینی وعلمی ماہنامہ الرّشاد کے نام سے نکلتا ہے آپ خریدار بن کر ممنون فرمائیں۔

ہم تمام دینی وملی احساس رکھنے والے مسلمانوں سے دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مرکزی ادارہ کے ان ضروری کاموں میں دل کھول کر حصہ لیں اور آئندہ بھی اسے فراموش نہ کریں۔ عام مسلمانوں کے چندہ کے علاوہ اسکا کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

خط وکتابت اور رقم بھیجنے کا پتہ:۔ ناظم یا سکریٹری جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ (یوپی)

NAZIM, JAMIATUR RASHAD, RASHAD NAGAR
AZAMGARH. (U.P.) PIN, 276001

نوٹ:۔ چیک یا ڈرافٹ پر صرف ناظم یا سکریٹری جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ لکھیں اور یہ صراحت کر دیں کہ یہ رقم کس مد کے لئے ہے۔

مدرسہ عمر فاروق رض

ملک کے طول و عرض میں الحمدللہ ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس و مراکز قائم ہیں، اور وہ اپنے اپنے دائرہ میں دینی تعلیم کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ مگر اب بھی تعلیمی لحاظ سے بہت سے پچھڑے ہوئے علاقوں میں نئے مدرسوں کی ضرورت ہے، خاص طور پر ایسے مدرسوں کی جن میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی بھی تعلیم دی جائے۔

اس وقت مسلمانوں میں دینی تعلیم کا رجحان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ ہوگیا ہے، مگر ان میں ۹۵ فی صد لوگ اپنے بچوں کو جدید تعلیم گاہوں میں ڈال دیتے ہیں، جہاں ان کو اچھی تعلیم تو مل جاتی ہے مگر بچے اسلام کی بنیادی تعلیم اور قرآن پاک سے محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے ابتدائی اور متوسط مدرسے بھی قائم کیے جائیں جن میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم، مثلاً ہندی، انگریزی، حساب، سائنس، جغرافیہ وغیرہ مضامین بھی پڑھائے جائیں، اسی احساس کے پیش نظر خدا کا نام لے کر ہم چند بے مایہ لوگوں نے اپنے ضلع (دیوریا) مقام پیر بہیا (کسیا) میں ایک ادارہ مدرسہ عمر فاروق رض کی بنا نہایت بے سروسامانی کے عالم میں توکلاً علی اللہ رکھ دی ہے خدا کا شکر ہے کہ اس مدرسہ کی تعلیمی نگرانی جامعۃ الرشاد کے استاذ مولانا احمد کمال صاحب ندوی مدنی کے سپرد ہے، اور جامعۃ الرشاد کے ذمہ دار حضرات اس کے قیام میں معاون ہیں۔

بحمداللہ مدرسہ کے لیے پینتیس ہزار ۳۵۰۰۰ روپے میں ایک زمین رجسٹری کرالی گئی ہے، اور مزید زمین کے حصول کے لیے کوشش جاری ہے۔ فی الحال چند کمروں پر شیڈ ڈال کر بعد رمضان المبارک تعلیم ان شاء اللہ شروع ہو جائے گی۔

پیش نظر پروگرام

(۱) فاروق نرسری اسکول (۲) مثالی مکتب (۳) شعبۂ حفظ و تجوید، (۴) عربی درسگاہ (۵) مرکز صنعت و حرفت (۶) شعبۂ نشر و اشاعت (۷) دار القضا (۸) مدرسۃ البنات (۹) ایک معیاری اسپتال۔

درجۂ حفظ میں ۲۵ رشعبان سے تعلیم شروع ہو جائے گی، بقیہ شعبوں میں ۵ رشوال سے تعلیم شروع ہوگی، داخلہ ۳ رشوال سے شروع ہوگا۔ اور ۲۰ رشوال تک جاری رہے گا، دار الاقامہ میں رہنے والے طلبہ کو مبلغ سو ۱۰۰ روپے فیس خوراک ماہانہ جمع کرنی ہوگی، نیز مستطیع طلبہ کو مبلغ ایک ۱۰۰ سو روپئے زرِ ضمانت بھی جمع کرنا ہوگا، جو مدرسہ چھوڑتے وقت واپس کردی جائے گی، اس سال

صرف ننانوے طلبہ کو وظیفہ دیا جائے گا۔ اس لیے وظیفہ حاصل کرنے والے طلبہ کو ۱۵ ر رمضان تک سادہ کاغذ پر درخواست ناظم ادارہ کے نام بھیج دینی چاہیے، اس کے بعد وظیفہ کی سہولت نہ دی جاسکے گی۔

ہم خادمان ادارہ تمام اصحاب خیر حضرات کے شکر گذار ہیں، جنھوں نے اس ادارہ کے ساتھ کسی بھی حیثیت سے تعاون کیا، اور بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مزید توفیق اور حوصلہ بخشے، ان کے کاروبار میں برکت عطا فرمائے، اور دنیا و آخرت کی عافیت سے نوازے، ادارہ میں چونکہ غیر مستطیع طلبہ بھی تعلیم پائیں گے، اس لیے تمام اہل خیر حضرات سے درخواست ہے کہ رمضان میں اور عید کی خوشی کے موقع پر ان نونہالان قوم کو فراموش نہ کریں گے، اور صدقۂ فطر، زکوٰۃ اور عطیات کی رقوم سے اس ادارہ کا تعاون کریں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا۔

ہم ہیں مدرسہ عمر فاروقؓ پیرہیا، کسیا، دیوریا کے خادم:

(مولانا) حکیم یونس خان قاسمی ۔ (۲) مولانا حافظ ہارون رشید خان ندوی

سفیر عثمان (S.D.O.) ۔ شمس الحق خان (جے۔ ای)

رفیع اللہ خان (سیل ٹیکس آفیسر)، عبد الرشید خان ۔ حاجی ناظر بخش خان

آسام بل

آزادی سے پہلے آسام مسلمانوں کا صوبہ سمجھا جاتا تھا لیکن سلہٹ کے کٹ جانے کی وجہ سے مسلم صوبہ ہونے کی حیثیت میں کچھ کمی آئی، مگر آزادی کے بعد بہت دنوں تک وہاں کی سیاسی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی مگر ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی پالیسی نے اس کی اس حیثیت کو آہستہ آہستہ کمزور کرنا شروع کردیا اور علاقائیت کو ہوا دے کر وہاں مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی بھرپور کوشش کی اور پھر غیر ملکیوں کا مسئلہ اٹھا کر انھیں بالکل خانماں برباد کر دینے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں ہزاروں مسلمان قتل کئے گئے اور لاکھوں بے گھر ہوئے۔ اب ہماری مرکزی گورنمنٹ نے حال میں جو آسام بل لوک سبھا سے پاس کر دیا ہے دیکھئے وہ کیا قیامت ڈھاتا ہے۔ اس سلسلہ میں "ہندوستان ٹائمز" کا اداریہ ملاحظہ ہو: (مرتب)

غیر قانونی تارکین وطن کا اصلاح شدہ بل ۱۹۸۸ء پارلیمنٹ نے پاس کر دیا ہے۔ اسکی وجہ سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ حکومت آسام غیر ملکیوں کا پتہ لگا کر انھیں نکال سکتی ہے بلکہ ایک ایسی الجھن جس نے مملکت کو سالہا سال سے پریشان کر رکھا ہے اس کا دیرپا حل بھی پیش کر دیا ہے۔ مسئلہ آسام کے اس نئے بل کا رجحان یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد کے نقل وطن کرنے والے ریاست کو چھوڑ دیں۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک تارکین وطن کو ۱۰ سال تک ووٹ دینے کا اختیار نہیں ہوگا جبکہ ۱۹۶۵ء سے قبل کے تارکین وطن کو شہری حقوق عطا کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ اس طرح غیر ملکیوں کا مسئلہ تین ادوار میں پھیلا ہوا ہے اور ایک اطمینان بخش حل ہی ریاست کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر بھی ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا اس قانون سازی سے اقلیتوں کی حالت اور بھی بدتر نہیں ہوجائیگی؟ یہ بات بہت ہی تشویشناک ہے کہ ابھی بھی آسامیوں کے ذہن سے غیرملکیوں کا ہوا نکلا نہیں ہے حالانکہ ریاستی حکومت اسی دھرتی کے باسیوں یعنی آسامیوں ہی کی مضبوط گرفت میں ہے۔ یہ بل صرف اقلیتوں ہی کے لئے وجہ غم نہیں بلکہ خود ریاست کیلئے بھی اس وقت وجہ تشویش ہوجائیگا جب اقلیتوں کی جانچ پرکھ کی کارروائی عوام کے ایک قابل ذکر گروہ کے ذریعہ ہراساں کرنے کی صورت میں تبدیل ہوجائے گی۔ غیرقانونی طورسے نقل وطن کرنے والوں کی گرفت اور انھیں نکال باہر کرنے کی ضرورت سے کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر ہر بنگالی اور ہر مسلمان جو ریاست میں رہتا ہے اس پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ غیرقانونی نقل وطن کرنے والا ہے۔ یہی وہ خوف ہے جس نے اقلیتوں کو بل کا مخالف بنا دیا ہے۔

مرکز نے اسکی ساری ذمہ داریاں حکومت آسام کے حوالے کردی ہیں۔ اب یہ ریاستی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیتوں کو یہ یقین دہانی کرائے کہ انھیں ستایا نہیں جائے گا بہرصورت ۱۹۷۱ء کو حد فاصل مان کر اسی کے مطابق اقلیتوں کے ساتھ معاملہ کیا جانا چاہئے۔ ایک صورت میں یہ بل غیرملکیوں کی گرفت کے کام کو آسان بنا دیتا ہے۔ ٹریبونل کے ججوں کی تعداد تین کے بجائے دو کردی گئی ہے گویا آسام میں کام کرنے کیلئے مطلوبہ ججوں کا ملنا مشکل ہے۔ دوسری بڑی تبدیلی اس علاقہ کی عملداری کی ہے جس سے تعلق رکھنے والا کوئی آدمی کسی تارک وطن کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آسام گن پریشد کے ایم پی دنیش گوسوامی نے ملک کو یقین دلایا ہے کہ ریاستی حکومت نئے قانون کو اقلیتوں پر ظلم ڈھانے کا آلہ بنا کر استعمال نہیں کرے گی۔ مسئلہ پر عمل درآمد بہت اہم ہے مگر اسے خوش اسلوبی سے کرنا ہوگا۔ قانون خواہ کچھ بھی اشارہ کرے تارکین وطن کے مستقبل کا فیصلہ بے رحمی کے انداز میں نہیں کیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے ان میں کچھ ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو قانونی ثبوت کے پیمانے پر پورے نہ اتریں یا ان میں کچھ کمی رہ جائے تو کیا انھیں خلیج بنگال میں ڈھکیلا جاسکتا ہے۔ مسئلہ کے انسانیت نواز نظریہ ہی کی اس مہنت گورنمنٹ سے امید کی جاتی ہے۔ اسے فتح وکامرانی کے لمحات میں فراخدلی ہی کا ثبوت دینا چاہئے۔

اداریہ: "دی ہندوستان ٹائمز" ۲، اپریل ۱۹۸۹ء

نئی کتابیں

نقوش چین کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت پچیس روپئے۔
ناشر: مجلس علم وادب اسلام آباد، مالیگاؤں، ضلع ناسک۔

زیر نظر کتاب مولانا محمد حنیف صاحب ملی کے سفرِ چین کے مشاہدات، محسوسات اور جائزے پر مشتمل معلومات کا گنج گرانمایہ ہے۔ موصوف مالیگاؤں کے مشہور مستند ادارے معہد ملت میں برسوں سے شیخ الحدیث کے عالی منصب پر فائز ہیں۔ ایک مثالی مدرس ہونے کے ساتھ ایک پختہ کار قابلِ رشک مصنف بھی ہیں۔ زبان وبیان پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور طرز ادا نہایت دلکش ودلنواز ہوتا ہے۔ شاید دل درد آشنا اور ذوق جمال کی دولت بھی بھرپور پائی ہے۔

چینی مسلمانوں کے حالات ومسائل سے متعلق ایک مختصر معلوماتی مضمون مجلہ "الدعوہ" عربی سے ترجمہ کر کے "ارشاد" کے حالیہ دو شماروں (فروری و مارچ ۱۹۸۸ء) میں شائع کیا گیا ہے اور اب یہ کتاب بھی آگئی۔ کتاب اگرچہ اصلاً ایک تاثراتی ترتیب ہے لیکن واقعات وحقائق کا بھی ایک بے مثل خزینہ ہے۔ مادہ پرست، ملحد مملکت چین کی معاشرت، نظام حکومت، اشتراکیت وبربریت انداز جہانبانی وسلطانی کی اچھی طرح نقاب کشائی کی گئی ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ چین میں کیمونسٹ انقلاب کے بعد مسلمانوں کے لئے ہر ظلم وستم کو روا رکھا گیا۔ اور ان کو ہر طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا گیا حتیٰ کہ ان کے تشخص کو بھی مٹا دینے کی بھرپور کوشش کی گئی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ "یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ"۔

صحابہ کرام نے سرزمین چین میں جب قدم رنجہ فرمایا تو کل چار تھے اور آج چین کی ایک ارب دسا کروڑ کی آبادی میں مسلمان مجموعی طور پر لگ بھگ دس کروڑ ہیں جو بہت سے مسلمان ملکوں کی آبادی سے بڑھ کر ہے۔ حالانکہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۲ء تک بیس برس مسلسل مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا ہے۔

فاضل مصنف نے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلامی زندگی پر بھی نظر ڈالی ہے یعنی مسلمانوں کے دینی مدارس ومراکز، طویل وعریض مساجد، علمی وتہذیبی سرگرمیوں، علمائے دین کی خدمات ومساعی کا تذکرہ بھی بڑے سلیقہ اور صحت مندی کے ساتھ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب چینی مسلمانوں کے حالات کا بہترین مرقع ہے اور ہر طرح لائقِ مطالعہ۔

خدابخش لائبریری جرنل خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ابتدا سے ہی ایک باوقار مثالی لائبریری رہی ہے اور قیمتی مخطوطات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن ادھر جب سے جناب عابد رضا بیدار صاحب اسکے ڈائریکٹر ہوئے ہیں انھوں نے اسے بڑی ترقی دی ہے اور اب وہ صرف ایک لائبریری ہی نہیں رہی بلکہ علوم مشرقیہ کا ایک مستند مرکز اور گرانقدر ادارہ بن گئی ہے۔ اس ادارہ کے پروگراموں میں ایک قیمتی پروگرام سالانہ لکچرس کا ہوتا ہے جس میں ملک وبیرون ملک کے مقتدر وممتاز علماء ودانشور مدعو کئے جاتے ہیں اور لکچرس دیتے ہیں یہ لکچرس کتابی صورت (ANNUAL JOURNAL) میں شائع کئے جاتے ہیں۔

جرنل ۴۴ ۱۹۸۷ء اور جرنل ۴۵ ۱۹۸۸ء اسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ یہ دونوں جرنل وقیع تحقیقی مضامین پر مشتمل ہیں۔ جرنل ۴۴ میں اردو میں عبدالقادر بیدل پر شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی کا ایک قیمتی لکچر ہے اسی طرح حصۂ انگریزی میں "اسلام اور ہندوستانی تہذیب" پر ایک اچھا لکچر ہے۔ جرنل ۴۵ زیادہ تحقیقی طبی معلومات پر مشتمل ہے۔ مضامین سبھی قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہیں بدل اشتراک سالانہ مبلغ ساٹھ روپئے ہندوستانی ہے۔

اورنگ زیب، شخصیت وسیاست قومی یکجہتی کے پس منظر میں یہ کتاب پروفیسر ستیش چندر جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی کا ایک تحقیقی لکچر ہے جسے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اس کی اشاعت آمنے سامنے اردو ہندی دونوں زبانوں میں مشترکہ طور پر کی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مستفید ہو سکیں۔ موجودہ حالات میں جبکہ مسلمان حکمرانوں کی صورت بگاڑ کر پیش کرنا ایک ہنر بن چکا ہے جناب پروفیسر ستیش چندر کی ذات قابل تعریف ہے کہ انھوں نے عالمگیرؒ کی خوبیوں اور خامیوں کے بیان میں عدل وانصاف سے کام لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کیجائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح کے منصفانہ مضامین سے قومی یکجہتی کو یقیناً فائدہ پہنچے گا۔

●●

الرشاد کی ڈاک

۲۵ / مارچ ۱۹۸۸ء

بخدمت گرامی جناب مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲۹/ فروری ۱۹۸۸ء کا جواب بہت تاخیر سے دے رہا ہوں۔ اس کے معذرت چاہتا ہوں۔ آج ہی رہگذر / اپریل کا شمارہ آپ کو پوسٹ کیا ہے۔ اس کے اداریہ میں میں نے کل ہند قیادت کا موضوع اٹھایا ہے۔ مولانا آزاد کی امام الہند کی تجویز کے پس منظر میں بات کہی ہے آپ اگر مناسب خیال فرمائیں تو اپنے جریدہ "الرشاد" میں اس پر کچھ روشنی ڈالئے یا ہم کو اپنا مضمون بھیج دیں تو ہم بھی اسے شائع کریں گے۔

دوسرا مسئلہ مسلم مجلس مشاورت سے متعلق ہے۔ مولانا احمد علی قاسمی صاحب نے مسلم انڈیا (اردو) فروری اور مارچ کے شمارہ میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ ۱۴/ مارچ کو مشاورت کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا ہے شاید ان کی تجویز کے تحت اکتوبر میں مشاورت کا کل ہند اور کل سطحی کنونشن کے انعقاد کی بات طے ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جس پس منظر میں مشاورت کی تشکیل ہوئی تھی جس کا مسلمانوں نے زبردست خیر مقدم کیا تھا لیکن وہ بہت جلد بے اثر ہو کر رہ گئی اور اس کے مقاصد کو حاصل نہ کیا جا سکا۔ اس کی ناکامی میں بہت بڑا دخل تو خود جماعت اسلامی کا ہے۔ دوسری تنظیمیں بھی رکاوٹ بنتی رہی ہیں۔ میرے خیال میں اس کو جماعتوں کے وفاق کے بجائے مسلمانوں کا نمائندہ پلیٹ فارم بنانا چاہئے تو شاید کچھ بات بن سکے۔ اس سلسلہ میں آپ کیا سوچ رہے ہیں اس بارے میں آپ کو رہنمائی دینی چاہئے جو واضح بھی ہو اور تعمیری بھی۔

ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے خط میں جو اظہار خیال فرمایا ہے اس میں مولانا عبدالمجید صاحب ندوی کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ میں موصوف سے واقف نہیں ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مولانا عبدالمجید صاحب ندوی . ہماری اکیڈمی کو اپنی خدمات دے سکیں

رہمارے اور آپ کے مشورہ سے اس ضمن میں ان سے کوئی کام لیا جاسکے۔ کیونکہ ہم نے اپنے ہسٹری
کے منصوبے کا وسیع پیمانے پر تعارف کرایا ہے۔ مگر ہمیں ابھی تک ایسی شخصیت ملنے میں کامی
رہی ہے جس کے ذریعہ اس نقشہ میں رنگ بھرا جاسکے۔ شیخ محمد اکرام صاحب کے ادارۂ ثقافتِ
اسلامیہ کی طرف سے آب کوثر، رود کوثر اور موج کوثر کے نام سے پاکستان سے اسلامی ہند کی علمی و
مذہبی اور ثقافتی تاریخ کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ گو انھوں نے سلاطین اور حکمرانوں سے ہٹ کر
صوفیا اور علماء کی دینی اور اسلامی کوششوں پر اچھی روشنی ڈالی ہے اور مواد بھی اچھی محنت سے
جمع کیا ہے مگر وہ اس کے واضح خطوط کو نکھار نہیں سکے کہ ہندوستان میں صوفیائے کرام کے
حکمت عملی سے دعوت اسلامی کو فائدے کے ساتھ کیا نقصان پہنچا ہے۔

لوگوں میں عام طور سے مشہور ہے کہ صوفیائے کرام کی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان
میں اسلام پھیلا۔ حالانکہ ہندوستان میں اسلام کی ترویج و اشاعت میں علماء کا بہت کچھ عمل
دخل رہا ہے گو تعلیم و تعلم اور تربیت کا نظام بڑی حد تک ڈھیلا رہا۔

اگر آپ اس نقطۂ نظر سے متفق ہیں تو ہندوستان کی ثقافتی تاریخ اس پہلو سے
مرتب اور مدون کرنے کی ضرورت ہے آپ اس سلسلہ میں کیا مدد فرما سکتے ہیں۔
اس پر اظہار خیال فرمائیے۔ یہ بات واضح رہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس دور میں ابھی ایسی
شخصیتیں ہمارے درمیان دی ہیں جن کے ذریعہ کام کے اس رخ کی داغ بیل ڈالی
جاسکتی ہے ورنہ مستقبل بڑا بھیانک نظر آرہا ہے اور ہم کو اپنی کوتاہیوں کی جواب دہی
کرنا پڑے۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ فقط والسلام

عبدالحفیظ خان

(دی اسلامک اکیڈمی آف ہسٹری آف انڈیا سوسائٹی)

Regd No. Azm. / N. P. 42 / 84
Regd. No. R. N. 34937 81
Phone : 2461

MONTHLY JAMEATUR RASHAD
AZAMGARH - 276001 (U. P.) INDIA